دُلّے دی بار
(پنڈی بھٹیاں اور گردونواح کی تاریخ)
اسد سلیم شیخ
ساقی ارباب ذوق
0305 6406067
PDF Book Company

دُلّے دی بار

(پنڈی بھٹیاں اور گردونواح کی تاریخ)

اسد سلیم شیخ

تقسیم کار

اظہار سنز

۱۹- اردو بازار لاہور

نام کتاب : دلے دی بار "پنڈی بھٹیاں اور گردونواح کی تاریخ"

مطبع : اظہار سنز اردو بازار لاہور

تصاویر : ریاض احمد شاہین

سال طباعت : ۱۹۹۶ء

قیمت : ۱۵۰/- روپے

بتعاون خصوصی :

اظہار ریسرچ انسٹی ٹیوٹ آف پاکستان، لاہور

انتساب!

شریک حیات

اور

پیاری بیٹیوں ماروی اور علینہ

کے نام

فہرست عنوانات

مدد۔ گورو مہاراج سنگھ کی گرفتاری۔ بھٹی قبیلہ کی عملداری کی بحالی۔ انتظامی تبدیلیاں۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں بھٹیوں کی انگریزی خدمات اور جاگیر کا حصول۔ بار کی سماجی حالت۔ ۱۸۷۷ء کے قحط کی تباہ کاریاں۔ ترقی کا آغاز۔ ریل سڑکوں اور نہروں کا قیام۔ ذیلداروں کی تقرری۔ ۱۸۸۳ء میں پنڈی بھٹیاں۔ جلالپور اور گردونواح کی تعلیمی حالت۔ نہری نظام کی خوشحالی۔

☆☆☆

پیش لفظ

جغرافیائی تقسیم کے اعتبار سے یوں تو بر صغیر کا ہر خطہ اہمیت کا حامل رہا ہے۔ مگر عروج وزوال کی جو داستان پنجاب نے رقم کی یہ اسی کا حصہ ہے۔ پنجاب بنیادی طور پر دریاؤں کی سر زمین ہے۔ لیکن دریائے چناب کے کناروں نے بے شمار انقلابی لوگوں کو جنم دیا۔ ایسا ہی ایک کردار دلا بھٹی کا ہے۔ صدیوں کے تاریخی عمل نے دلا بھٹی کو کبھی انقلابی اور کبھی باغی قرار دیا۔ یہ کیا تھا یہ بحث جاری رہے گی۔ لیکن دلا بھٹی کی بہادری اور شجاعت نے اس کو اس مقام پر ضرور پہنچایا کہ جس خطے پر دلا بھٹی کی عملداری رہی وہ خطہ چار صدیاں گزرنے کے باوجود دلے دی بار کے نام سے مشہور ہے۔ دلے دی بار کا مرکزی مقام پنڈی بھٹیاں ہے۔ میرا تعلق بھی اسی زمین سے ہے۔ اس کے تاریخی اور ثقافتی پس منظر کا منظر نامہ لوک شاعر محمد بشیر دیوانہ نے اپنے شعروں میں یوں پیش کیا ہے۔

قصبہ میرا پنڈی بھٹیاں کہن دلے دی بار
کاٹھیاں نمدے ون سونے ایتھے ہون تیار
سورماں بندیاں دی ایہہ دستی وچ تاریخ پرانی
دلا بھٹی سورما ایتھے کھیڈ دا رہیا شکار
مشرق ولچناب دے کنڈھے قصبے دی آبادی
دوروں نظریں آوے وڈی مسجد دا مینار
روضہ میاں خیر محمد نون دا ایتھے سوہنا
پیتا جنہاں جام شہادت وچ سکھاں دی وار
شاہ حسین دے سچے مرشد شاہ بہلول نے ایتھے
پنج کوہ پنڈیوں لہندے ول ہے اونہاں دا دربار
شاہد نیں تاریخ ایندی دے چار اس دے دروازے
بے ترتیبی سوڑیاں گلیاں سدھے تک بزار
دین اسلام دا بھیرے ولوں جھنڈا پہنچیا ایتھے
شیر شاہ سوری دے گے ایتھوں گزرے نیں کئی وار
نادر شاہ درانی نالے سکھاں اس نوں لٹیا
مغلاں دی اس تھاں تے کیتی ڈاہڈی مارو مار

سوہنے دلے بھٹی ورگے اس دی جوہ دے راکھے
ایتھوں دا ہر شخص بہادر کدی ناں منے ہار

دیس پنجاب دا مرکز نالے سڑکاں دا ایہہ سنگم
بڑی اہمیت اس قصبے نوں صوبے دے وچکار

لوکاں دی بھلیائی کارن ایتھے نیں تنظیماں
رکھن درد ہمیشہ دل وچ ہر دم خدمت گار

لکڑی دا کم سوہنا ہووے بن مٹی دے بھانڈے
ملکوں وکھرے جگ توں سوہنے ایتھوں دے فنکار

انی سو ستانوے دے وچ نظم دیوانے لکھی
نام بشیر مدرس پیشہ سب دا تابعدار

پنڈی بھٹیاں کی تاریخ صدیوں پر محیط ہے۔اس کے عروج وزوال میں بے شمار سماجی، سیاسی اور مذہبی شخصیات کا حصہ شامل ہے۔ تاریخ کے عمل نے بہت سی شخصیات کو گرد آلود کر دیا۔ میں نے کوشش کی ہے کہ ان شخصیات کو ان کا مقام دیا جائے۔ مسلمانوں کی تاریخ میں سلسلہ درویشی نے انتہائی اہم کردار ادا کیا ہے۔اس سلسلہ کے معروف بزرگ حضرت شاہ بہلول دریائی مرشد شاہ حسین (لاہور والے) دلا بھٹی کے دور میں یہاں تشریف لائے۔ایسے بزرگوں کے تذکرے کے علاوہ میں نے کوشش کی ہے کہ پنڈی بھٹیاں اور گرد ونواح میں اب تک جو تبدیلیاں ہوئیں تاریخ کے جن ادوار سے گزرا۔ جن لوگوں نے اس میں حصہ لیا اس کو ایک مستند کتاب کی زینت بنا دیا جائے۔اس سلسلے میں بعض تحریری مواد کے علاوہ تین سال کی فیلڈ ریسرچ کے دوران اکٹھی کی گئی لوک روایات کو بنیاد بنایا گیا ہے۔البتہ ان روایات کو انتہائی غیر جانبداری سے اور تحقیق کے بنیادی اصولوں کے مطابق محفوظ کرنے کی کوشش کی ہے۔ میری کوشش کہاں تک کامیاب ہوئی ہے اس کا فیصلہ آنے والا وقت ہی کرے گا۔البتہ اس کو مرتب کرنے میں جن بزرگوں اور احباب نے میری رہنمائی کی ان میں بالخصوص محترم دادا جان۔ جناب شیخ محمد حسین اور ان کے دوست جیون پرکاش جیون (مقیم دہلی) کے نام قابل ذکر ہیں اور جن کے تعاون اور حوصلہ سے میں اس قابل ہوا ان میں سید حمید رضا۔ پروفیسر محمد اویس۔ محمد اکرم انجم اور بڑے بھائی زاہد حسین شیخ کے نام نمایاں ہیں۔ یہ تمام میرے شکریے کے لائق ہیں۔

اسد سلیم شیخ

دلے دی بار کے جغرافیائی خدوخال

وسطی پنجاب کا تاریخی قصبہ پنڈی بھٹیاں جو دلے (دلا بھٹی) کی بار کا مرکز رہا ہے۔ پنجاب کے دارالحکومت لاہور سے مغرب کی طرف قدیم شاہراہ اعظم اور جدید موٹروے پر ۱۰۷ کلومیٹر کے فاصلے پر دریائے چناب کے کنارے واقع ہے۔ یہ قصبہ چاروں طرف سے شیخوپورہ، جھنگ، فیصل آباد اور سرگودھا کے اضلاع میں گھرا ہوا ہے۔ جبکہ خود اس کا ضلعی صدر مقام حافظ آباد اس کے شمال میں ۵۹ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ جغرافیائی اعتبار سے یہ شمال کی طرف ۴ء۳۲ درجے عرض بلد اور مشرق کی جانب ۴۳ء۷۳ طول بلد پر واقع اور سطح سمندر سے ۶۲۲ فٹ بلند ہے۔ (۱) ۱۹۸۱ء کی مردم شماری کے مطابق پنڈی بھٹیاں کی آبادی ۱۶،۸۰۰ نفوس پر مشتمل تھی۔ لیکن گزشتہ برسوں میں اس کی آبادی دگنا سے بھی بڑھ کر ۴۰ ہزار کے قریب پہنچ چکی ہے۔ ایک وقت تھا کہ اس کی آبادی حافظ آباد شہر سے دوگنا تھی۔ جیسا کہ ۱۸۶۸ء اور ۱۸۸۱ء کی مردشماری کے اعداد و شمار سے ظاہر ہے۔ ۱۸۶۸ء میں حافظ آباد شہر کی آبادی ۲۲۹۲ تھی جبکہ پنڈی بھٹیاں کی آبادی ۴۲۸۱ تھی۔ اسی طرح ۱۸۸۱ء میں حافظ آباد کی آبادی ۲۴۵۳ تھی جبکہ پنڈی بھٹیاں قصبہ کی آبادی ۳۵۲۸ نفوس پر مشتمل تھی اور جلالپور بھٹیاں کی آبادی اس عرصے میں ۲۴۵۳ تھی۔ (۲) گویا اس زمانے میں پنڈی بھٹیاں آبادی کے اعتبار سے علاقے میں سب سے زیادہ اہمیت کا حامل قصبہ تھا۔

۱۸۶۸ء سے لے کر ۱۹۹۸ء تک پنڈی بھٹیاں کی آبادی کے اعداد و شمار کا تجزیہ درج ذیل گوشوارے سے کیا جا سکتا ہے۔

سال	کل آبادی	مرد	خواتین
۱۸۶۸ء	۴۲۸۱	۲۲۵۶	۲۰۵۲
۱۸۸۱ء	۳۵۲۸	۱۷۸۸	۱۷۴۰

۱۹۰۱ء میں تھانہ پنڈی بھٹیاں کی آبادی ۶۴۴۷۸ نفوس پر مشتمل تھی۔

سال	کل آبادی	مرد	خواتین
۱۹۳۱ء	۴۴۷۸	-	-
۱۹۴۱ء	۵۶۵۳	-	-
۱۹۵۱ء	۶۷۸۴	-	-
۱۹۶۱ء	۷۲۱۲	۳۸۲۱	۳۳۹۱

۱۹۷۲ء	۷۷۸۸	-	-
۱۹۸۱ء	۱۶۸۰۰	-	-
۱۹۹۸ء	۴۰،۰۰۰ تقریباً	-	-

۱۸۶۸ء کے بارہ برسوں بعد پنڈی بھٹیاں اور جلالپور بھٹیاں کی آبادی میں واضح طور پر کمی واقع ہو جاتی ہے-اس کی وجہ اس عرصے کے دوران وسیع پیمانے پر پھیلنے والی طاعون کی بیماری تھی جس نے علاقے کی ایک چوتھائی آبادی کو موت کے منہ میں دھکیل دیا تھا

گزشتہ ایک صدی کے دوران دلے کی بار کے اس قصبہ کی آبادی، سیاسی، معاشرتی و معاشی زندگی میں بڑی تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں-۱۹۰۱ء میں تحصیل حافظ آباد (بشمول پنڈی بھٹیاں، جلالپور، سکھیکی، رسولپور، کولو تارڑ وغیرہ) کی کل آبادی ۲۱۶۶۶۶ نفوس پر مشتمل تھی-ان میں ۳۸۷۹۱ ہندو، ۴۰۹۷ سکھ، ۱۷۱۱۳۷ مسلمان اور ۶۷ عیسائی تھے-اس طرح تحصیل کی ۲ تہائی آبادی مسلمانوں پر مشتمل تھی-اس کل آبادی میں ۱۱۸۶۰۲ مرد اور ۹۸۰۶۴ عورتیں تھیں-ان میں سے صرف ۴۷۳۶ لوگ لکھنا پڑھنا جانتے تھے-اس تعداد میں ۱۵۵ عورتیں بھی شامل تھیں-اس وقت تحصیل حافظ آباد کی عورتوں میں ۲ء ۱ اور مردوں میں ۹ء ۳ فیصد شرح خواندگی تھی اور ان میں بھی زیادہ تر ہندو تھے- مسلمان آبادی میں زیادہ ہونے کے باوجود تعلیم میں بہت پیچھے تھے- جیسا کہ ۱۹۰۸ء سے ۱۹۱۹ء تک کے تعلیمی اعداد و شمار سے ظاہر ہے-ان گیارہ برسوں کے دوران ڈسٹرکٹ بورڈ ورنیکلر سکول پنڈی بھٹیاں سے کل ۷۵ طلبہ نے مڈل کا امتحان دیا تھا-ان میں صرف ۲۵ مسلمان تھے-۱۰ ہندو اور ایک سکھ تھا- قیام پاکستان کے ثمرات کے نتیجے میں اس صورتحال میں بڑی تیزی کے ساتھ تبدیلیاں واقع ہوئیں- یہاں کے تمام ہندو سکھ بھارت نقل مکانی کر گئے-اس طرح ان کے خلاء کو مسلمانوں نے پورا کیا اور ان کے لیے ترقی کے بڑے مواقع پیدا ہوئے- چنانچہ ۱۹۶۱ء میں یہاں کے لوگوں میں شرح خواندگی ۳ء ۲۲ فیصد جا پہنچی-اس وقت قصبہ پنڈی بھٹیاں کی کل آبادی ۷۲۱۲ نفوس پر مشتمل تھی- جس میں ۳۸۲۱ مرد اور ۳۳۹۱ عورتیں تھیں-ان میں ۱۱۹۸ مرد اور ۴۴۰ عورتیں پڑھی لکھی تھیں-اس طرح مردوں میں خواندگی کی شرح ۳۱ء۳۵ اور خواتین ۱۲ء۳۹ فیصد تھی- آج سے ۳۵ برس پہلے یعنی ۱۹۶۱ء میں ہی یہاں کے لوگوں کی سماجی حالت کا اندازہ لگانا بھی مشکل نہیں-اس وقت یہاں کل ۱۳۶۶ مکانات تھے- ۶۲ مکانوں میں ایک فرد، ۱۰۶ مکانات میں ۲ افراد، ۱۵۵ مکانات میں ۳ افراد، ۲۰۱ مکانات میں ۴ افراد ۲۱۰ مکانات میں ۵ افراد، ۱۹۶ میں ۶ افراد، ۱۴۷ مکانات میں ۷ افراد ۱۰۴ میں ۸ افراد، ۹۱ میں ۹ افراد اور ۹۴ میں ۱۰ یا اس سے زیادہ افراد رہائش پذیر تھے-اس طرح ۵۳ء ۵ افراد فی مکان رہائش پذیر تھے-ان ۱۳۶۶

مذکورہ مکانات میں ۱۰۱۰ ملکیتی ۱۴۴ کرائے اور ۲۱۲ مفت تھے۔ ۱۲۶۸ تعمیر شدہ ۸۱۰ سیمنٹ کے پکے مکانات تھے جبکہ ۵۰ مکان پتھر اور گارے اور ۴۰۷ کچی مٹی کے بنے ہوئے تھے۔ ۱۴ افراد کے پاس کوئی کمرہ رہائش کے لیے نہیں تھا اور ۲۹ء ۲ افراد فی کمرہ رہائش پذیر تھے۔

۳۶ برس کی اس سماجی زندگی میں بڑی تبدیلیاں واقع ہو چکی ہیں۔ آبادی میں پانچ گنا اضافے کے سبب مکانات اور دکانات کی تعداد میں بھی بہت حد تک اضافہ ہو چکا ہے۔ ۱۹۹۷ء کے ایک سروے کے مطابق پنڈی بھٹیاں میں ۱۲۶۸ دوکانیں ہیں۔ ترقی کی منزلیں طے کرتے کرتے اب یہ قصبہ تحصیل صدر مقام بن چکا ہے۔ اس لحاظ سے سول عدالت اور اسسٹنٹ کمشنر کے دفاتر موجود ہیں۔ چاول چھڑنے کے ۶ اور برف بنانے کے ۵ کارخانے اور دو غلہ منڈیوں کے علاوہ یہاں جین کی پتلونیں بنانے کا دنیا کا سب سے بڑا کارخانہ بھی قائم ہے۔ پانچ سرکاری بنکوں، ایک انشورنس کمپنی اور کئی دیگر سرکاری دفاتر کے علاوہ شور زدہ زرعی زمینوں کی تحقیقات کا بہت بڑا ادارہ بھی ہے۔ اس ادارہ کے کئی محقق ڈاکٹریٹ کی ڈگری کا اعزاز حاصل کر چکے ہیں۔ لڑکوں کے ڈگری کالج کے ساتھ ساتھ لڑکوں کے دو اور لڑکیوں کا ایک ہائی اور متعدد پرائمری سکول بھی قائم ہیں۔ اب اس کے قرب میں اسلام آباد لاہور اور فیصل آباد پنڈی بھٹیاں موٹروے کی تعمیر سے مستقبل میں اس کی ترقی کی نئی راہیں کھلی ہیں۔

☆☆☆

دلے دی بار کی قدیم تاریخ

تاریخ "دلے دی بار" کے مرکزی مقام پنڈی بھٹیاں اور گردونواح کی قدیم جغرافیائی حالت کے بارے میں بتانے سے قاصر ہے۔البتہ ماہرین کی قیاس آرائی کے مطابق آخری حجری عہد میں اس علاقے میں آبادی کے آثار ضرور موجود تھے۔اس عہد (تقریباً چار ہزار قبل مسیح) کے پاکستان کے خطوں کے لوگوں نے پتھر کے زیادہ اعلیٰ اور موثر بلحہ آسانی سے استعمال ہو جانے والے آلات اور ہتھیاروں کو استعمال میں لانا شروع کر دیا تھا۔اس عہد کا سب سے پہلا برتن ٹوکری یا مٹکا ہے۔اس طرح کے کئی برتن پنجاب کے کئی علاقوں سے دریافت ہوئے ہیں۔بار کے قصبہ جلالپور کہنہ کی قدیم آبادی پر ایک مکان کی کھدائی کے دوران چند ایسی قبریں دریافت ہوئی ہیں جن میں مٹی کے قدیم ساخت کے مٹکے دفن تھے۔یہ قبریں آریا لوگوں کی بھی ہو سکتی ہیں جو ۱۸۰۰ء قبل مسیح میں وسطی ایشیاء کی طرف سے ہندوستان آنا شروع ہوئے۔صوبہ سرحد کے علاقوں سے اس طرز کی قبریں دریافت ہوئی ہیں۔ایک قیاس یہ بھی ہے کہ آریاؤں کے حملوں کے نتیجے میں سازوسامان کے ساتھ ہی ان مقامی آبادیوں کو نیست و نابود کیا گیا ہو۔بہر حال آریاؤں نے اپنے صحیح قدم تو پنجاب ہی میں جمائے اور یہیں پر انہوں نے اپنے آریاورت کو ترقی دی تھی۔یہاں پر پہنچ کر آریاؤں نے سات دریاؤں کی زمین ہی کو اپنا وطن قرار دیا کیونکہ وہ اس گنتی میں پنجاب کے پانچ دریاؤں کے ساتھ ساتھ ہاکرہ اور چاؤتانگ دریاؤں کو بھی شامل کرتے تھے۔اب یہ دونوں دریا بالکل خشک ہو کر ختم ہو چکے ہیں۔(۵)

آریا بنیادی طور پر لڑاکا لوگ تھے۔وہ آپس میں بھی لڑتے تھے اور یہاں کے مقامی لوگوں سے بھی لڑتے رہتے تھے۔یہاں کے مقامی لوگ کالے رنگ، چپٹی موٹی ناک والے تھے۔آج کل کے مصلی اور دراوڑ نسل کے لوگ اس شکل و صورت کے بہت حد تک قریب ہیں یہ لوگ امن پسند تھے اور سیاسی اور سماجی سطح پر ان مقامی لوگوں میں سرداری نظام رائج تھا۔آریاؤں نے بھی اس نظام کو اپنایا۔انہوں نے اس نظام کو "سبھا" بلانے کا نام دیا۔اسی دور میں بڑھئی اور ترکھان لوگوں نے بڑی ترقی کر لی تھی۔وہ اعلیٰ درجے کی تیز رفتار پہیوں والی بگھیاں بنانے لگے تھے۔آریاؤں نے سینکڑوں سال یہاں حکومت کی۔ساتویں صدی قبل از مسیح کے لگ بھگ گندھارا کا علاقہ سب سے زیادہ مستحکم اور مضبوط تھا۔اس گندھارا علاقہ میں پشکلاوتی (پشاور کے نزدیک غالباً چارسدہ کا علاقہ) اور "ساکلا" (غالباً سانگلہ ہل) اور ٹیکسلا سب سے مشہور اور بڑے شہر تھے۔پھر ۵۲۲ قبل مسیح میں اس عظیم سلطنت پر فارس کے دریوس اعظم (دارا) نے قبضہ کر لیا تھا۔یونان کے مشہور تاریخ دان،

ہیروڈوٹس کے مطابق اس سلطنت کا نام ہندوش تھا اور اس میں سندھ اور پنجاب کا سارا علاقہ شامل تھا۔

اس دوران ہندوؤں اور آریاؤں میں سماجی سطح پر ذات پات کی تقسیم کا جو مضبوط نظام قائم ہو چکا تھا۔ جس میں برہمن کو سب پر برتری حاصل تھی اور اچھوتوں کو سب سے کم تر اور گھٹیا درجہ دیا گیا تھا۔ اس غیر مساویانہ درجہ بندی کے رد عمل کے طور پر بدھ مت اور جین مت مذاہب وجود میں آئے۔ ان مذاہب کو رفتہ رفتہ بہت ترقی ملی۔ وسطی پنجاب میں بھی اس کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس وقت سانگلہ جو ساکلہ یا ساکالہ کے نام سے مشہور تھا۔ بدھ مت کے ایک مضبوط قلعہ کی حیثیت اختیار کر گیا اور اس کے گرد و نواح کاٹھیہ قبیلہ سیاسی طور پر حکومت کر رہا تھا۔ (٦) پنڈی بھٹیاں اور جلالپور قصبوں کے تو اس وقت نام و نشان نہ تھے۔ البتہ دولے کی بار کے اس علاقے میں دیہاتی زندگی کے واضح آثار موجود تھے اور ہندو جاٹ قبائل اور آہیر اور بجراؤں کی عملداری اس علاقے پر قائم تھی۔ یہ تمام جاٹ بنیادی طور پر زراعت پیشہ تھے۔

سکندر اعظم کا حملہ :

اسی اثناء میں تقریباً ۲۳۰۰ سال قبل عظیم فاتح سکندر اعظم کئی ملکوں کو فتح کرتے اور روندتے برصغیر پاک و ہند پر حملہ آور ہوا۔ شمالی علاقوں اور صوبہ سرحد کے علاقوں کو فتح کرنے کے بعد وہ دریائے جہلم کے شمال مغربی علاقے کے راجہ پورس سے نبرد آزما ہوا۔ راجہ پورس کو شکست دینے کے بعد سکندر اعظم نے شاید کسی غلط فہمی اور جغرافیائی غلطی کی بناء پر ایک بحری بیڑا تیار کروایا۔ اسی اثناء میں اس نے مشرق کی جانب بھی چند ایک علاقے فتح کر لیے۔ سکندر اعظم اب یہاں سے باقی وسطی ہندوستان اور وادی گنگا جمنا کی حکومتوں سے نبرد آزما ہونے کے لیے کوچ کرنے کی تیاریاں کرنے لگا کہ اس دوران اسے یہ معلوم ہوا کہ اکثر حکمرانوں کے پاس ہاتھیوں کی افواج بھی ہیں۔ اس لیے سکندر کے سپاہیوں نے مزید پیش قدمی سے انکار کر دیا۔

اسی دوران سکندر اعظم کو اطلاع ملی کہ سانگلہ کے گرد و نواح کاٹھیہ قبائل اس پر حملہ کی تیاریوں میں مصروف ہیں۔ چنانچہ اس نے دریائے راوی کو عبور کر کے سانگلہ کی طرف مارچ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس غرض کے لیے وہ چناب کے دوآبے یعنی دولے کی بار میں داخل ہوا اور دو روز کے سفر کے بعد پمپ راما شہر پہنچا۔ جہاں اس نے اپنے سپاہیوں اور گھوڑوں کو تازہ دم کیا۔ پھر پنڈی بھٹیاں اور سکھیکی کے درمیانی علاقے میں آ کر اپنے فوجی کیمپ لگائے اور کچھ دیر قیام کرنے کے بعد یہاں سے سیدھا سانگلہ ہل پر حملہ کی غرض سے روانہ ہو گیا۔ اس وقت سانگلہ دفاعی اعتبار سے ایک مضبوط شہر تھا۔ اس کے چاروں طرف مضبوط اونچی قلعہ نما دیواریں تھیں اور ان دیواروں کے ساتھ ساتھ گہری

خندقیں تھیں جن میں پانی چھوڑا گیا تھا- صرف ایک دروازہ شہر کے اندر داخل ہونے کے لیے موجود تھا- سکندر اعظم نے پنجاب میں جتنی بھی لڑائیاں لڑیں ان میں سب سے زیادہ مزاحمت اسے سانگلہ کی طرف سے ہوئی- سکندر اعظم کی فوجوں نے کئی روز تک اس شہر کا محاصر کئے رکھا- بالاخر اس کی فوجوں نے خندق کو تیر کر عبور کیا- قلعہ کی دیواروں پر چڑھ کر اپنی فتح کی راہ ہموار کی- کاٹھیوں کے ۱۷۰۰۰ آدمی مارے گئے-(۷)

ویرور یشل کی بہادری :

سکندر اعظم جب سانگلہ کو زیر کر چکا اور اپنے خیمے میں آرام کر رہا تھا کہ اچانک کہیں سے ایک تیر آکر خیمے کے پردے میں پیوست ہو گیا- اس تیر کے ساتھ ویرور یشل کا خط بندھا ہوا تھا- سکندر نے اس خط کو کھولا تو اسمیں تحریر تھا کہ "اپنا رخ موڑلو- تمہارے لیے یہی بہتر ہوگا-"

ویرور یشل ایک جری سورما تھا- دلے کی بار کا ایک قدیم قصبہ شاہ کوٹ اس کا مستقر تھا- جہاں وہ اپنے سپاہیوں اور حواریوں کے ساتھ رہتا تھا- سکندر اعظم نے سوچا اگر ویرور یشل جیسے بہادر کو مہلت مل گئی تو وہ اس کے لیے خطرہ بن سکتا ہے- اس لیے ایسے دشمن کو سنبھلنے کا وقت نہیں دیا جانا چاہیے- اس نے دوسرے دن کا انتظار کئے بغیر شاہ کوٹ کے علاقے پر شب خون مارا- شاہ کوٹ کی پہاڑیوں پر اس وقت ایک مضبوط قلعہ تھا اور پہاڑیوں کے دامن میں ایک بڑی جھیل تھی- ویرور یشل کے حواری اور سپاہ اس اچانک حملے کے لیے تیار نہ تھے- تاہم ویرور یشل قلعہ سے باہر نکل آیا اور اپنے ساتھیوں سمیت بڑی بے جگری سے دشمن کے ساتھ گتھم گتھا ہو گیا- سکندر کی فوج کے ساتھ گھمسان کا رن پڑا مگر آخر کار سکندر کے منظم اور چاق و چوبند فوجی دستے اچانک حملے کا فائدہ اٹھا کر شاہ کوٹ کے علاقے پر قابض ہو گئے کہتے ہیں اس رات اتنا خون بہا کہ شاہ کوٹ کی جھیل انسانی خون سے رنگین ہو گئی- یہاں سے سکندر اعظم جنوبی ملتان کی طرف روانہ ہو گیا- مگر اپنے پیچھے تباہ و بربادی کے عظیم نشان چھوڑ گیا-(۸)

چینی سیاح ہیون سیانگ کی آمد :

مشہور چینی سیاح ہیون سیانگ ۶۳۰ء میں ہندوستان کی سیاحت کرتا ہوا ساکلہ (سانگلہ) پہنچا تو اس نے اس تباہ شدہ شہر کے کھنڈرات بھی دیکھے- اس وقت تک شہر کی دیواریں تو مکمل طور پر غائب ہو چکی تھیں لیکن اس کی بنیادوں کے آثار ابھی تک موجود تھے- اس نے شہر کے درمیان میں ۱۰۰ بدھ درویشیوں کے مسکن اور دو بدھ سٹوپوں کی موجودگی کا ذکر کیا ہے جو مشہور حکمران اشوک

کے زمانے کے تھے- بدھوں کی تاریخی دستاویزات کے حوالے سے ساکلہ کا حوالہ ایک افسانوی قصے کے حوالے سے بھی ملتا ہے جس میں کہا گیا کہ سات بادشاہ ساگل (سانگلہ) بادشاہ کوساکی بیوی پر بھوتی کو اٹھانے کے لیے پہنچے- شہر کے باہر ان کا سامنا بادشاہ کوسا سے ہوا جو ہاتھی پر سوار تھا- اس نے ان ساتوں بادشاہوں کو دیکھتے ہوئے چیخ کر بلند آواز میں کہا کہ "میں کوسا ہوں" یہ آواز پوری دنیا میں سنی گئی- اس آواز سے ساتوں بادشاہ بھاگ کھڑے ہوئے- علاوہ ازیں دلے کی بار کے اس اہم علاقے سکلہ کا ذکر مہابھارت کی نظم میں بھی ملتا ہے- اس نظم کے مطابق سکلہ یعنی سانگلہ مدرادیش سلطنت کا دارالحکومت تھا- اس سلطنت کو جرتیکاس (Jartikas) اور بھی کاس (Bhikas) بھی کہا جاتا- اس کی حدیں دریائے بیاس سے لے کر چناب تک پھیلی ہوئی تھیں- یوں اس زمانے میں پنڈی بھٹیاں کا علاقہ اسی سلطنت کا حصہ شمار ہوتا تھا-

سکلہ کی تباہی کے بعد بار کے علاقے میں ایک اور شہر کو عروج حاصل ہوا- یہ شہر خانقاہ ڈوگراں کے قریب اسرور یا مسرور کے نام سے مشہور تھا- یہ اس سلطنت کا دارالحکومت تھا جس کی حدود دریائے سندھ سے بیاس تک تھیں- اس عرصے میں پنڈی بھٹیاں اور گردونواح کا تمام علاقہ اسی سلطنت کے زیر تحت تھا- مسرور اس وقت زراعت کے لحاظ سے ایک خوشحال مقام تھا- یہاں ایک ایاک (Ayak) نام کی ندی بہتی تھی جو سیالکوٹ کے شمال مشرقی حصے یعنی جموں کی پہاڑیوں سے آتی تھی اور اسرور پہنچ کر یہ نہر دو شاخوں میں تقسیم ہو جاتی تھی- ایک شہر کے دائیں طرف مڑ جاتی تھی اور دوسری شہر کے بائیں طرف سے- یہ دونوں شاخیں سکھیکی کے قریبی علاقے سے گزر کر سانگلہ ہل سے اڑھائی میل پہلے پھر مل کر ایک ہو جاتی تھیں- اگرچہ یہ نہریں اب مکمل طور پر سوکھ چکی ہیں مگر بعد میں اس کے بہاؤ کے اوپر مغل بادشاہ شاہ جہاں کے بیٹے دارہ شکوہ نے ایک ندی کھدوائی تھی تاکہ وہ اس کے شکار کے لیے کام آسکے- یہ نہر جھرلی کے نام سے مشہور تھی-(۹) چند سال قبل محکمہ آثار قدیمہ نے خانقاہ ڈوگراں کے قریب میاں علی ڈوگراں اور میاں علی فقیراں کے درمیان کھدائی کی تھی- اس دوران پختہ اینٹوں کی ایک حفاظتی دیوار جو ڈیڑھ میٹر چوڑی اور چھ میٹر کے قریب بلند تھی دریافت ہوئی- اس کے علاوہ یہاں سے ہندوستانی اور یونانی النسل حکمرانوں کے دور کے سکے اور مٹی کے برتنوں کے ایسے ٹکڑے بھی برآمد ہوئے جو اس سے پہلے تلمبہ ضلع ملتان اور ٹیکسلا سے برآمد ہوئے تھے-(۱۰)

دیگر خاندانوں کی عملداری:

سکندر اعظم کے بعد پنجاب پر مختلف خاندانوں کی حکومتیں رہیں اور مقامی راجے اور مہاراجے

ان حکمران خاندانوں کی فرمانبرداری کرتے رہے- پہلے موریہ خاندان کا سکہ رائج رہا پھر مینیڈر پنجاب پر حکمرانی کرتا رہا- پانچویں صدی عیسوی کے دوران پنجاب میں گپت خاندان کا زور ختم ہوا تو ہن حکمرانوں کا یہاں غلبہ ہوا جن کی حکمرانی چناب کی وادیوں تک رہی- اس علاقے کی زندگی میں اہم موڑ اس وقت آیا جب ساہی رائے کی موت کے بعد اس کا بیٹا ہریش تخت نشین ہوا- ساہی رائے چچ کے بعد حکمران بنا تھا- ہریش نے برہمن گڑھ کو پہلی بار صوبہ کا درجہ دیا- علاقہ جات پنڈی بھٹیاں، تلواڑہ، چاچ (چنیوٹ) شورکوٹ، لیہ اور دیپالپور اس صوبے میں شامل کر دیئے گئے- اس کے بعد مسلمانوں کے دور کا آغاز ہوا تو خلافت عباسیہ کے عہد میں موسیٰ بن کعب، تمیمی، عینیہ اور عمر بن حفص یکے بعد دیگرے ان علاقوں کے گورنر مقرر ہوئے- بعد میں جب مسلمان حکمران محمود غزنوی نے ہندوستان پر حملہ کیا تو اس وقت ہندو شاہی کا حکمران راجہ جے پال تھا- (۱۱) پنڈی بھٹیاں، جلالپور کے علاقہ جات اس زمانے میں راجہ بھاٹیہ کے باجگذار تھے- راجہ بھاٹیہ کا مرکز بھیرہ تھا- راجہ بھاٹیہ نے محمود غزنوی کے دوسرے حملے کے وقت محمود غزنوی کے خلاف راجہ جے پال کی مدد کی تھی- چنانچہ ان لڑائیوں میں جلالپور کہنہ کا قصبہ بھی متاثر ہوا اور یہ شکست و ریخت کا شکار ہو گیا- بالآخر راجہ جے پال کو شکست ہوئی اور اس نے غزنوی کی باجگذاری قبول کر لی- یہی وہ وقت تھا جب پنڈی بھٹیاں اور گردونواح کے عام ہندو جاٹ آہیر اور ہجراؤں نے اسلام قبول کرنا شروع کیا- اس دوران مسلمان بزرگان دین نے بھی سلسلہ درس و تدریس اور وعظ و تبلیغ پر بھی خصوصی توجہ دینی شروع کر دی تھی- ان کے اثرات سے بھی بار کے علاقے میں اسلام تیزی سے پھیلنے لگا تھا-

غزنوی خاندان کے بعد یہاں غوری، سلاطین اور خلجی خاندانوں کی حکومت رہی- خلجی خاندان کا پہلا حکمران جلال الدین خلجی (۱۲۹۰ عیسوی) میں دہلی میں تخت پر بیٹھا تھا- وہ اپنے عہد میں امن و سکون اور فروغ اسلام کے لیے کام کرتا رہا اس عہد کی تعمیر شدہ ایک مسجد جلالپور کہنہ میں آج بھی اصل حالت میں موجود ہے جو اس وقت ملتان جموں کی قدیم شاہراہ ہونے کے باعث شاید مسافروں کی سہولت کے لیے تعمیر کی گئی تھی- یہ ایک تجارتی گزرگاہ تھی جو کشمیر سے وسطی پنجاب اور اس سے آگے جانے والوں کے لیے کام دیتی تھی- خلجی حکمرانوں کے زوال کے بعد تغلق خاندان برسر اقتدار آیا- اس خاندان کے دوسرے حکمران محمد تغلق کے عہد میں راجستھان کا علاقہ سیاسی ابتری کا شکار ہو چکا تھا- مقامی راجے مہاراجے باہم برسر پیکار تھے- اسی عہد میں جیسلمیر کے علاقے بھٹنیر سے بھٹی قبیلے نے ہجرت کی اور پنجاب میں آبسے-

☆☆☆

بھٹی قبیلہ کی آمد اور قصبہ پنڈی بھٹیاں کا قیام

یہی وہ دور تھا کہ جب راجہ دھیر رائے جیسلمیر کے پڑپوتے اودونن گھراج نے اسلام قبول کیا تھا۔ اس پر غیر مسلم راجپوت بھٹی برادری نے ان کا معاشی سماجی اور خاندانی بائیکاٹ کر دیا اور ریاست سے ہجرت کر کے انتہائی بے سر و سامانی کی حالت میں نور محل کے جنگلوں میں پناہ گزیں ہوئے۔ ایک دوسری روایت کے مطابق اس قوم کے ایک بزرگ ڈھیر نامی کا بھٹنیر میں کسی امر پر اپنی قوم سے جھگڑا ہوا تو وہ معہ اہل و عیال اپنے وطن مالوف بھاٹنیر کو چھوڑ کر نور محل کے جنگلوں میں آ گیا تھا۔ ان کے دشمنوں نے ان کا بڑی دور تک پیچھا کیا۔ مگر اس خاندان کے مردوں نے موچھوں کا روپ دھار کر اپنی جانیں بچائیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کے بھٹیوں میں طویل عرصے تک ایسی رسمیں رائج رہیں کہ جن میں موچیوں کے اوزاروں کو مقدس سمجھا جاتا رہا۔ بہر حال یہ بھٹی نور محل کے جنگل میں عرصہ دراز تک خانہ بدوشوں کی سی زندگی بسر کرتے رہے اور جنگل میں گھوم پھر کر اپنے مال مویشی چراتے رہے۔ کہا جاتا ہے کہ مذکورہ جنگل کے نواح میں ایک ایسی قوم آباد تھی جس کا پیشہ ہی مویشی چوری کرنا تھا۔ وہ قوم بھٹیوں کے اس خانہ بدوش خانوادے کے مویشی اکثر چوری کر لیا کرتی تھی۔ اس مویشی چور قوم سے اس خاندان کو کافی نقصان اٹھانا پڑا۔ اس آئے دن کے نقصان سے تنگ آ کر اس ڈھیر نامی شخص کے ایک پوتے داراج نامی نے خانہ بدوشی کی زندگی ترک کر دی اور دریائے راوی کے کنارے ایک موضع نامی فتح کی میں سکونت اختیار کر لی۔ بعد میں اس داراج کا ایک بیٹا جس کا نام ادو تھا خانقاہ اسرور (خانقاہ ڈوگراں) میں سکونت اختیار کر لی۔ اس ادو کے بارہ بیٹے پیدا ہوئے۔ ان بارہ میں سے چار بیٹے داو، لکھڑا، ریکو مال اور تاجو خاندان کے دیگر افراد کے ہمراہ بہتر ذریعہ معاش کی غرض سے پنڈی بھٹیاں کے علاقے کی طرف آ گئے۔ (۱۲) اس وقت یہ قصبہ موجود نہیں تھا البتہ اس کے قریب باغ۔ہو کے نام سے ایک گاؤں آباد تھا۔ جہاں قبیلہ ہنجرا کی عملداری تھی اور ان کا سردار۔ہو تھا۔ بھٹی قبیلہ راجپوت ہونے کے باعث جنگی خصلتیں رکھتا تھا اور جنگ میں جان دینا نیکی سمجھتا تھا لیکن یہاں چونکہ ان کی آمد پناہ گزینوں کی حیثیت سے ہوئی تھی اس لیے پہلے پہل ہنجراؤں کی فرمانبرداری ہی کرتے رہے۔ ہنجراؤں کے سردار۔ہو نے بھی ان کو پناہ دینے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہ کی۔ کیونکہ اس وقت دلے کی بار کا پورا علاقہ بے آب و گیاہ اور گھنے جنگلات سے گھرا ہوا تھا۔ آبادی بہت کم تھی۔ اس وجہ سے عدم تحفظ کا احساس ہنجراؤں کے اندر موجود تھا۔ چنانچہ

بھٹیوں نے باغ سہو کے باہر ہجر اؤں کی زمینوں پر ڈیرے ڈال لیے - خیمے ، بانس اور ضروری اشیاء کی فراہمی میں ہجر اؤں نے ان کی پوری مدد کی - بھٹیوں نے کوئی پچیس تیس برس اسی حالت میں ہجر اؤں کی میزبانی میں بسر کئے - ان کی گزر بسر زیادہ تر جنگلی پھلوں اور جانوروں کے شکار اور ان معمولی زمینوں کی کاشت پر تھی جو ہجر اؤں نے ان کو دی تھیں -اس وقت پنڈی بھٹیاں کے موجودہ مقام پر ایک ٹبہ تھا اور اس کے گرد اگرد گھنے جنگلی درخت تھے -ایک روز بھٹیوں کے تین چار جوان شکار کی غرض سے اس جنگل کے قریب پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ جھاڑیوں کے بیچوں بیچ ایک بھیڑ اور اس کے نومولود بچے پر دو بھیڑیے حملہ آور ہو رہے ہیں لیکن بھیڑ اپنے بچے کی حفاظت میں اپنی جان کی پرواہ کئے بغیر بھیڑیوں کے آگے ڈھال بنی ہوئی ہے - یہ عجیب و غریب منظر دیکھ کر شکاری بہت متاثر ہوئے اور بھیڑیوں کو اپنے نشانوں سے مار بھگایا اور خود بھیڑ اور اس کے دونوں بچوں کو اٹھا کر اپنے قبیلے کے پاس لے آئے -رات کو عموماً بھٹی مرد بیٹھک لگاتے تھے اور بعض اہم فیصلے بھی کرتے تھے -اس رات یہ بزرگ حسب معمول اکٹھے ہوئے تو شکاریوں نے بھیڑ اور بھیڑیوں کی ساری کہانی قبیلے کے بزرگوں کو سنائی - وہ اس سے بڑے متاثر ہوئے اور اندازہ لگانے لگے کہ جس جگہ یہ واقعہ پیش آیا ہے وہاں کی مٹی بڑی زور آور ہے -اس پر اگلے روز بھٹی قبیلے کے بزرگوں کا ایک اہم اجلاس منعقد ہوا اور فیصلہ کیا گیا کہ اب چونکہ ان کو ہجر اؤں کے پاس رہتے ہوئے کافی عرصہ ہو چلا ہے اور ہجر اؤں نے بھی ان کی نگہداشت اور رہن سہن میں کوئی کسر نہیں چھوڑی لہذا اب ان کو ایک الگ جگہ بسا لینی چاہیے اور جگہ بھی وہی ہو جہاں بھیڑ بھیڑیے کا واقعہ رونما ہوا ہے -اس فیصلے کے مطابق بھٹیوں نے ہجر اؤں کے سردار سہو خاں سے درخواست کی وہ انہیں ٹبہ پر جا کر آباد ہونے کی اجازت دے دے - سہو نے بلا کسی پس و پیش بھٹیوں کو ٹبہ پر آباد ہونے کی اجازت دے دی -اس طرح بھٹی باغ سہو سے اٹھ کر اس ٹبہ پر آبسے جہاں اب پنڈی بھٹیاں آباد ہے -اس ٹبہ کی مناسب کانٹ چھانٹ کر کے اس کو رہنے کے قابل بنایا گیا اور کچھ مٹی کے کچے گھروں کی تعمیر شروع کی گئی - قدیم رواج کے مطابق پانی کے کچھ کنویں بھی کھودے گئے - طویل عرصے بعد یعنی شاہ جہاں کے دور میں دائم بھٹی شخص نے شہر کے چاروں اطراف حفاظتی دیوار بھی تعمیر کر دی اس طرح یہاں بھٹیوں نے ایک منظم زندگی کا آغاز کیا اور یہیں سے اس قصبے کا نام پنڈی بھٹیاں مشہور ہو گیا - بعد میں یہاں سے کچھ بھٹی افراد جلالپور ، بھٹی چک ، حسن والا اور دیگر علاقوں میں جا جا کر آباد ہوتے رہے اور ان قصبوں اور دیہاتوں کو آباد کیا - ایک اور روایت کے مطابق پنڈی بھٹیاں کے مقام پر ایک ہندو پنڈی داس پہلے سے رہائش پذیر تھا اور لین دین و اثر و رسوخ میں یکتا تھا -اس کے نام سے پنڈی مشہور ہوئی اور بعد ازاں بھٹیوں کی ملکیت کی وجہ سے پنڈی بھٹیاں بن گئی - یہ روایت زیادہ معتبر نہیں ہے کیونکہ اس روایت کو اگر تسلیم

کر لیا جائے تو اس کا مطلب ہے پنڈی بھٹیاں، بھٹیوں کی یہاں آمد سے قبل ہی آباد تھا اور کاروبار ہوتا تھا۔ جبکہ اس کی مقامی لوک روایتوں میں کوئی شہادت نہیں ملتی۔(۱۳)

واقعہ میاں علی شعاری:

اسی دوران جبکہ بھٹی ابھی نئے نئے باغ سیہو سے اٹھ کر یہ پر آکر آباد ہوئے تھے ایک مسلمان صوفی بزرگ میاں علی شعاری تبلیغ کی غرض سے اپنے صوفیانہ رنگ ڈھنگ میں اس طرف آئے۔ یہ بزرگ تقریباً ہر برس یہاں آتے تھے۔ کئی ہجرا ان کے مرید تھے۔ لیکن خود ہجراؤں کا سردار ان کے معتقدین میں شامل نہیں تھا۔ اس مرتبہ جب یہ بزرگ یہاں آکر قیام پذیر ہوئے تو ان دنوں گاؤں میں شادی کی ایک تقریب ہو رہی تھی۔ گاؤں کی نوجوان لڑکیاں رسم و رواج کے مطابق گاؤں سے باہر کنویں پر گھڑولی (گھڑے میں پانی) بھرنے گئیں۔ راستے میں وہ لوک گیت گاتے اور ثقافتی ناچ ناچتے جاتی تھیں۔ جب کنویں کے قریب میاں علی شعاری نے یہ منظر دیکھا تو وہ ناچنے لگے۔ انہوں نے اس وقت صرف لنگوٹ پہن رکھا تھا۔ دو تین مرید بھی ان کے ساتھ ناچنے لگے۔ اسی اثناء میں وہاں ہجراؤں کا سردار آگیا اور غصے سے لال پیلا ہو گیا۔ اس نے میاں علی شعاری کو بازؤں سے پکڑا اور برا بھلا کہتا ہوا اپنے گاؤں سے باہر دھکیل دیا۔ اس پر میاں علی شعاری ناراض ہو کر پنڈی بھٹیاں، بھٹیوں کے پاس آگئے۔ بھٹیوں نے ان کی دلگیری کی۔ پیچھے سے میاں علی شعاری کے بعض مریدوں نے آکر معافی طلب کی اور زیادتی کا ازالہ کرنے کی استدعا کی اور واپس اپنے ساتھ گاؤں لے جانے پر اصرار کیا۔ مگر میاں علی شعاری راضی نہ ہوئے۔ بھٹیوں نے ان کی خوب خدمت خاطر کی اور ایک چادر اور بچھڑا جس کو اس وقت کی زبان میں گودھا کہتے تھے نذرانہ کے طور پر پیش کیا۔ میاں علی شعاری نے بھٹیوں کا یہ نذرانہ قبول کیا اور دعا دی کہ بھٹیوں کو خدا سدا آباد رکھے۔ اس کے بعد علاقے میں ہجراؤں کی طاقت میں مسلسل کمی اور بھٹیوں کی طاقت میں اضافہ ہوتا گیا۔ بھٹی چونکہ پہلے ہی جنگجو تھے۔ اس لیے آہستہ آہستہ وہ ہجراؤں کی زمینوں پر قبضہ کرتے گئے۔(۱۴) چنانچہ ان کی طاقت میں اضافے کے ساتھ ہی جیسلمیر کے علاقوں سے بھٹیوں کے دیگر افراد بھی ہجرت کر کے یہاں آکر بسنے لگے۔ رفتہ رفتہ دیگر قوموں کے افراد بھی آتے گئے اور یہاں کی مقامی آبادی میں اضافہ کرتے گئے۔ یوں بار کے اس علاقے میں زندگی رواں دواں ہوتی اور بھٹیوں کی عملداری بھی قائم ہوتی گئی۔

☆☆☆

دلا بھٹی کا عروج وزوال

بجلی خاںساندل کی مغلوں کے ساتھ لڑائی :

مغلوں کے ابتدائی دور تک توبار کے اس علاقے میں حالات پر سکون رہے لیکن سولہویں صدی کے وسط تک تخت دہلی کے کمزور ہو جانے کی وجہ سے تمام بر صغیر انتشار اور چھوٹی چھوٹی خود مختار ریاستوں میں تقسیم ہو چکا تھا جو کہ ریاستوں کے باہمی نفاق کی وجہ سے مغل حملہ آوروں کی یلغار کا باعث بنا- ان مغل افواج کا گزر پنڈی بھٹیاں اور اس کے نزدیکی علاقوں (ساندل بار) سے ہوتا تھا- اس زمانے کی زراعت بھی زوروں پر نہیں تھی جبکہ لوگ اپنی ضرورت کے مطابق اناج پیدا کرتے تھے اور سر سبز چراگاہوں کی وجہ سے مغل حملہ آور فصلوں اور چراگاہوں کو اجاڑ دیتے تھے اور آبادیوں میں لوٹ مار مچاتے اور گھوڑوں جانوروں کے لیے تمام اناج علاقے سے اکٹھے کر کے لے جاتے تھے- مدافعت کرنے والوں کا قتل عام کیا جاتا اور آبادیوں کو آگ لگا دی جاتی- یہ ایک نقطہ تھا جہاں سے مغلوں اور یہاں کے بھٹیوں کے درمیان نفرت اور دشمنی کا آغاز ہوا- چنانچہ بجلی خان المعروف ساندل نے علاقائی خود مختاری اور تحفظ کے لیے ارد گرد کے قبائلی سرداروں کو ساتھ ملا کر چھوٹی سی فوج منظم کر کے مغل افواج پر چھاپہ مار کارروائیاں شروع کر دیں- یوں بجلی خاں ساندل اور اس کے بیٹے فرید خاں بھٹی کی بہادری اور شجاعت کا ڈنکا پورے علاقے میں بجنے لگا- چنانچہ آس پاس کے راجے اور سردار اس کی ماتحتی میں آنے لگے- پانی پت کی دوسری لڑائی سے پہلے مغل انتہائی افراتفری کا شکار اور کمزور پوزیشن اور مایوسی کی حالت میں تھے- بابر کو صرف ۴ سال تخت نصیب ہوا- ہمایوں کو پندرہ سالہ جلاوطنی کے بعد صرف چھ ماہ تخت دہلی نصیب ہوا- ہمایوں کی چھ ماہ بادشاہت کے دوران اکبر مشرقی پنجاب کا بیرم خان کی نگرانی میں ۲۳ جولائی ۱۵۵۵ء تا ۱۳ فروری ۱۵۵۶ء گورنر رہا- اکبر نے پنجاب کی گورنری کے دوران انتہائی بہادر اور تجربہ کار جرنیلوں کی سرکردگی میں اپنی فوجی مہم مغربی پنجاب ساندل بار اکتوبر میں روانہ کی- مغلوں اور بھٹیوں اور ان کے حلیفوں کے درمیان گھمسان کا رن پڑا- مغلوں کو فتح ہوئی اور قلعہ فرید (موجودہ جگہ قلعہ چاہ) پنڈی بھٹیاں کو تباہ کر دیا گیا- زخمی ساندل اور اس کے بیٹے فرید خاں بھٹی کو شاہی قلعہ لاہور میں پیش کیا گیا- مگر مغل فوج کو اناج کی فراہمی، خراج کی ادائیگی اور اطاعت قبول کرنے سے ان دونوں باپ بیٹوں نے انکار کر دیا- چنانچہ ان کو باغی قرار دے کر تختہ دار پر لٹکا دیا گیا- اس پر بس نہیں ہوئی بلکہ

مغلوں نے ساندل اور فرید بھٹی کی لاشوں میں بھس بھر وا کر ان کی سر عام نمائش کی تا کہ حکومت کے خلاف سر اٹھانے والوں کو دوسروں کے لیے درس عبرت بنادیا جائے۔(۱۵)

دلا بھٹی کی اکبر بادشاہ کے ساتھ لڑائیاں :

جب یہ خبر ساندل کے علاقے میں پہنچی تو بجلی خاں ساندل کا پوتا اور فرید کا بیٹا عبداللہ عرف دلا بھٹی ابھی بچہ تھا مگر دوسرے نوجوانوں کا خون کھول اٹھا اور وہ پہلے سے زیادہ مغلوں سے نفرت کرنے لگے۔اس دوران اکبر شہنشاہ ہند بن چکا تھا اور ایک نئے دین کی بنیاد بھی قائم کر دی تھی۔علمائے سو مادی منفعت کی خاطر مہر بہ لب ہو گئے۔مگر شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی اور ان کے نقش قدم پر چلنے والے علماء سیسہ پلائی دیوار کی طرح اس دین اکبری کے سامنے ڈٹ گئے۔افغان قبائل یوسف زئی ریاست سوات میں اکبر کی بے دین حکومت کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔عبداللہ خاں ازبک نے عوام کو مذہبی خیالات کے خلاف اکسایا۔کشمیر میں یوسف شاہ اور اس کے بیٹے یعقوب نے اکبر کی اطاعت قبول کرنے سے انکار کر دیا۔اکبر کی بے راہ روی اور لادینیت کے خلاف لوگوں کے دلوں میں شدید نفرت پیدا ہوئی۔اس پر اکبر نے علماء و فضلاء پر ظلم کا بازار گرم کیا تو کچھ علماء جان بچا کر راوی پار ساندل بار دلا بھٹی کے پاس پناہ لینے میں کامیاب ہو گئے۔چنانچہ کسانوں کا استحصال، باپ دادا کا قتل اور دین الہی کے خلاف نفرت ان چیزوں نے دلا بھٹی کو وقت سے پہلے جوان کر دیا اور اس نے اپنی جنگی طاقت میں اضافے کے ساتھ ساتھ زیر تسلط علاقوں کو بھی وسعت دینا شروع کر دی۔علاقے کے سارے سرکردہ سردار جب اس کے ساتھ جمع ہو گئے تو مغلوں کا کوئی قافلہ ادھر سے جا سکتا نہ آ سکتا تھا۔علاقے کے سارے کاشتکار دین الہی کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور سرکاری محصول کی ادائیگی سے لوگوں نے انکار کر دیا تھا۔اس صورتحال میں اکبر بادشاہ نے پوری توجہ سے اس معاملے پر غور کیا اور بنفس نفیس لاہور میں آ ڈیرے ڈالے اور صوبے دار ابکا ملکیرہ کی زیر سرکردگی بارہ ہزار نفوس پر مشتمل ایک قافلہ ساندل بار کے علاقے میں ارسال کیا۔اس وقت دلا بھٹی پنڈی بھٹیاں کے قلعہ میں اپنے مختلف سرداروں داؤد خاں ڈوگر، جمال خاں کھرل، کمال خاں بھٹی، پرتھا جٹ اور دولت خان کے ساتھ صلاح و مشورہ کر رہا تھا۔اس دوران اس کو اطلاع ملی کہ مغل لشکر اس کی طرف بڑھ رہا ہے۔اس وقت بار کے اہم سرحدی مقامات پر گارے کے ۲۵-۳۰ فٹ بلند برج بنے ہوئے تھے۔جہاں ہر وقت ایک آدمی دشمنوں کی نقل و حرکت کی نگرانی کے لیے متعین ہوتا تھا۔خطرے کی کیفیت میں جنگی نقارے بجا دیئے جاتے تھے۔نقارہ بجتے ہی دلا بھٹی اپنا لشکر لے کر بار کے شمالی راستے پر پہنچ گیا۔جب فوجی قافلے کے گھوڑے ان کی زد میں آ گئے تو انہوں نے اچانک حملہ کر

دیا۔ حملہ اتنا اچانک اور شدید تھا کہ مغل فوج حواس باختہ ہو گئی اور اس میں بھگدڑ مچ گئی۔ مغل فوجی قافلے کا سپہ سالار مرزا ملکیرہ جان بچا کر بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ دلا بھٹی کو خبر ہوئی تو تن تنہا اس کے تعاقب میں ہو لیا۔ تلاش بسیار کے بعد دونوں کا آمنا سامنا ہوا تو دلے نے گفت و شنید میں وقت ضائع کئے بغیر تلوار کے ایک ہی وار سے مرزا ملکیرہ کا سر قلم کر دیا۔ کٹے ہوئے سر کو خرجی میں ڈال کر میدے کھتری کو دے دیا جس کی مغل دربار تک رسائی تھی اور اس سے کہا کہ یہ دربار اکبری میں لے جاؤ اور مغل بادشاہ سے کہنا کہ یہ دلا بھٹی کی طرف سے تحفہ ہے۔ "دلا جو ساندل کا پوتا اور فرید خاں بھٹی کا فرزند ہے۔" اس واقعہ سے دلا بھٹی کی پوزیشن کافی مضبوط ہو گئی تھی کیونکہ اس جنگ سے کافی گھوڑے، اسلحہ اور مال غنیمت اس کے ہاتھ لگا تھا۔

میدا کھتری مغل دربار پہنچا اور اکبر کو تمام واقعات سے آگاہ کیا تو اس نے اعلان کیا کہ جو مغل جرنیل دلا بھٹی کو زندہ گرفتار کر کے دربار اکبر میں پیش کرے گا اس کو چھتیس ہزاری منصب دیا جائے گا۔ حالانکہ اکبر کے دربار میں زیادہ سے زیادہ منصب پانچ ہزاری تھا۔ مرزا نظام الدین نے اس کام کا بیڑا اٹھایا۔ وہ انتہائی بہادر سپاہیوں پر مشتمل سولہ ہزار کی فوج، دس توپیں، پچاس ہاتھی لے کر دلا بھٹی کے علاقے کی طرف روانہ ہوا۔ دلا بھٹی ان دنوں راوی کے بیلوں میں مصروف شکار تھا۔ اس کے مرکز پنڈی بھٹیاں میں خواتین اور ذاتی ملازموں کی قلیل تعداد موجود تھی۔ دلا کا بھائی مہرو البتہ شہر کی حفاظت کے لیے ضرور موجود تھا۔ مرزا نظام الدین نے دلا بھٹی کی غیر موجودگی میں شہر کا محاصرہ کر لیا۔ مہرو نے اپنے سپاہیوں کے ساتھ دم آخر تک مقابلہ کیا۔ بالآخر پنڈی بھٹیاں سرنگوں ہوا۔ دلا بھٹی کی بہن بخت النساء ماری گئی اور والدہ اماں لدھی اور دو بیویاں پھلراں اور نوراں قید کر لی گئیں۔ جب ان قیدیوں کو لاہور کی طرف لے جایا جا رہا تھا تو بار کے سرحدی گاؤں کا سردار لال خاں مغل فوج کے سامنے ڈٹ گیا۔ اس کی غیرت نے گوارا نہ کیا کہ دلا بھٹی کے خاندان کی خواتین دربار اکبری میں ذلیل و رسوا کی جائیں۔ لال خان نے عقلمندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے تیز رفتار ہرکارہ دوڑایا اور دلا بھٹی کو اس کی خبر دی۔ دلا بھٹی لشکر لے کر فوراً میدان جنگ میں پہنچا۔ اس کے ماموں رحمت خاں نے اپنے گھڑ سوار بھی اس کے ساتھ کر دیئے۔ یہ جنگ کس جگہ ہوئی اس بارے میں اختلاف ہے۔ بعض روایات کے مطابق یہ خانقاہ ڈوگراں کے قریب میاں علی شعاری کے مزار کے قریب ہوئی کچھ کا خیال بھاگلے نزد چوہڑکانہ کے بارے میں ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ جنگ ٹھیکری والا پتن جو لاہور سے ۷ا میل کے فاصلے پر ہے کے مقام پر ہوئی۔ بہر حال دلا بھٹی نے زبردست جنگی چال چلی جس سے مغل لشکر چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں تقسیم ہو گیا۔ قریب تھا کہ مرزا نظام کا سر تن سے جدا ہو جاتا اس نے بڑی عیاری سے اپنا سر دلا بھٹی کی والدہ اماں لدھی کے قدموں میں رکھ دیا

اور التجا کی کہ اے نیک دل خاتون ماں بن کر مجھے اپنی پناہ میں لے لے- مرزا نظام نے یہ التجا کچھ اس انداز سے کی کہ اماں لدھی کو اس پر رحم آ گیا اور اس نے مرزا نظام کو پناہ دے دی- دلا بھٹی نے ماں کے کہنے پر تلوار نیام میں کر لی اور مرزا نظام کی نہ صرف جان بخش دی بلکہ اسے گلے لگا کر اور پگڑی تبدیل کر کے اسے بھائی تسلیم کر لیا- مرزا نظام نے بھی اپنی وفاداری کا عہد کیا مگر اندرون خانہ وہ کسی اور چال میں تھا- دلا بھٹی کو جنون کی حد تک شکار کا شوق تھا- مرزا نظام نے بھی شکار کو اوڑھنا بچھونا بنا لیا- دونوں جنگل کے بیلوں میں شوق کی تسکین کرتے رہتے- ایک روز مرزا نظام سپہ سالار مغل فوج اپنے منہ بولے بھائی کو ایک ایسی جگہ لے گیا جہاں مغل فوج گھات لگائے بیٹھی تھی- مرزا نظام نے پورا بندوبست کر رکھا تھا- چنانچہ اشارہ ہوتے ہی دلا بھٹی پر تیروں کی بارش کر دی گئی- اس موقع پر بھی دلا کو آسانی سے گرفت نہ ڈالی جا سکی- بلکہ اس نے گھوڑے پر سوار ہو کر اکیلے جوانمردی سے مقابلہ کیا اور کئی ایک کے سر تن سے جدا کر دیئے- بالآخر اسے گرفتار کر لیا گیا- یہ پہلا موقع تھا جب اس باغی کو گرفتار کیا جا سکا- حالانکہ اس سے قبل اس کی سرکوبی کے لیے حافظ آباد میں ایک قلعہ تک تعمیر ہوا- اس کا نظم و نسق اعوان سرداروں کو دیا گیا تھا- اس دور میں قلعے کو گڑھی کے نام سے پکارا جاتا تھا- اس لیے اس قلعے کا نام بھی گڑھی اعوان تھا- آج کے شہر کے جنوب مشرق میں یہ قلعہ ہوا کرتا تھا- ایک بار اعوان سردار اپنے عزیزوں کو ملنے گئے ہوئے تھے کہ دلا بھٹی کے ساتھیوں نے تمام اہل خانہ کو قتل کر دیا اور قلعہ پر قبضہ کر لیا- جب اعوان سردار واپس آئے تو صورت حال دگرگوں پائی- انہوں نے سخت مقابلے کے بعد قلعہ پر دوبارہ قبضہ کر لیا- حالات کی نزاکت کے پیش نظر انہوں نے اکبر اعظم سے درخواست کی کہ انہیں مستقل بسنے کی اجازت دی جائے تاکہ دلا بھٹی کی سرکوبی ہو سکے- چنانچہ اعوان خاندان مستقل طور پر یہاں آباد ہو گئے- لیکن وہ دلا بھٹی کی سرکوبی میں ناکام رہے-

اب مرزا نظام الدین کی چال سے دلا بھٹی کو گرفتار کر کے دربار اکبری لایا گیا تو دلا بھٹی کا دربار میں سر جھکانے کے لیے دربار کے تمام راستے بند کر دیئے گئے اور ایک چھوٹی سی تنگ کھڑکی سے گزرنے کا راستہ رکھا گیا- مگر اس نے کھڑکی سے اپنا سر گزارنے کی بجائے جست لگا کر پہلے پاؤں داخل کئے اور بعد میں اپنا سر- اس کے بعد دلا بھٹی کو اطاعت پر مجبور کیا گیا- مگر اس نے انکار کر دیا تب اسے شاہی قید خانے میں ڈال دیا گیا- کچھ عرصہ بعد ولی عہد شہزادہ جہانگیر کو دلا بھٹی سے گفت و شنید کے لیے بھیجا گیا مگر یہ بات چیت ناکام رہی- چنانچہ دلا بھٹی پر بغاوت کا الزام لگا کر مقدمہ قاضی القضاۃ کے سپرد کر دیا گیا- بالآخر اسے تختہ دار پر لٹکا دینے کا حکم ہوا- اس موقع پر دلا بھٹی نے اکبر اعظم کو سرعام ننگی شرمناک گالیوں سے نوازا- چنانچہ ۲۶ مارچ ۱۵۸۹ء کو محلہ نخاس موجودہ لنڈا

بازار کے قریب نو لکھا بازار میں دلا بھٹی کو سولی پر لٹکا دیا گیا۔

ادھر دلا بھٹی کو سولی لٹکایا گیا ادھر لاہور کے مشہور صوفی شاہ حسین نے جھوم جھوم کر رقص کا آغاز کیا اور ایسے اشعار پڑھے جو تا قیامت اصناف سخن میں سنگ میل کا مقام رکھتے ہیں۔

یا دلبر یا سر کر پیارا
دلے دے لعل لباں دے لارے
سولی پر چڑھ . لے ہلارے
آن ملیسی دلبر یارا
یا دلبر یا سر کر پیارا

(یا دلدار سے پیار کر یا سر کو عزیز رکھ۔ تیرے سامنے لبوں کی سرخی جلوہ دکھا رہی ہے۔اسے حاصل کرنے کی خاطر سولی پر جھول جا۔یار خود بخود مل جائے گا۔)

شاہ حسین، دلا بھٹی اور شیخ بہلول دریائی (جن کا مزار پنڈی بھٹیاں کے نواح میں ہے) ایک تکون تھی جو اکبر کے دین الٰہی کے خلاف تھی۔شاہ حسین کو اس موقع پر کوتوال نے برا بھلا کہا اور پکارا۔"اوئے جادوگر تو سمجھتا ہے کہ میں تیرے چمتکار سے مرعوب ہو جاؤں گا۔میں تیری پیٹھ میں لوہے کی میخ ٹھونک دوں گا۔" یہ بدکلامی سن کر شاہ حسین کا چہرہ سرخ ہو گیا اور پر تاسف لہجے میں کہا "او بدبخت یہ تو نے کیا کہہ دیا ہے۔تو نے اپنی سزا کا خود اعلان کر دیا۔"

پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ دلا بھٹی نے بھرے بازار میں مغل اعظم کو کھری کھری سنائی تھیں۔شہنشاہ اکبر نے جرم وفا کی پاداش میں اسے دار کے حوالے کرنے کے ساتھ یہ ہدایت بھی جاری فرمائی تھی کہ مصلوب ہونے اور کئے جانے کی مکمل روداد تحریرا دربار اکبری میں پیش کی جائے۔کوتوال شہر کی بدبختی کہ اس نے ساری روداد من وعن ایک ایک گالی،ایک ایک الزام شاہ کا ایک ایک گناہ جو کچھ دلا بھٹی کی زبان سے ادا ہوا لکھ کر دربار اکبری میں پیش کر دیا۔یہ خرافات کا پلندہ بھرے دربار میں پڑھ کر سنایا گیا تو درباریوں کے سر شرم سے جھک گئے۔اکبر بادشاہ اچھل کر کھڑا ہو گیا۔اس نا ہنجار کی یہ جرات؟ یہ ہمت! حکم دیا گیا کہ اس نا ہنجار کو توال کی پیٹھ میں ابھی اسی وقت لوہے کی میخ گاڑ دو تا کہ دنیا کو عبرت حاصل ہو اور ہر پل ہر سانس لوگ جلال اکبری کو یاد رکھیں۔فرمان شاہی پر حرف بہ حرف عمل کیا گیا۔شاہ حسین نے کہا تھا "بدبخت تو نے اپنے سزا کا خود اعلان کر دیا اب کچھ نہیں ہو سکتا۔(۱۶) دلا بھٹی کی موت کے بعد پنڈی بھٹیاں اور گرد و نواح کا پورا علاقہ دلے کی بار کے نام سے مشہور ہوا۔

مغل عہد میں پنڈی بھٹیاں اور گردونواح کا نظم ونسق :

بھٹیوں کی علاقائی خود مختاری کے خاتمہ کے بعد بار کے علاقے کو مختلف پرگنوں کے تحت تقسیم کیا گیا- مغلوں کے اس عہد میں موجودہ ڈویژن گوجرانوالہ کے پورے علاقے میں ایمن آباد اور حافظ آباد ہی اہم مقامات تھے-بعد میں سوہدرہ، ساہوالی، بچہ چٹھہ اور شیخوپورہ بھی نئے پرگنوں کے طور پر سامنے آئے-وزیر آباد اور گوجرانوالہ کوئی خاص مقام نہیں رکھتے تھے بلکہ گوجرانوالہ پرگنہ ایمن آباد اور وزیر آباد پرگنہ سوہدرہ میں شامل تھے-اسی طرح پنڈی بھٹیاں، جلالپور، رسول پور، سکھیکی وغیرہ کے علاقہ جات حافظ آباد پرگنہ میں شامل تھے- علاقے سے ٹیکس کی وصولیابی کے لیے جو افسر مقرر تھا اس کا صدر دفتر بھی حافظ آباد میں موجود تھا-وہ ہر سال پرگنہ کے حدود کے مالی حسابات مرکز کو ارسال کرتا تھا- آئین اکبری کے مطابق اکبر بادشاہ کے دور حکومت میں حافظ آباد پرگنہ سے ۱۱۳۷۰۰۷ روپے سالانہ آمدنی ہوتی تھی-(۱۷) علاوہ ازیں عوام کے باہمی جھگڑوں اور مقدمات کا فیصلہ کرنے کے لیے پرگنہ حافظ آباد میں ایک قاضی بھی مقرر تھا-البتہ ایک قاضی کورٹ جلالپور میں بھی قائم کی گئی تھی-(۱۸) یہاں شاہ جہاں کے عہد میں قاضی خاندان کے نور حسین اور اورنگ زیب کے عہد میں جمیل حسین قاضی کے فرائض سرانجام دیتے رہے-یہ قاضی اس زمانے میں بازاروں کے نرخ کی تصدیق بھی کیا کرتے تھے-اس زمانے کے مقامی معاشرے کی تنظیم اور معاشی حالات میں زیادہ مقدمہ بازی کی گنجائش بھی نہیں تھی کیونکہ اکثر اوقات برادری، خاندان اور قبیلے کے بوڑھے فیصلہ طلب مسائل کو خود طے کر لیا کرتے تھے اور دیوانی معاملات میں مقدمہ بازی کی گنجائش بہت کم رہ جاتی تھی-اس طرح بار کے علاقے سے جلالپور یا حافظ آباد کے قاضی کے پاس صرف وہی مقدمات جاتے تھے جن کو برادری کے بزرگ طے کرنے میں ناکام ہو جاتے-

☆☆☆

رنجیت سنگھ کا حملہ

سکھوں اور بھٹی قبیلہ کی کشمکش کا آغاز

مغلوں کی حکمرانی کے آخری دور میں سکھوں نے پنجاب میں طاقت پکڑنی شروع کر دی تھی۔ پنجاب کے والی ذکریا خاں کی وفات کے بعد پڑنے والی پہلی دیوالی (۱۴ اکتوبر ۱۷۴۵ء) کے موقع پر وہ امرتسر میں جمع ہوئے اور خود کو ۲۵ دستوں میں منقسم کیا۔ ہر دستے میں ایک سو افراد شامل کیے گئے تھے۔ ضلع گوجرانوالہ کے دو سکھ سردار بھی ان دستوں کے رہنما قرار پائے۔ ان میں نودھ سنگھ اور دوسرا چندا سنگھ تھا۔ یہ دونو سکر چک کے رہنے والے تھے۔ اس کے تقریباً تین سال بعد یعنی ۲۴ مارچ ۱۷۴۸ء کو بیساکھی کے موقع پر چھ سات ہزار سکھ دوبارہ امرتسر جمع ہوئے تو اس جنگجو برادری کو دل خالصہ کا نام دے کر منظم کیا گیا اور گیارہ نمایاں اہمیت کے حامل سرداروں کی سربراہی میں گیارہ بڑے جتھے بنائے گئے۔ ان گیارہ جتھوں میں سکر چکیہ جتھا گوجرانوالہ کے گاؤں سکر چک کے نودھ سنگھ کی سرداری میں تشکیل دیا گیا اور اس کو کارروائیوں کے لیے گوجرانوالہ اور ارد گرد کے اضلاع تفویض کیے گئے۔ ان جتھوں نے یہاں کے دیہاتوں اور قصبوں کو اپنی لوٹ مار کا خوب نشانہ بنایا۔ دن کو جنگلوں میں چھپے رہتے اور رات کے وقت مسلمانوں کے قصبات اور دیہات میں ٹوٹ پڑتے اور لوٹ مار کر کے چل دیتے۔

ان جتھوں کی کارروائیوں اور دیگر سیاسی حالات کی بناء پر یہاں کی حالت نہایت ابتر ہو چکی تھی۔ سکھوں نے اس دور میں ایک مربوط نظام کی بنیاد رکھی جسے انہوں نے راکھی کے نام سے تعبیر کیا۔ اس نظام کے تحت ساکنان سال میں دو بار مئی، اکتوبر (ہاڑی - ساونی) میں پیداوار کا ۱/۵ حصہ سکھوں کو ادا کرتے تھے اور اس کے جواب میں سکھ انہیں کامل تحفظ فراہم کرتے تھے۔ جانی و مالی تحفظ کی ضمانت دی جاتی۔ تھوڑے عرصے میں پانچ دوآبوں میں سے دو آبے سکھوں کے تحفظ میں آ گئے تھے۔ چڑھت سنگھ سکر چکیہ اور ہری سنگھ بھنگی جن کے پاس مضبوط ترین دستے تھے انہوں نے خود کو چج (چناب اور جہلم کا درمیانی علاقہ) اور رچنا دوآب (راوی اور چناب کا درمیانی علاقہ) میں مستحکم کیا۔ لیکن وزیر آباد کے چٹھوں اور پنڈی بھٹیاں اور جلالپور کے بھٹیوں نے سکھوں کے اس سسٹم کے تحت خود کو ان کی ماتحتی میں دینے سے صاف انکار کر دیا۔ بے شک بھٹی اس زمانے میں پنجاب میں کوئی اہم کردار ادا کرنے کے قابل نہیں تھے۔ بلکہ اس زمانے میں یہ خود جھنگ کے سیالوں

کے اطاعت گزار تھے۔ مگر جب سکھوں نے مسلمانوں کے خلاف سازشوں میں اضافہ کر دیا تو ان قبائل نے بھی اپنی طاقت بڑھانے کی طرف توجہ دینا شروع کر دی تھی۔

ان سنگین حالات میں پنجاب کے ناظم آدینہ بیگ نے سکھوں کو طاقت کے بل پر مطیع کرنے کے لیے پنجاب کے اہم سرداروں سے تعاون حاصل کیا تو وزیر آباد کے علاقے سے پیر محمد چٹھہ عزت بخش اور پنڈی بھٹیاں کے علاقے سے مراد تحسین بھٹی سکھوں کے خلاف آدینہ بیگ کے ساتھ شانہ بشانہ نکلے۔ لیکن آدینہ بیگ کی وفات کے ساتھ ہی سکھوں کے خلاف مشترکہ کارروائی ادھوری رہ گئی۔ ان حالات میں چٹھوں کے اس وقت کے سربراہ غلام محمد چٹھہ جو بڑے زیرک سیاستدان تھے، انہوں نے بھانپ لیا تھا کہ اگر سکھوں کو ابھی سے نہ کچلا گیا تو یہ قوم پورے پنجاب کے مسلمانوں پر قیامت برپا کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھے گی۔ اس لیے وہ چاہتے تھے کہ سکھوں کے مقابلے میں ضلع گوجرانوالہ کے تین بڑے قبائل تارڑ، بھٹی اور ہنجرا ان سے تعاون کریں لیکن ان کی یہ کوششیں بار آور نہ ہو سکیں اور ان قبائل میں کوئی اتحاد نہ ہو سکا۔ چنانچہ ان تینوں کو الگ الگ طور پر سکھوں سے لڑائی کے نتیجے میں زیر ہونا پڑا۔ (۱۹)

سکر چکیوں کی کارروائی:

بھٹیوں کی سکھوں کے ساتھ دشمنی کی چند وجوہات تھیں۔ ایک وجہ وہ واقعہ تھا جو موضع کوٹ حسن خاں میں رونما ہوا۔ اس وقت اس علاقے میں سکر چکیہ سکھ اپنا زور پکڑ چکے تھے اور انہوں نے گائے ذبح کرنے والے مسلمانوں کو سخت سے سخت سزائیں دینا شروع کر دی تھیں۔ ایک مرتبہ میاں حسن خاں بھٹی نے اپنے گاؤں میں گائے ذبح کر ڈالی تو اس کی اطلاع رنجیت سنگھ کے باپ مہان سنگھ تک پہنچ گئی۔ مہان سنگھ نے حسن خاں بھٹی کی گرفتاری کا حکم صادر کر دیا۔ حسن خاں نے میاں جان محمد (ایک روحانی بزرگ) جو اس وقت موضوع لویرے میں قیام پذیر تھے کے ہاں پناہ حاصل کر لی۔ مہان سنگھ نے اپنا ایلچی میاں صاحب کے پاس بھیجا اور حسن خاں کو ان کے حوالے کرنے کے لیے کہا۔ میاں صاحب نے حسن خاں کو سکھوں کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا۔ اس پر مہان سنگھ نے ایک فوجی دستہ لویرے بھیجا تاکہ حسن خاں اور میاں جان محمد کو گرفتار کر سکے۔ فوجی دستے نے سارے گاؤں کا محاصرہ کر لیا اور گاؤں کے لوگوں کو نقصان پہنچانے کے درپے ہوا۔ یہاں ان کی مڈبھیڑ میاں جان محمد اور حسن خاں بھٹی سے ہوئی۔ میاں جان محمد نے اپنی روحانی قوت سے سکھوں کے گھوڑوں کو تیروں سے چھلنی کر دیا۔ سکھ فوجی دستہ شکست کھا کر واپس مہان سنگھ کے پاس گیا اور سارا ماجرا سنایا۔ اس پر مہان سنگھ خود لویرے آیا اور اپنی غلطی کی معافی مانگ کر میاں جان

محمد کی روحانی قوت کے آگے سر تسلیم خم کر دیا۔اس کے باوجود مہان سنگھ نے دیگر مسلمانوں کے خلاف اپنی کارروائیاں جاری رکھیں۔(۲۰)

میاں خیر محمد نون کی شہادت :

اسی طرح کی ایک کارروائی سکر چکیوں نے ۱۷۶۵ء میں دریائے چناب کے پار موضع ہلال پور (جو اب تحصیل بھلوال میں واقع ہے) میں مسلمان نون قبیلہ کے خلاف کی۔کہا جاتا ہے کہ اس گاؤں کے کسی شخص نے ایک سکھ عورت سے بد تمیزی کی تو سکھوں نے مہان سنگھ کے ہاں یہ دہائی دی کہ ان کی عورت کی عزت لوٹی گئی ہے۔مہان سنگھ اس پر موضع ہلال پور پر چڑھ دوڑا جو اس وقت ایک نیک دل بزرگ شخصیت میاں خیر محمد نون کا مسکن تھا۔مہان سنگھ کے دستوں نے کئی روز تک ہلال پور کا محاصرہ کئے رکھا بالآخر گاؤں پر قبضہ کر کے میاں خیر محمد صاحب نون کو گرفتار کر کے لاہور لے گیا۔ جہاں اس وقت تین سکھ سرداروں کی حکومت تھی۔لاہور لے جا کر میاں خیر محمد نون کو پھانسی پر لٹکا کر شہید کر دیا گیا۔میاں خیر محمد نون پنڈی بھٹیاں کے بھٹیوں کے مرشد تھے۔ چنانچہ ان کی شہادت پر ان کو بڑا صدمہ پہنچا۔اس وقت میاں یار محمد بھٹی خود لاہور گیا اور میاں خیر محمد صاحب نون کا جسد خاکی لا کر پنڈی بھٹیاں میں دفن کیا۔(۲۱) سکھوں کے ہاتھوں بھٹیوں کے مرشد میاں خیر محمد نون صاحب کی شہادت ایک ایسا واقعہ تھا کہ جس نے بھٹیوں کی سکھوں کے خلاف دشمنی کو مزید جلا بخشی تھی۔

اس عرصے کے دوران بھٹیوں اور تارڑوں کے پڑوسی چٹھہ قبیلہ کے خلاف سکھوں کی یورشوں کا آغاز ہو چکا تھا۔بالآخر ۱۷۹۰ء میں مہان سنگھ نے مانچہر چٹھہ پر حملہ کر کے چٹھوں کی طاقت کو کمزور کر دیا اور چٹھوں کے سردار غلام محمد کو اس حملہ میں مار دیا تھا۔اس کے دو سال بعد مہان سنگھ نے ایک اور چٹھہ سردار جان بخش کے گاؤں گاجر گولہ پر حملہ کر دیا اور جان بخش کو موت کے گھاٹ اتار کر بہت سی دولت لوٹ کر لے گیا۔ جان بخش کے خاندان نے بھاگ کر جان بچائی اور پنڈی بھٹیاں آکر بھٹیوں کے ہاں پناہ لی جو پہلے ہی سکھوں کے دشمن تھے۔بعد میں رنجیت سنگھ اپنے باپ کا جانشین ہوا تو جان بخش کا لڑکا خدا بخش اور اس کے لڑکے رنجیت سنگھ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کو ۱۲۰۰ کی مالیت کی جاگیر عطا کی گئی اور گھڑ چڑھوں میں ملازم رکھ لئے گئے۔(۲۳)

رنجیت سنگھ کا جد امجد بھٹی راجپوت :

سکھ حکمران رنجیت سنگھ کی بھٹیوں اور تارڑوں کے خلاف لڑائیوں کا ذکر کرنے سے قبل ایک

مصنف کی رائے کا ذکر کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ سکھ حکمران مہاراجہ رنجیت سنگھ کا تعلق بھٹی راجپوت خاندان سے تھا اور اس کے جد امجد کا تعلق پنڈی بھٹیاں سے تھا۔ سکھ مصنف دھیر سنگھ بیدی لکھتا ہے کہ "پنجاب کی روایات کے مطابق راجستھان کے علاقہ جیسلمیر میں ایک شخص کالو بھٹی رہتا تھا۔ اس نے لگ بھگ ۱۴۵۰ء عیسوی میں راجستھان کو چھوڑا اور پنجاب آکر پنڈی بھٹیاں میں آباد ہو گیا۔ یہاں پہلے ہی بھٹی قبیلہ کے لوگ آباد تھے جو جیسلمیر وغیرہ علاقوں سے آئے تھے۔

کالو کا پڑپوتا جس کا نام کدو تھا۔ وہ ۱۵۵۵ء میں پنڈی بھٹیاں چھوڑ کر گوجرانوالہ کے ایک گاؤں شکر چک میں آباد ہو گیا تھا۔ یہ گاؤں بہت بڑا نہیں تھا۔ یہاں کدو نے کافی زمین اپنے قبضہ میں لے لی اور ایک کنواں بھی کھدوایا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب زیادہ زمین بارانی ہوتی تھی۔ چاہی زمین بہت کم تھی۔ جن لوگوں کے پاس چاہی زمین ہوتی تھی ان کا علاقہ میں کافی احترام کیا جاتا تھا۔ یہ گوروار جن دیو جی کا زمانہ تھا۔ گجرات ضلع کے گاؤں مانگٹ میں ایک سکھ سنت بھائی ہوجی راجپوت خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور راجستھان سے آکر یہاں پنجاب میں آباد ہوئے تھے۔ ایک خیال ہے کہ ان کے بزرگ بھی جیسلمیر سے آئے تھے۔ اس طرح ان دونوں خاندانوں کا خون کا رشتہ تھا۔ بھائی ہوجی کے مشورہ اور پرچار کے زیر اثر ہی کدو نے سکھ مذہب اختیار کیا اور گوروار جن جی کے درشن کرنے کے لیے باقاعدہ جانے لگا۔ کدو اور اس کے بیٹے رازادہ نے بیک وقت سکھ دھرم اختیار کیا تھا۔ رازادہ کا پوتا باوہ ایک محنت کش کسان تھا۔ اس کا لڑکا دیسیہ تھا جسے راجپوت جاٹ کہا جانے لگا تھا۔ دیسیہ کے بیٹے نودھ سنگھ کا انتقال ۱۷۶۰ء میں ہوا تھا۔ نودھ سنگھ کا بیٹا چڑھت سنگھ تھا چڑھت سنگھ کے دو لڑکے اور ایک لڑکی تھی۔ بڑا لڑکا مہان سنگھ تھا جس کی شادی جنید کے مہاراجہ بھاگ سنگھ کی بہن کے ساتھ ہوئی تھی۔ دوسرا لڑکا سہید سنگھ تھا جس کی موت ۱۷۷۲ء میں ہو گئی تھی۔ سردار مہان سنگھ کا لڑکا مہاراجہ رنجیت سنگھ تھا جو ۲ نومبر ۱۷۸۰ء کو پیدا ہوا تھا۔ (۲۳)

رنجیت سنگھ کا پنڈی بھٹیاں اور جلالپور پر حملہ :

اسی رنجیت سنگھ نے ۱۷۹۷ء میں رام نگر (رسول نگر) پر قبضہ کر لیا تھا۔ اس کے بعد وہ لاہور کی طرف چلا گیا اور ۱۷۹۹ء میں اس پر قبضہ کر لیا۔ اس دوران احمد شاہ ابدالی کے پوتے زمان شاہ کی طرف سے رنجیت سنگھ کو دارالحکومت کا گورنر مقرر کر دیا گیا۔ لاہور پر قبضہ کرنے کے بعد اس نے اپنی سلطنت کو وسعت دینے کے لیے پنجاب کے ان قبائل کی طرف توجہ دینا شروع کی جن کی طاقت کو اس نے ابھی تک زیر نہیں کیا تھا۔ اس مقصد کے لیے وہ ۱۸۰۲ء میں چھنوں، تارڑوں اور بھٹی مسلمان قبائل کو مطیع بنانے کے لیے خود نکل کھڑا ہوا۔ سب سے پہلے چھنوں اور تارڑوں کو زیر

کرنے اور ان قبائل پر فتح پانے کے بعد اپنی فوج کے ہمراہ بھٹیوں کی عملداری کے علاقے جلالپور اور پنڈی بھٹیاں پر حملہ آور ہوا۔ جلالپور اس زمانے میں چاروں طرف سے مضبوط قلعہ نما دیواروں سے گھرا ہوا تھا۔ شہر کے اندر داخلے کے لیے صرف دو دروازے تھے۔اہل قصبہ نے رنجیت سنگھ کا خوب مقابلہ کیا مگر بالآخر وہ سکھوں کے مقابلے میں مغلوب ہوئے۔ سکھوں نے قصبہ کو خوب لوٹا اور مالکوں سے ان کی ملکیت چھین لی۔ جلالپور، بھٹی چک، جلالپور کہنہ پر قبضہ کرنے کے بعد رنجیت سنگھ فوجیں لے کر پنڈی بھٹیاں پر چڑھ دوڑا۔(۲۴)

اگرچہ پنڈی بھٹیاں کے علاقے پر بھٹی قبیلہ کی عملداری تھی مگر بعض دوسری قومیں بھی اثر و رسوخ کی مالک تھیں۔ چنانچہ ان تمام موثر قوموں کے مشترکہ مسلح دستے علاقے کے دفاع کے لیے مامور کئے گئے۔ان دستوں کی کمان بلاشبہ بھٹیوں کے پاس تھی۔رنجیت سنگھ اپنی فوجیں لے کر پنڈی بھٹیاں کے باہر شمال کی جانب چاہ قلعہ پر آٹھہرا اور کئی روز تک اس نے قصبہ کا محاصرہ کئے رکھا۔اس وقت قصبہ چاروں طرف سے ایک بلند فصیل کے اندر گھرا ہوا تھا اور اندر داخل ہونے کے لیے چاروں اطراف بڑے بڑے دروازے لگے ہوئے تھے۔قصبہ کی آبادی رنجیت سنگھ کے محاصرے اور توپوں کے خوف کی وجہ سے فصیل کے اندر محصور ہو کر رہ گئی تھی۔ پھر بھی روزانہ دونوں اطراف سے جھڑپیں ہوتی رہیں اور دونوں جانب جانوں کا نقصان ہوتا رہا۔ابتداً بھٹیوں کے بارہ آدمی مارے گئے تھے۔ مگر رنجیت سنگھ کے حوصلے بلند تھے کیونکہ وہ علاقے کی دیگر اہم قوموں کو پہلے ہی شکست سے دوچار کر چکا تھا اور وسطی پنجاب کے اس اہم معرکے کو بھی سر کرنا چاہتا تھا۔ کیونکہ اس فتح کے بعد اس کے لیے آگے بڑھنے کے سارے راستے کھل جاتے تھے۔یوں پورے پنجاب پر اس کی حکومت کا خواب پورا ہو جاتا۔ چنانچہ رنجیت سنگھ پنڈی بھٹیاں پر فیصلہ کن حملے کی پوری تیاری کر چکا تھا۔

ادھر بھٹی اور دیگر اقوام کے سرکردہ افراد جو اپنے دفاع کے لیے شہر کے اندر محصور ہو چکے تھے وہ بھی اپنے دفاع سے غافل نہیں تھے۔ پہلے تو انہوں نے دوبدو لڑائی کا فیصلہ کیا مگر کچھ لوگوں نے مشورہ دیا کہ رنجیت سنگھ کی فوج ان کی طاقت سے کہیں زیادہ ہے لہذا دوبدو جنگ سے ان کا زیادہ نقصان ہو سکتا ہے چنانچہ ایک نئی حکمت عملی وضع کرنے کے لیے صلاح مشورہ ہوا اور فیصلہ کیا گیا کہ کسی طریقے سے چھاپہ مار کارروائی کر کے راجہ رنجیت سنگھ کو قتل کر دیا جائے۔اس طرح باقی سکھ فوج میں بد دلی پھیل جائے گی۔اس کام کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے دلے کی بار کی پانچ قوموں (بھٹی، ریحان، گورایہ، ممبرا اور جوگی) کے ایک ایک فرد کا انتخاب کیا گیا۔ جوگی جس کا نام شیرا ناتھ تھا اس کے ذمہ یہ کام سونپا گیا کہ وہ فقیر کے روپ میں سکھوں کے فوجی پڑاؤ میں جا کر اس بات کا کھوج لگائے کہ راجہ رنجیت سنگھ کس خیمے میں مقیم ہے جبکہ باقی چار افراد بھیس بدل کر چھاپہ مار

پنڈی بھٹیاں میں کھدائی کے دوران نکلنے والی مورتی۔

پنڈی بھٹیاں میں کھدائی کے دوران نکلنے والے سکے۔

کارروائی کے لیے وہاں تک پہنچیں گے-اس طرح شدہ حکمت عملی کے تحت جب جوگی شیر اناتھ سکھوں کے خیمے میں فقیر کا روپ دھار کر پہنچا تو یہ دیکھ کر حیران و ششدر رہ گیا کہ بھٹی قبیلے کا ایک سرکردہ فرد محمد خان بھٹی جو اس سارے منصوبے کی تیاری میں شریک تھا راجہ رنجیت سنگھ کے کمانڈروں کے ساتھ شطرنج کھیلنے میں مصروف ہے-دراصل محمد خان بھٹی اپنے قبیلے سے غداری کر کے سکھوں کے ساتھ مل چکا تھا-اس نے سکھوں کو اس شرط پر شہر کے اندر داخل کروانے کی حامی بھر لی تھی کہ قبضہ کے بعد وہ اس کو علاقے کا سردار مقرر کر دیں گے-جوگی شیر اناتھ نے جب یہ سارا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا تو فوراً واپس پلٹ کر بھٹی سردار جلال خاں کو اطلاع دی-اس صورتحال میں اندرونی بغاوت کا خطرہ پیدا ہو چکا تھا- چنانچہ اسی رات اندھیرے میں کسی بڑی قتل و غارت گری سے بچنے کے لیے بھٹی سردار جلال خان کنبہ سمیت شہر سے فرار ہو گیا- کچھ افراد نے چیلیانوالہ میں راجہ رتو سنگھ چوہڑ کے پاس پناہ لی جس کے ساتھ ان کے قدیمی تعلقات تھے-اکثر سیالوں کے زیر اثر علاقے گورنے پٹھاناں (ضلع جھنگ) چلے گئے جہاں سیالوں نے انھیں پناہ دی- اگلی صبح جب رنجیت سنگھ کے دستوں نے دیکھا کہ شہر میں کوئی فوجی سرگرمی دکھائی نہیں دے رہی اور شہر کے دروازے کھلے پڑے ہیں تو وہ خاموشی سے شہر کے اندر داخل ہو گئے-خوب لوٹ مار کی اور اس پر قبضہ کر لیا- تمام مقامی لوگوں سے جو بھی ہتھیار تھے وہ چھین لیے گئے-جب شہر پر رنجیت سنگھ قبضہ کر چکا تو بھٹی قبیلے کے غدار محمد خان بھٹی نے رنجیت سنگھ سے علاقے کا سردار مقرر کرنے کا کہا-اس پر رنجیت سنگھ نے ٹکا سا جواب دیا اور کہا کہ وہ سورمے اور غیور تھے، تم مکار چاپلوس اور غدار ہو-جو شخص اپنی قوم کا وفادار نہ ہو سکا وہ کسی غیر قوم یا مذہب کا وفادار کیسے ہو سکتا ہے-لہذا تمہیں جلاوطن کیا جاتا ہے- چنانچہ غدار محمد خاں بھٹی کو جلاوطن ہو کر شاہ جیونہ (ضلع جھنگ) میں جا کر پناہ لینا پڑی-(۲۵)

اسی دوران جب بھٹی قبیلہ کے افراد رات کے اندھیرے میں شہر سے نکل کر تیزی سے فرار ہوئے تو اس جلدی میں اپنی ایک بزرگ عورت پیچھے چھوڑ گئے-رنجیت سنگھ جب شہر میں داخل ہوا تو اسے اس بوڑھی عورت کے بارے میں علم ہوا کہ وہ بھٹی خاندان کی ہے تو اس نے اس پر پہرہ بٹھا دیا کیونکہ اس کا خیال تھا کہ بھٹی راجپوت اپنی عزت کی وجہ سے قبیلہ کی عورت کو لینے کے لیے ضرور ادھر کا رخ کریں گے-لیکن اس دوران شہر کے ایک جوانمرد شیخ کرم الٰہی ودہان نے سکھ پہرے داروں کو ورغلا کر کسی طرح بوڑھی عورت کو راتوں رات گھوڑے پر بٹھا کر گورنے پٹھاناں پہنچا دیا جہاں بھٹی پناہ لیے ہوئے تھے- صبح کی پو پھوٹنے سے پہلے ہی کرم الٰہی واپس شہر پہنچ چکا تھا اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی- چند روز بعد سکھوں کی قدرے نرمی کے باعث حالات سنبھلے تو لوگوں کو شیخ

کرم الٰہی کی اس بہادری کا علم ہو گیا۔اس پر بھٹیوں کی عدم موجودگی میں کچھ عرصے کے لیے قصبہ کے رہائشیوں نے کرم الٰہی کو اپنا سربراہ مقرر کر دیا۔(۲۶)

سکھوں کا مقامی نظم ونسق :

علاقے پر قبضہ کے فوراً بعد ہی سکھوں نے مسلمانوں کے مذہبی مقامات کو شدید نقصان پہنچانا شروع کر دیا۔ شاہی مسجد، مدینہ مسجد اور متوالا مسجد کو اصطبل میں تبدیل کر دیا گیا۔ جامع مسجد کے وسیع احاطہ پر دکانیں بنادی گئیں۔ جلالپور بھٹیاں اور پنڈی بھٹیاں کو سکھ شاہی سلطنت (خالصہ) کا حصہ بنادیا گیا اور پورے علاقے کو ایسے افراد کو کنٹریکٹ پر دے دیا جو راجہ رنجیت سنگھ کو معین رقم یا غلہ فراہم کرتے۔یہ کاردار کہلاتے۔عام طور پر یہ کنٹریکٹ ایسے سکھ خاندانوں کو دیئے گئے جنہوں نے مہاراجہ کا مکمل ساتھ دیا تھا۔

پنڈی بھٹیاں اور جلالپور دیوان ساون مل کے سپرد کر دیئے گئے۔ جبکہ بھٹی چک اور تارڑوں کے دو علاقوں رام پور (رسولپور تارڑ) اور ونیکے کو راجہ گلاب سنگھ کے حوالے کیا گیا۔ کولو تارڑ کی جاگیر رتن سنگھ اور حافظ آباد رلیارام کے حوالے کر دیئے گئے۔ان تمام کو یہ ذمہ داری سونپی گئی کہ وہ ان علاقوں کے زمینداروں اور کاشتکاروں سے مالیہ وصول کریں۔مالیہ کی وصولی کے علاوہ نذر کے نام سے آبپاشی کے ہر کنویں پر ایک روپیہ فرش خانہ کے نام سے ہر گاؤں سے ایک روپیہ اور توپ خانہ کے نام سے ہر گاؤں سے ایک سے دو روپیہ تک ٹیکس وصول کیا جانے لگا۔ علاوہ ازیں لوہار، جولاہوں، چھپہ گروں وغیرہ پر فی مکان ایک روپیہ، کم تر پیشوں کے گھروں پر آٹھ آنے جبکہ تاجروں پر ایک سے دو روپیہ فی کس کے حساب سے ٹیکس لگا دیا گیا۔ دریاؤں کے بیلوں اور چراہ گاہوں پر بھی ٹیکس عائد کر دیا گیا۔(۲۷)

بار کے وہ علاقے جو دیوان ساون مل کی دسترس میں تھے وہاں کاشتکار اور زمیندار سکھوں کے مجموعی ظلم و ستم کا نسبتاً کم شکار ہوئے۔اس نے کھرلوں اور ہنکیں کے بھٹیوں کو آسان شرائط پر زمینیں دیں تاکہ زراعت میں ترقی ہو۔چنانچہ اس دور میں کھرلوں اور ہنکیں کے بھٹیوں نے کئی نئے دیہات آباد کئے اور آبپاشی کے لیے کنویں کھودے۔اس کے برعکس جو علاقے گلاب سنگھ کو سونپے گئے تھے وہاں کے کاشتکار اس کے بدنیت ایجنٹ وزیر رتنو کے عتاب کی وجہ سے مسلسل پریشان تھے۔ وہ اپنی طاقت کے بل پر ان کا ہمیشہ خون نچوڑتا رہا۔ کچھ سالوں بعد یعنی ۱۸۱۱ء میں رنجیت سنگھ نے جھنگ کے سیالوں کو شکست دے کر اس پر قبضہ کر لیا تو پنڈی بھٹیاں قصبہ کو جھنگ میں شامل کر کے صوبہ ملتان کی ماتحتی میں دے دیا گیا اور پورے صوبے میں ریونیو جمع کرنے کے لیے مختلف افراد کو

کنٹریکٹ دیا جاتا رہا۔ سکھوں نے بار کے علاقے میں جانوروں کے لیے کھلی چراہ گاہوں کا بندوبست بھی کیا۔ ہر جانور پر ٹیکس وصول کیا جاتا جسے ترینی کہا جاتا اور اس کی وصولی کے بھی ٹھیکے ہوتے تھے۔ (۲۸) جن افراد کے پاس یہ ٹھیکے رہے ان کی فہرست درج ذیل ہے۔

سال	ٹھیکیدار	ٹھیکے کی رقم
۱۸۱۶ء	سجن رائے	۳۷۵۰۰۰
۱۸۱۷ء	سکھ دیال	۴۰۰۰۰۰
۱۸۱۸-۱۹ء	جوالا سنگھ	۴۰۰۰۰۰
۱۸۲۰ء	سکھ دیال	۴۱۰۰۰۰
۱۸۲۱ء	صاحب دتہ، شام سنگھ	۴۰۰۰۰۰
۱۸۲۲ء	شام سنگھ، جوالا داس، للا رام	۴۲۰۰۰۰
۱۸۲۳ء	جسہ سنگھ، دولت رام، شام سنگھ	۳۲۵۰۰۰
۱۸۲۴ء	باقر، جلا بھروانہ	۴۴۰۰۰۰
۱۸۲۵ء	شام سنگھ، عبدالرحمٰن	۴۳۵۰۰۰
۱۸۲۶ء	افضل خاں، جواہیر سنگھ	۴۴۰۰۰۰
۱۸۲۷ء	جوند سنگھ	۳۴۰۰۰۰
۱۸۲۸ء	عطر سنگھ، بھولا ناتھ	۴۴۵۰۰۰
۱۸۲۹ء	دل سنگھ، دیوی بخش	۴۵۵۰۰۰
۱۸۳۰ء	دل سنگھ	۴۵۶۰۰۰
۱۸۳۱ء	رام کور آف جھنگ	۴۶۷۰۰۰
۱۸۳۲-۴۴ء	دیوان ساون مل	۴۳۵۰۰۰
۱۸۴۵-۴۷ء	دیوان ملراج	۴۳۵۰۰۰
۱۸۴۷-۴۸ء	رلیا رام	۵۰۰۰۰۰ (۲۹)

☆☆☆

بکسیں بھٹیوں کی مسن واہگہ کے ساتھ لڑائی

سکھوں کے دلے کی بار کے مرکزی مقام پنڈی بھٹیاں پر قبضہ کر لینے کے بعد یہاں کے بھٹی تیس چالیس سال تک دربدر رہے۔ لیکن اس عرصے کے دوران بکسیں کے بھٹیوں نے اپنی خوشحالی اور طاقت میں خوب اضافہ کر لیا اور علاقے میں اثر و رسوخ حاصل کرتے گئے۔ ان کے شمال مشرق میں ورکوں کی عملداری تھی جو جاٹ ہندو تھے اور جنوب کی طرف مقامی طور پر کھرلوں کی عملداری تھی۔ ان دونوں قبائل کے ساتھ بھٹیوں کی ایک دوسرے پر غلبے اور حدود میں اضافے کی غرض سے مخالفت رہی اور یہ ایک دوسرے کے خلاف نبرد آزما رہے۔ اٹھارہویں صدی کے آخر میں کھرلوں، ورکوں اور بھٹیوں کے مابین صلح کا ایک معاہدہ بھی ہوا جس کی رو سے تینوں قبائل نے اپنی اپنی عملداری کی حدود کا باقاعدہ تعین کر لیا تھا۔ یہ معاہدہ شاہ کوٹ کے مقام پر ہوا اور اس مقام کو تینوں قبائل کی حد بندی قرار دیا گیا۔ حدود کی نشاندہی اور معاہدے کی علامت کے طور پر شاہ کوٹ میں تین کنویں بھی کھودے گئے۔ لیکن اس صلح کے باوجود یہ تینوں قبائل ایک دوسرے کے خلاف لڑنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے۔

چنانچہ جب سکھوں کے دور میں کھرلوں کی عملداری کے علاقے میں دو خانہ بدوش واہگہ اور وسیر قبائل کھرلوں کی زیر نگرانی جانور چرانے کا کام کرتے تھے اور اس کے عوض کھرلوں کو چراہ گاہ ٹیکس ادا کرتے تھے۔ سکھوں نے پنجاب کی حکومت سنبھالی تو انہوں نے کھرلوں سے اس ٹیکس میں حصے کے طور پر بھاری رقم کا مطالبہ کیا۔ جسے پورا کرنے کے لیے کھرلوں نے واہگہ اور وسیر قبائل پر بوجھ ڈال دیا۔ یہ قبائل اتنے بھاری ٹیکس ادا کرنے کے قابل نہ تھے۔ چنانچہ انہوں نے اضافی بوجھ کی ادائیگی سے انکار کر دیا۔ کھرلوں نے ان کے خلاف کارروائی کی جس کے نتیجے میں واہگوں اور وسیروں نے ان کا علاقہ چھوڑ کر ورکوں کے علاقے (ضلع شیخوپورہ) میں آکر پناہ لے لی۔ یہاں ورکوں نے بھی ان کی کوئی مزاحمت نہ کی۔ اتفاق سے ورکوں کے آخری سردار امیر سنگھ آف بھکی کا انتقال انہیں دنوں ہوا تھا اور اس وجہ سے ورک مخالف قبائل کے مقابلے میں عدم استحکام کا شکار تھے۔ ان حالات سے واہگوں نے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور اپنی مخصوص خصوصیات کی بدولت جلد ہی علاقے پر اپنا اثر و رسوخ قائم کر لیا۔ اب واہگوں کے سردار مسن جو بڑا بہادر اور نڈر مشہور تھا، نے پڑوسی بھٹی قبیلہ کی طرف بھی میلی نظر دیکھنی شروع کر دی۔ چنانچہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ کئی مرتبہ ان کے علاقے

میں داخل ہو کر ان کے جانور اٹھا کر لے گیا-ان کامیاب کارروائیوں کے نتیجے میں اس کے حوصلے بڑھ گئے تھے- چنانچہ اس نے بالا آخر ایک بڑے حملے کے لیے کوٹ نکی والا کی طرف مارچ کیا- دوسری طرف ہنکسیں کے بھٹیوں کو اس کی اطلاع ہو چکی تھی وہ پہلے ہی ان کارروائیوں سے پریشان تھے-(۳۰) کیونکہ ان کی قوت سکھوں سے شکست کے نتیجے میں پہلے ہی کمزور ہو چکی تھی-ان میں سے کوئی ایسا شخص موجود نہیں تھا جو مسن جیسے طاقتور شخص کا مقابلہ کرنے کی جرات کرتا-بہر حال جب انہیں مسن واہگہ کی بڑی کارروائی کی اطلاع ملی تو انہوں نے بزرگوں کی ایک فوری پنچائیت بلائی جس میں بھٹیوں کے علاوہ برہیم کے (دوہٹہ والے) بہادر کے (کوٹ سرور) وینے ،مانیکے اور دیگر قوموں کے افراد بھی جمع ہوئے- ہنکسیں کے بھٹی قبیلہ کے اس وقت کے سربراہ مسو بھٹی نے پنچائیت میں نوجوانوں سے مخاطب کر کے خود کو اس مقصد کے لیے رضاکارانہ طور پر پیش کرنے کا کہا-اس وقت ہنکسیں کے بھٹی قبیلہ میں سب سے کڑیل نوجوان، مضبوط اور بہادر بلند نامی تھا- پنچائیت نے اس کام کی غرض سے اس کا نام نامزد کیا اور مسن کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک دستہ اس کے ساتھ مقرر کر دیا-جب پنچائیت نے مسن واہگہ کا مقابلہ کرنے کے لیے بلند کا نام چنا تو وہ کھڑا ہو گیا اور درخواست کرنے لگا کہ وہ واہگہ کا مقابلہ کرنے سے گھبراتا نہیں ہے لیکن ایک مرتبہ سفر کے دوران وہ اور مسن واہگہ اکٹھے مہمان تھے اور انہوں نے وہاں اکٹھے کھانا کھایا تھا اور ہماری یہ روایت نہیں کہ کوئی ایک ساتھ کھانا اکٹھے کھالے تو تب اس پر وار کیا جائے-لہذا وہ واہگہ کو خود نہیں مارے گا-البتہ وہ یہ ضرور کر سکتا ہے کہ جب واہگہ یہاں آئے تو میں اس کے گھوڑے پر وار کر کے اس کو زمین پر نیچے گرا دوں-باقی کام قبیلے کے دیگر لوگ کریں گے-اس حکمت عملی پر پنچائیت کا اتفاق ہو گیا- چنانچہ کچھ ہی دنوں بعد مسن کی سرکردگی میں واہگوں کے گھڑ سوار لوٹ مار کی غرض سے بھٹیوں کے علاقے میں داخل ہو گئے- منڈل کے مقام پر دونوں کا آمنا سامنا ہو گیا اور خوب لڑائی ہوئی- بالا آخر بلند بھٹی نے تیز دھار تلوار کے ساتھ مسن کے گھوڑے کی ٹانگ پر وار کر کے مسن کو نیچے گرا دیا-باقی نوجوانوں نے اکٹھے ہو کر مسن کو ڈھیر کر دیا-اس طرح ۱۸۲۵ء میں مسن کی ہلاکت کے ساتھ ہی واہگوں کی قوت ختم ہو کر رہ گئی-

مار مسن پچھوں تانے   جن منڈل اتے لاہ کے

اس شکست کے بعد واہگہ کا لڑکا ملا واہگہ (جو انگریزی حکومت کے ابتدائی دور میں کڑکن کا ذیلدار بھی رہا) جھمرہ کے کھرل سردار احمد خاں کی طرف چلا گیا اور اس سے مدد طلب کی-احمد خاں پہلے ہی بھٹیوں کے خلاف کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا تھا- چنانچہ اس نے اپنے آدمیوں کو اکٹھا کیا اور ملا مسن کے ساتھ بھٹیوں کے خلاف لڑائی کی غرض سے چڑھ دوڑا-ان دونوں قبیلوں کی

دریائے چناب کے کنارے نزد ہرسہ شیخ مد بھیڑ ہوئی لیکن بھٹیوں کے مقابلے میں انہیں زبردست شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ اس شکست کے نتیجے میں واہگوں کو بار میں اپنے علاقوں سے بھی ہاتھ دھونا پڑا۔ انگریزوں کے حکومت سنبھالنے تک اس علاقے پر بھی بھٹی قبیلہ قابض رہا۔ بعد ازاں انگریزوں نے بار کے ان علاقوں کو مختلف حصوں میں تقسیم کر کے مختلف قبیلوں کو ٹھیکوں پر دے دیا۔ شمالی علاقے کا کچھ رقبہ سکھیکی کے ہنکسیں بھٹی خاندان کے ذیلدار سارنگ کے دادا مسو بھٹی کو دے دیا۔ جہاں اس سے پہلے مڑھ بلوچاں کا ایک اونٹ چرانے والا قبیلہ قابض تھا۔ واہگوں اور ویروں کے کچھ علاقے واگزار کر کے کڑکن کے حقوق ملکیت انہیں سونپ دیے اور مسن کے بیٹے ملا واہگہ کو ذیلدار بھی مقرر کر دیا۔ (۳۲) اس طرح بھٹیوں کی حدود ملکیت اور اثر رسوخ میں بھی کمی ہو تی گئی۔

☆☆☆

دیوان ساون مل

دیوان مولراج

انگریزی دور

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ پنڈی بھٹیاں کے بھٹی سکھوں کے قبضے کے بعد تیس چالیس سال تک دربدر رہے اس دوران وہ ۱۸۳۹ء میں راجہ رنجیت سنگھ کی وفات تک سیالوں کے علاقے ضلع جھنگ میں پناہ گزین رہے۔ جب سیال قبیلہ کے سربراہ احمد خاں سیال کے ساتھ سکھوں نے نرمی اور ہمدردی کا سلوک کیا تو اس وساطت سے بھٹیوں کے سردار جلال خاں بھٹی کو بھی رنجیت سنگھ کی ہمدردی حاصل کرنے کا موقع مل گیا۔ چنانچہ رنجیت سنگھ نے اسے وقتی طور پر اپنی ملازمت میں شامل کر لیا۔ بعد ازاں جلال خاں کا بھائی مستی خاں اور اس کا بیٹا رحمت خاں بھٹی بھی مہاراجہ کی نوکری میں آ گئے۔ مگر بھٹی اس کے باوجود جلالپور اور پنڈی بھٹیاں میں اپنے مقبوضات بحال کرانے میں ناکام رہے۔

بالآخر ۱۸۳۹ء میں راجہ رنجیت سنگھ کی وفات ہوئی اور سکھ فوج بھی قابو سے نکلنے کے بعد آپے سے باہر ہو گئی۔ پھر انقلاب شروع ہوئے اور ہر طرف طوائف الملوکی پھیل گئی۔ نومبر ۱۸۴۵ء میں سکھوں کی فوج نے جو تقریباً ایک ہزار سپاہیوں پر مشتمل تھی دریائے ستلج عبور کر کے انگریزوں کی عملداری پر دھاوا بول دیا۔ اس معرکے میں سکھوں کو شکست ہوئی۔ بعد میں انگریزوں کے سکھوں کے ساتھ دو اور معرکے ہوئے جن کے نتیجے میں سکھ سلطنت کو کئی حصوں میں بانٹ دیا گیا۔ صوبہ ملتان پر سکھ گورنر ملراج کو بحال رکھا گیا۔ البتہ پورے پنجاب پر ایک انگریز ریذیڈنٹ کا تقرر عمل میں لے آیا گیا۔ اس نظام کے کچھ عرصے بعد گورنر ملتان ملراج نے انگریزوں کے خلاف بغاوت کر دی۔ لیفٹیننٹ ایڈورڈ نے اپنے چار سو کے دستے کے ساتھ اس کا مقابلہ ملتان میں کیا مگر شکست کھائی۔ اس صورتحال میں مسلمان قبائل جو رنجیت سنگھ کے ہاتھ اپنے علاقے اور اقتدار گنوا بیٹھے تھے اپنا بدلہ چکانے اور علاقے واپس لینے کے لیے بڑے بے چین تھے۔ چنانچہ جب لارڈ گوف اپنا لشکر لے کر بڑھا اور دریائے چناب کے کنارے رام نگر (رسول نگر) کے مقام پر سکھ فوج کے ساتھ معرکہ آرا ہوا تو پنڈی بھٹیاں اور جلالپور کے بھٹی اور رسولپور کولو تاڑ کے علاقوں کے تارڑ اس کے شانہ بشانہ تھے۔ ان قبائل نے انگریزی فوجوں کا مکمل ساتھ دیا۔ انہوں نے انگریزوں کو سکھوں کی نقل و حرکت کے متعلق معلومات فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے مسلح دستے بھی فراہم کئے۔ اگلا معرکہ انگریزوں کا سکھوں کے ساتھ چیلیانوالہ (گجرات) میں ہوا۔ اس میں انگریزوں کا سخت

جانی نقصان ہوا تھا- اس معرکے میں بھی بھٹیوں اور تارڑوں نے انگریزوں کی پوری پوری مدد کی- اس کے بعد سکھوں کے خلاف آخری اور فیصلہ کن لڑائی میں بھی بھٹیوں نے انگریزوں کا پورا پورا ساتھ دیا-

گورو مہاراج سنگھ کی گرفتاری اور بھٹیوں کی عملداری کی بحالی :

ان معرکوں کے دوران ایک مذہبی سکھ سردار گورو مہاراج سنگھ انگریزوں کے لیے دردسر بنا ہوا تھا- وہ بھیس بدل کر سکھ باغیوں کو انگریزوں کے خلاف اکساتا تھا- اس غرض سے وہ ایک گداگر کے بھیس میں جنڈیالہ شیر خاں (ضلع شیخوپورہ) پہنچا- یہاں کے پٹھانوں نے اس کی اطلاع فوری طور پر انگریز حکام کو پہنچادی- چنانچہ انگریز سپاہیوں کا ایک تیز رفتار دستہ وزیر آباد سے اس کی سرکوبی کے لیے بھیجا گیا- اس کی خبر گورو مہاراج سنگھ کو ہو گئی اور وہ وہاں سے نکل کر چوہڑکانہ (اب فاروق آباد) کی طرف چلا گیا- انگریزی سپاہیوں نے اس کا پیچھا کرتے ہوئے سکھوں کے دو دیہاتوں چوہڑکانہ اور کریال جھبر کا محاصر کر لیا اور خفیہ طریقے سے اندر داخل ہو کر آگ لگادی- مہاراج سنگھ چالاکی کے ساتھ وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا اور جھنگ کی طرف بھاگ گیا- وہاں پہلے ہی پنڈی بھٹیاں کے بھٹی قبیلہ کے لوگ موجود تھے جنھوں نے رنجیت سنگھ سے شکست کے بعد جھنگ کے سیالوں کے ہاں پناہ لی ہوئی تھی- مہاراج سنگھ ان بھٹیوں کے ہاتھ لگ گیا- انہوں نے پکڑ کر انگریزوں کے حوالے کر دیا- ان خدمات کے صلے میں انگریزوں نے بھٹیوں کے اکثر مقبوضات بحال کر دیئے اور وہاں سے سکھوں کے مقرر کردہ آدمیوں کو قوت سے نکال باہر کیا-(۲۰) پنڈی بھٹیاں کے بھٹیوں کو اپنے مقبوضات واگذار کرانے میں تو کوئی مشکل پیش نہ آئی- البتہ جلالپور بھٹیاں میں آرائیوں اور کھتریوں نے ان کی مزاحمت کی- ان دونوں قوموں نے ۱۸۰۲ء میں یہاں سے بھٹیوں کے انخلاء کے بعد قبضہ کر لیا تھا- بالآخر انگریزوں کی مدد سے بھٹی یہاں بھی اپنے مقبوضات واپس لینے میں کامیاب ہو گئے-

انتظامی تبدیلی :

۱۸۴۹ء میں مکمل قبضے کے بعد انگریزوں نے پورے پنجاب کو سات ڈویژنوں اور ۲۷ اضلاع میں تقسیم کر دیا- ہر ضلع کو مزید تحصیلوں میں بانٹ دیا گیا- دلے کی بار کے علاقوں پنڈی بھٹیاں، جلالپور، سکھیکی، رسولپور وغیرہ کو ڈویژن لاہور ضلع گوجرانوالہ اور تحصیل حافظ آباد میں شامل کر دیا گیا- اس عرصے میں چند جدید اصلاحات بھی جاری کی گئیں- پنجاب میں ایک ہی طرز کا سکہ جاری ہوا- چونگی ٹیکس متعارف ہوا- مالیہ کی وصولی فصل کی بجائے نقدی کی صورت میں قرار دی گئی- ٹھگی

اور نومولود بچیوں کو زندہ در گور کر دینے جیسے جرائم کی بیخ کنی کے لیے کئی اقدامات کئے گئے- جانوروں کی چوری روکنے کے لیے دریائی پولیس قائم کی گئی- ان کو ان علاقوں میں تعینات کیا گیا جہاں گھنے جنگل تھے اور دریائی راستے قریب تھے- یہ دریائی پولیس دریائی کناروں اور راستوں کے ساتھ ساتھ گشت کرتی تھی- پنڈی بھٹیاں کے دریائی علاقوں میں بھی ان دنوں دریائی گشتی پولیس متعین کی گئی- اس میں کھوجی بھی بھرتی کئے گئے جو چوروں کے پاؤں کے ابھرے ہوئے نشانات زمین پر آسانی کے ساتھ پہچان لیتے تھے- کھوجیوں کی اہمیت آج بھی اس طرح قائم ہے- کیونکہ مویشی چوری میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی-

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں بھٹیوں کا کردار :

مذکورہ اصلاحات اور پنجاب پر انگریزوں کو قبضہ کئے ہوئے چند سال ہی گزرے تھے کہ ۱۸۵۷ء میں میرٹھ لکھنو اور دہلی میں انگریز حکومت کے خلاف بغاوت شروع ہو گئی جس نے پھیلتے پھیلتے پورے برصغیر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا- ۱۸۵۷ء کی اس جنگ آزادی کی چنگاریاں پنجاب پر بھی پڑنا شروع ہوئیں تو انگریز سرکار نے تمام اہم مقامات پر فوجی نفری میں اضافہ کر دیا اور اپنے پروردہ جاگیر داروں اور سرداروں کے ذمہ یہ فرض سونپا کہ وہ انہیں باغیوں کے متعلق معلومات فراہم کرتے رہیں- دلے کی بار کے بھٹیوں نے اپنے اس فرض کو خوب نبھایا- انہوں نے اپنے ہم مذہبوں کے خلاف انگریزوں کا پورا پورا ساتھ دیا-

اس موقع پر انہوں نے انگریزوں کے لیے گرانقدر خدمات انجام دیں- بھٹی قبیلہ کے سربراہ رحمت خاں بھٹی اور چٹھوں کے سردار خدا بخش چٹھہ کے مسلح دستے جنرل نکلسن کے سریع الحرکت دستے میں شامل ہو کر ان کی وفاداری کا فرض احسن طریقے سے نبھاتے رہے- اس دستے نے دہلی کے علاقوں سے جان بچا کر آنے والے باغیوں کا پیچھا کر کے ان کو ختم کرنے میں اہم کردار ادا کیا تھا- اس طرح سقوط دہلی میں بھی ان کا کردار نمایاں تھا- انگریزوں کے لیے ان عظیم خدمات کے عوض رحمت خان بھٹی کو پنڈی بھٹیاں کے موضع کوٹ دلاور میں جاگیر عطا کی گئی- یہ جاگیر ۱۹۳۰ء کے قریب رحمت خان بھٹی کی وفات کے بعد ذیلدار محمد یار کو منتقل ہو گئی-(۳۴) بعد میں یہ جاگیر محمد یار کے پانچ بیٹوں (دوست محمد، شیر محمد، عطا محمد، اللہ یار، مظفر خاں) میں برابر تقسیم ہو گئی- اب یہ جاگیر ان پانچ بھائیوں کی اولادوں کی ملکیت ہے- بہر حال جاگیر عطا ہونے کے بعد بار میں انگریزی مفادات کے تحفظ کے لیے انگریزوں نے بھٹیوں پر مکمل اعتماد کرنا شروع کر دیا تھا اور بھٹی بھی ان کے مفادات کے تحفظ کے لیے ان کا ہر حکم بجا لاتے رہے-

بار کی سماجی حالت :

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے لے کر اس صدی کی اگلی پانچ دہائیوں تک دلے کی بار کے علاقے میں بڑی اہم تبدیلیاں ظہور پذیر ہوئیں۔ اس عرصے میں انگریزوں کی طرف سے جاگیرداری نظام نے اپنی جڑیں بڑی حد تک مضبوط کر لی تھیں لیکن زرعی مزدوروں کی حالت روز بروز کمزور تر ہوتی چلی گئی۔ بعض ترقی کی راہیں کھلنے کی بناء پر یہاں چند ہندو ساہوکار بھی وجود میں آگئے تھے۔ جنھوں نے غریب آدمی کا استحصال کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔ انیسویں صدی کے آخر تک بار کے مزدوروں کی ہولناک افلاس زدہ اور بے حظ و مسرت زندگی کا کوئی اندازہ ہی نہیں کر سکتا تھا۔ ان کی بیویوں کے چیتھڑے لگے رہتے تھے۔ ان کے بچے ننگے دھڑنگے پھرتے رہتے تھے۔ ان کے پاس گھر کی آرائش و آسائش کا کوئی سازو سامان نہیں ہوتا تھا۔ موسم سرما میں ایک پھٹا پرانا کمبل ہی اس کا سامان ہوتا تھا۔ جن مزارعین کے پاس زمینیں تھیں ان کی حالت قدرے بہتر تھی لیکن ان کی کمائی کا بڑا حصہ سنگین محصول اراضی ادا کرنے میں غائب ہو جاتا تھا۔ ۱۹۰۱ء میں یہاں کے لوگوں کی فی کس آمدنی صرف ۳۰ روپے سالانہ تھی۔ پیٹ بھر کر کھانا نہ ملنے کی وجہ سے ان کے کمزور ناتواں جسم قحط اور طاعون کا بھی جلد شکار ہو جاتے تھے۔

۱۸۷۷ء کے قحط کی تباہ کاریاں :

پنجاب میں ۱۸۷۷ء میں قحط پڑا تو پنڈی بھٹیاں اور گردونواح کے سینکڑوں افراد لقمہ اجل بنے۔ اس کے بعد ۱۸۹۶-۹۷ء میں دوبارہ حالات ابتر ہوئے تو لوگ روٹی کی تلاش میں دور دراز علاقوں کی طرف ہجرت کر گئے۔ بچے روٹی کے ایک ٹکڑے کے لیے روتے تھے۔ دیہات کے دیہات مردہ جانوروں کی ہڈیوں سے بھر گئے۔ درخت سوکھ گئے۔ لوگوں کے ہاتھ ترستی آنکھوں کے ساتھ آسمان کی طرف لپکے اٹھے رہتے۔ اس ابتر حالت کی دراصل وجہ یہ تھی کہ ایک تو فصل کی کاشت ضرورت سے زیادہ نہ تھی دوسرا ذخیرہ کرنے کے اقدامات کم تھے۔ کاشتکار جدید طریقوں سے بھی ابھی ناواقف تھے۔

ترقی کا آغاز :

آئے دن کی اس صورتحال پر قابو پانے کے لیے انگریز سرکار نے ریلوے، مواصلات، تعلیم، آبپاشی اور نہری نظام کو مربوط اور منظم کرنے کے اقدامات اٹھائے۔ چنانچہ انیسویں صدی کی آخری دہائیوں میں گوجرانوالہ سے حافظ آباد اور شور کوٹ براستہ سکھیکی منڈی ریلوے لائن بچھائی گئی۔ لاہور

سے سرگودھا تک براستہ پنڈی بھٹیاں سڑک تعمیر کی گئی-(۳۵) پنڈی بھٹیاں تھانہ اور جلالپور میں چوکی قائم کی گئی- جانوروں کے لیے سکھوں کے قائم کردہ کھلی چراہ گاہوں کے بندوبست میں بہتری پیدا کی-اس سلسلے میں میجر ہملٹن کی اصلاحات پر عمل کیا گیا- چراہ گاہ کو رانیہ اور چرواہے کو جھوک کا نام دیا گیا- ۱۸۶۰ء تا ۱۸۸۴ء تک یہ نظام چلتا رہا-بعد میں ۱۸۷۹ء میں نیا نظام متعارف ہوا جس کے تحت نمبردار مقرر ہوئے-اس دور میں کاشتکاری کے لیے جو جانور تھے وہ ٹیکس سے مستثنی تھے جبکہ باقی جانور بمعہ بھیڑ بکریوں کے واجب الادا ٹیکس تھے-بعد میں یہ سہولت ختم کر دی گئی اور کاشتکاری جانوروں پر بھی ٹیکس عائد کر دیا گیا-اسی دور میں قصبہ پنڈی بھٹیاں کے شمالی طرف ایک گیٹ تعمیر کیا گیا جو تاریخ پنجاب اور تاریخ لاہور کے مصنف اور انجینئر رائے بہادر کنہیا لال کی زیر سرکردگی انگلستان کے بادشاہ کی رسم تاجپوشی کے موقع پر تعمیر ہوا-اب یہ عاقل والا گیٹ کے نام سے مشہور ہے-

ذیلداروں کی تقرری :

۱۸۶۵ء کے بعد مقامی نظم و نسق کو چلانے کے لیے تحصیل حافظ آباد میں جو انتظامی ڈھانچہ انگریزوں نے قائم کیا تھا-اس کے مطابق تحصیل حافظ آباد کے لیے ایک تحصیلدار اور ایک نائب تحصیلدار تعینات تھا-۶ قانون گو اور ۸۴ پٹواری تھے-دیہاتی انتظام کے لیے ۱۰ ذیلدار، ۱۰ سفید پوش، ۱۲۸۱ اعلی نمبردار ۵۸۷ نمبردار اور ۳۰۶ چوکیدار متعین کئے گئے-۱۹۰۱ء میں تھانہ پنڈی بھٹیاں کی آبادی ۶۴۳۸۷ نفوس پر مشتمل تھی اور اس کے انتظام کے لیے ایک ڈپٹی انسپکٹر، ۲ سارجنٹ، ۱۲ کانسٹیبل، قصبے کے لیے ۶ دیہاتوں کے لیے ۹۶ چوکیدار رکھے گئے تھے-(۳۶) ۱۸۸۲ء میں ٹیکس جمع کرنے والے تمام ذیلداروں کو برطرف کر دیا گیا تھا کیونکہ کوئی خاص آمدنی پیدا نہیں کر سکے تھے-اس دوران افغان اینگلو جنگ کا آغاز ہوا تو انگریزوں نے ضلع گوجرانوالہ سے ۷۰۰۰ روپے فراہم کرنے کا حکم جاری کیا- یہ تمام بوجھ نمبرداروں اور ذیلداروں کے ذریعے بار کے غریب لوگوں پر ڈال دیا گیا-

۱۸۸۲ء میں ذیلداروں کی برطرفی کے ایک سال بعد یعنی ۱۸۸۳ء میں نئی ذیل بندی کی گئی-ہر ذیل میں ایک بااثر ذیلدار مقرر کیا گیا- تحصیل حافظ آباد کو کل ۱۹ ذیلوں میں تقسیم کیا گیا تھا- ان میں پنڈی بھٹیاں جلالپور، کوٹ نکہ، سکھیکی، کسیسے، ساکھی اور کوٹ سرور کی ذیلیں بھی شامل تھیں- ۱۸۸۳ء کی رپورٹ کے مطابق متذکرہ ذیلوں میں شامل دیہاتوں کی تعداد اور ریونیو کا گوشوارہ درج ذیل ہے-

نام ذیل	تعداد دیہات	ریونیو	زیر اثر
۱- پنڈی بھٹیاں	۶۵	۳۷۷۴۴روپے	بھٹی، گوندل، لودھی
۲- جلالپور بھٹیاں	۵۳	۲۵۸۴۹	بھٹی، گوندل، بھون
۳- کوٹ نکہ	۱۰	۳۷۱۳	بھٹی، جاٹ
۴- سکھیکی	۱۸	۴۳۴۸	بھٹی، جاٹ
۵- کسیسے	۲۵	۷۱۱۰	لودھی کے، جاٹ
۶- ساکھی	۲۴	۵۵۴۴	لودھی کے، جاٹ
۷- کوٹ سرور	۱۶	۵۱۶۹	لودھی کے، بھٹی (۳۷)

ذیلداروں کی تعیناتی کے علاوہ اس وقت تحصیل حافظ آباد میں ۴۹۶ چیف ہیڈ مین اور ۳۰۷ دیہہ ہیڈ مین بھی مقرر کئے گئے تھے۔ اس نئے نظام کے تحت عوام سے جو ٹیکس وصول کیا جاتا تھا وہ کسی بھی طرح سے ۲۰ء۵ فیصد سے کم نہ ہوتا تھا۔ اس میں ذیلداروں کا ۲/۱اسے ۲ فیصد، نمبرداروں کا ۶ فیصد، پٹواریوں کا ۳ سے ۹ فیصد، سکول، فنڈ، سڑک فنڈ اور پوسٹل فنڈ کا ڈھائی فیصد بھی شامل ہوتا تھا۔ (۳۸)

بار کی تعلیمی حالت :

بار کے علاقے میں تعلیمی تبدیلیوں کے ضمن میں گورنمنٹ کالج لاہور کے پہلے پرنسپل مسٹر لائٹنر کی رپورٹ بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ جو انہوں نے بڑی عرق ریزی سے ۱۸۸۳ء میں مرتب کی تھی۔ اس رپورٹ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ علاقوں میں انگریزوں نے اپنا نظام تعلیم نافذ کرنے کے لیے مقامی مکتبوں اور درسگاہوں کو کس طرح سختی اور بے ہودگی سے ختم کیا۔ ۱۸۸۲ء سے قبل پنڈی بھٹیاں، قلعہ مراد نقش اور چک بھٹی میں تین گورمکھی سکول تھے جو یہاں کے دھرم سالاؤں میں قائم تھے اور ان میں گنگاداس گھنشیا سنگھ، ایشر داس اور دس مل سے علی الترتیب ۴، ۲۰ اور ۲۸ طالب علم گورمکھی اور لنڈوں کی تعلیم پاتے تھے۔ ٹھٹھی آسائش میں بھی ایک گورمکھی سکول تھا۔ پنڈی بھٹیاں اور جلالپور میں دو مہاجنی سکول بھی تھے جہاں ترتیب وار گنیش داس اور بال مکند شاشتری اور گورمکھی پڑھاتے تھے۔ علاوہ ازیں جلالپور بھٹیاں اور بھٹی چک میں دو مکتب تھے جہاں مولانا محمد حسین اور احمد الدین عربی اور فارسی کی تعلیم دیتے تھے۔ اس وقت علاقے میں اہم علمی شخصیات میں پنڈت نانک چند، شنکر داس، پنڈت سکھ رام، جلالپور میں حکیم جوالا سہائے ساکنان

جلالپور بھٹیاں، حکیم غلام حسن چک بھٹی اور مولانا محمد حسین جلالپور شامل تھے-ان مدرسوں کے علاوہ چک کھرل، نکی چٹھہ، سوئیاں والا، کوٹ نشا، نانوالہ، مڈھورا، کسیسے، کوٹ خوشحال اور متے کی میں مسلمانوں کے مکتب تھے جہاں قرآن مجید اور فارسی کی تعلیم دی جاتی تھی-انگریزی مدرسوں کے اجراء کے بعد بار کے ان دیسی مدرسوں کو شدید زد پڑی اور یہ اپنی اہمیت کھونے لگے جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ یہاں کے لوگوں بالخصوص مسلمانوں میں شرح خواندگی کم ہونے لگا-اس کا اندازہ ۱۹۰۱ء کے اعداد و شمار سے بھی لگایا جا سکتا ہے-اس وقت تحصیل حافظ آباد کی کل آباد ۲۱۶۶۶۶ (۱۱۸۶۰۲ مرد اور ۹۹۰۶۴ خواتین) تھی-ان میں سے صرف ۴۵۸۱ مرد اور ۱۵۵ عورتیں لکھنا پڑھنا جانتی تھیں-اس طرح یہاں صرف ۲ء۲ فیصد لوگ خواندہ تھے-یہ شرح ضلع گوجرانوالہ کے دیگر علاقوں کی نسبت بہت کم تھی-اعداد و شمار کے مطابق تحصیل گوجرانوالہ میں یہ شرح خواندگی ۶ء۴ وزیر آباد میں ۵ء۴ اور خانقاہ ڈوگراں تحصیل کے علاقوں میں ۷ء۲ فیصد تھی-(۳۹)

نہری نظام کی خوشحالی :

تعلیمی تبدیلیوں سے قطع نظر علاقے میں آبپاشی کا ایک اہم منصوبہ شروع کیا گیا-جس کے تحت ۱۸۸۷ء میں دریائے چناب سے نہر نکالی گئی اور اس کے دو سال بعد اس سے مزید شاخیں نکالی گئیں-ایک بڑی شاخ جو جھنگ برانچ کہلاتی ہے پنڈی بھٹیاں اور سکھیکی کے درمیانی علاقے سے ہو کر آگے چلی جاتی ہے-اس نہر کی کھدائی کے دوران اگرچہ بار کے بعض جرائم پیشہ زمینداروں نے ہلکی پھلکی مزاحمت کی لیکن جب اس کارواں پانی بار کی پیاسی بجز زمینوں کو سیراب کرنے لگا تو کاشتکاروں اور زمینداروں کے دن بھی پھرنے شروع ہو گئے-اس کے نتیجے میں پنڈی بھٹیاں گھی اور جنس کے کاروبار کا مرکز بھی بنتا گیا اور اسی دوران مسٹر برانڈر تھ ڈپٹی کمشنر گوجرانوالہ نے خود یہاں آکر غلہ منڈی کی تعمیر کا افتتاح کیا-یہ خوشحالی کے ایک نئے دور کا آغاز تھا-چنانچہ یہ پنجابی گیت زبان زد عام ہوتا چلا گیا-

اول سائیں سچے نوں سوراں — اک قصہ نواں اج جوڑاں
بار اگے لٹ کھادی چوراں — ہرن گدڑ، چوبیاں دیاں گھوڑاں
بجن جنگل کوئی نا ہی راہ — نیگ صاحب دتا ملک وسا
انگریزاں دا ویکھو اتفاق — اکو وعدہ، سچی بات
کتھے ہائی وزیر آباد — کھپر جیتے پاوے افات
بند پل ڈکیا دریا — نیگ صاحب دتا ملک وسا

نال کنارے ریل چلے سیر کرن جناں دے پلے
ترت خبراں اگے گھلے بابو آن سٹیشن ملے
واہ قدرت، تیری خدا نیگ صاحب، دتا ملک وسا
زمین انگریزاں کجھ لئی ساری آپو آپ بھجے پٹواری
ذیلدار کئی منشی بھاری چوں نوں دتی مختاری
پانی دیون جدے لوڑ دیکھ میرے مولا تے چھٹے
سکھاں جٹاں نوں مل گئے خطے بھک جنہاں نوں گئے گٹے
ایہہ رجدے نہیں اکھیں ڈٹھے پھیرن شراب مچھاں تے تا
نیگ صاحب دتا ملک وسا انگریز بہادر بھارا پیر اے
جنہیں دتا دریا نو چیر اے نہر کڈھی سدھی تیر اے
کدھیاں تے لگ گئے جھیرے بوٹا جھاڑی دتا ہٹا
نیگ صاحب دتا ملک وسا انگریز دی ویکھو سرداری
بادشاہ کجھ نیں وپاری دنیاں کیتی ناہیں پیاری
پیسہ وٹن اکیسے واری ایہہ راجے نہیں بے پرواہ
نیگ صاحب دتا ملک وسا ایہہ انگریز اولیاء ضرور
سچ منو ذرا نہ کوڑ پل وچ جنگل کیتا دور
ٹھکیدار تے ترے مجور (مزدور) ہزاراں دی لگ گئی تنخواہ

نیگ صاحب دتا ملک وسا

☆☆☆

جدید سیاسی دور ۱۹۰۱ء تا ۱۹۴۷ء

۱۹۰۱ء میں طاعون کی تباہی :

غریب کسانوں کے ہونٹوں پر ابھی یہ گیت چڑھے ہی تھے کہ بیسویں صدی کی ابتداء ہی میں انہیں زبردست آفت نے آن گھیرا۔ ۱۹۰۱ء میں بار کے علاقے میں طاعون کا مرض یوں پھیلا کہ ہزاروں لوگ اپنا گھر بار چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ طاعون کے اس حملے کی ابتداء اکتوبر ۱۸۹۷ء میں ضلع جالندھر کے گاؤں کھتکل کلاں سے ہوئی تھی۔ یہاں یہ مرض مئی ۱۸۹۶ء میں ہردوار کے ذریعے پہنچا تھا۔ ۱۹۰۰ء تک یہ سیالکوٹ لاہور اور گوجرانوالہ کے اضلاع تک پہنچ چکا تھا۔ یہ بیماری پھیلنے کی اصل وجہ وہ چوہے تھے جن کے اندر طاعون کے جراثیم موجود ہوتے ہیں۔ جب لوگوں نے اس مرض کو شدید ہوتے دیکھا تو خود ہی شہر اور گھروں کو چھوڑ کر میدانوں میں جا پناہ لینا شروع کی۔ پنڈی بھٹیاں کی نصف آبادی کھلے میدانوں میں جا کر خیمہ زن ہو گئی تھی۔ چوہوں کے علاوہ اس مرض کے اتنے وسیع پیمانے پر پھیلنے کی وجہ یہ تھی کہ یہاں کے لوگ رسم و رواج پر بڑی سختی سے عمل کرتے ہوئے مریض کے ارد گرد ہر وقت جمع رہتے تھے۔ ایک اور وجہ یہ بھی تھی کہ اگر کسی گھر میں کوئی موت واقع ہو جاتی تو گاؤں محلے کی یا عزیز عورتیں اس گھر کی عورتوں کے منہ کے قریب اپنا منہ کر کے اوپر چادر اوڑھ کر بین کرتی تھیں۔ اس طرح ایک دوسرے کے جراثیم ان میں داخل ہو جاتے تھے۔ جوں جوں یہ مرض بڑھتا گیا۔ یہاں کی شرح اموات میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ کوئی ۱۰، ۱۵ سال بعد اس مرض پر قابو پایا جا سکا لیکن اس دوران علاقے کے سینکڑوں لوگ موت کے منہ میں جا چکے تھے۔

سیاسی شعور کی ابتداء :

طاعون کے مرض کے نقصان کے باعث دلے دی بار کے عوام کے لیے بیسویں صدی کا سورج خوشی اور خوشحالی کی کوئی نوید لے کر نہ نکلا تھا۔ مگر اس دوران مواصلات اور نہری نظام کی ترقی نے پنڈی بھٹیاں اور گردونواح کی تجارت میں خاطر خواہ اضافہ کر دیا تھا۔ اس زمانے میں لاہور پنجاب کی سیاسی سرگرمیوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ لاہور کے بعد امرتسر ایک ایسا شہر تھا جہاں آبادی زیادہ تھی اور لوگ نسبتاً زیادہ پڑھے لکھے تھے اور باشعور تھے۔ پنجاب کے دور دراز کے لوگ جب تجارت اور خرید و فروخت کی غرض سے لاہور اور امرتسر جاتے تو اپنے ساتھ سیاسی قسم کی معلومات بھی لاتے تھے۔

پنڈی بھٹیاں اور گردونواح کے تجارت پیشہ لوگ بھی اپنے مال کی خرید و فروخت کی غرض سے زیادہ تر لاہور اور امرتسر کے مرکزی مقامات کی طرف رجوع کرتے تھے۔اس لیے جب یہ لوگ وہاں سے واپس لوٹتے تو اپنے ساتھ مختلف طرح کے سیاسی خیالات بھی لاتے۔بڑے شہروں میں ان کو سیاسی خبریں سننے اور پڑھنے کو مل جاتی تھیں۔اس لیے جب وہ گھروں کو لوٹتے تو لوگوں کو بھی ان سیاسی باتوں سے آگاہ کرتے۔یوں آہستہ آہستہ علاقے کے لوگ بھی ملک میں ہونے والی سیاسی تبدیلیوں سے آگاہ ہوتے چلے جاتے۔اسی سیاسی شعور کے تحت ۱۹۱۰ء میں جلالپور بھٹیاں کے مسلمانوں نے انجمن اشاعت اسلام کے نام سے ایک تنظیم اپنے سماجی و مذہبی حقوق کے تحفظ کے لیے قائم کرلی۔ لیکن اس سے قبل پنڈی بھٹیاں میں ہندوؤں کی بعض تنظیمیں قائم ہو چکی تھیں۔اسی وجہ سے وہ تجارتی میدان کے ساتھ ساتھ سیاسی میدان میں بھی مسلمانوں سے بہت آگے تھے۔

سمال ٹاؤن کمیٹی پنڈی بھٹیاں کا انتخاب ۱۹۱۲ء :

جیسا کہ ۱۹۱۲ء کی سمال ٹاؤن کمیٹی پنڈی بھٹیاں کی ساخت سے ظاہر ہے اس وقت تک یہاں کے مسلمان آبادی میں اکثریت ہونے کے باوجود بلدیہ کی قیادت کرنے سے محروم تھے۔اس سال کے انتخاب میں ایک ہندو دیوان موتی رام بلدیہ کے پریذیڈنٹ مقرر ہوئے جبکہ دیگر ممبران میں (۱) لالہ کرپارام۔(۲) لالہ ایشر داس (۳) لالہ امیر چند (ڈاکٹر)(۴) میاں محمد یار خاں بھٹی (۵) میاں سعد اللہ خاں بھٹی شامل تھے۔(۴۱)

الیکشن ٹاؤن کمیٹی ۱۹۱۶ء :

لیکن چار سال کے بعد یہ صورتحال برقرار نہ رہ سکی۔چنانچہ ۱۹۱۶ء کے ٹاؤن کمیٹی پنڈی بھٹیاں کے جدید انتخاب کے نتیجے میں ہندوؤں سے قیادت چھن کر مسلمانوں کے ہاتھوں میں آگئی اور میاں محمد یار خاں ذیلدار پریذیڈنٹ مقرر ہو گئے۔بلاشبہ انگریز حکام کی آشیرباد کے بغیر یہ عہدہ حاصل کرنا اس وقت کے حالات میں ناممکن ہوتا تھا اور میاں محمد یار بھٹی نے انگریزوں کی یہ آشیرباد پہلی جنگ عظیم کے دوران فوجی بھرتی کروا کر حاصل کرلی تھی۔دیگر منتخب ممبران میں (۱) لالہ ایشر داس۔(۲) میاں سعد اللہ (۳) ہرداس سنگھ (۴) ڈاکٹر کرما سنگھ (بلحاظ عہدہ) شامل تھے۔(۴۲)

جنگ عظیم اول میں بھٹیوں کی انگریزی مدد :

اسی زمانے میں پہلی جنگ عظیم کا آغاز ہو گیا تھا اور اس میں برطانیہ اور اس کی اتحادی قوتیں

ایک طرف تھیں تو دوسری طرف اٹلی جرمنی اور مسلمان ملک ترکی تھے۔ جنگ شروع ہوتے ہی ہندوستان کی انگریز سرکار نے مقامی لوگوں کو جنگ میں ہانکنے کے لیے جبری فوجی بھرتی شروع کر دی۔ بے روزگاری عام تھی اور انگریز سرکار کو پنجاب کے جاگیرداروں اور بڑے زمینداروں کی خدمات بھی حاصل تھیں اس وجہ سے یہ مشکل کام نہ تھا۔ چنانچہ ۱۹۱۵ء میں اس مقصد کے لیے دلے کی بار کے ضلعی صدر مقام گوجرانوالہ میں گورنر پنجاب ایڈوائر کا دربار منعقد ہوا۔ اس دربار میں تارڑوں، چٹھوں اور بھٹیوں کے سرکردہ افراد نے بھی شرکت کی۔ بھٹیوں میں جلالپور سے شیر عالم بھٹی، پنڈی بھٹیاں سے سعد اللہ خاں، خان دوراں خاں اور محمد یار خاں بھٹی اس دربار میں شریک ہوئے۔ ان تمام نے امرناتھ ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر گوجرانوالہ کی زیر نگرانی علاقے سے فوجی بھرتی کے کام کو سرانجام دینے میں اہم کردار ادا کیا۔ میاں شیر عالم بھٹی خود فوج میں بھرتی ہو کر مردان کے علاقے میں تعینات رہا۔ جبری بھرتی کے خوف سے علاقے کے کئی نوجوان چھپ جاتے تھے۔ مگر یہ بااثر افراد ان کو ڈھونڈ نکال کر زبردستی فوجی ٹرکوں میں بٹھا دیتے تھے۔ جنگ کے دوران انگریزی حکومت نے سرمائے کی فراہمی کے لیے کئی اقدامات کئے۔ چنانچہ اسی غرض سے جلالپور بھٹیاں کی پختہ فصیل کو سرکاری طور پر فروخت کر کے رقم حاصل کی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ آج جلالپور کے تقریباً نصف مکان اسی فصیل کی چھوٹی نانک شاہی اینٹوں کے تعمیر کردہ ہیں۔ دیگر فنڈز میں جلالپور کے کھتریوں اور پنڈی بھٹیاں کے اروڑوں اور کالڑوں نے بھی وافر رقوم جمع کرائیں۔ انگریزی حکومت کی ۱۹۲۲ء کی طبع کردہ رپورٹ بعنوان پنجاب اور جنگ (The Punjab and the War) کے مطابق جنگ عظیم اول کے دوران خدمات کے عوض محمد یار بھٹی کو پنڈی بھٹیاں میں ۵ مربع جلالپور بھٹیاں کے مراد نقش بھٹی کو ۵ مربع، خان دوران خان بھٹی کو سانگلہ میں ۷ مربع، حافظ آباد کے محمد وزیر خاں کو ۵ مربع اور ویٹے میں چوہدری فضل الٰہی تارڑ کو ۵ مربع زمین الاٹ کی گئی تھی۔ (۴۳)

رولٹ ایکٹ کے خلاف احتجاج :

ابھی جنگ جاری تھی کہ پنجاب میں انقلابی سرگرمیاں اپنے عروج پر پہنچی ہوئی تھیں۔ ان کے سدباب کے لیے انگریزی حکومت نے مارچ ۱۹۱۹ء میں بدنام زمانہ رولٹ ایکٹ پاس کیا۔ جس کے تحت کسی بھی شخص کو گرفتار کرنے اور اسے سزا دینے کے وسیع ظالمانہ اختیارات انتظامیہ کے پاس آ گئے تھے۔ اس ایکٹ کے خلاف پورے ہندوستان میں سخت احتجاج ہوا۔ اسی احتجاج کے نتیجے میں امرتسر میں سانحہ جلیانوالہ باغ رونما ہوا۔ اس سانحہ کا پنجاب بھر میں بڑا ردعمل ہوا اور جگہ جگہ فسادات پھوٹ پڑے۔ گوجرانوالہ، وزیرآباد، اکال گڑھ (علی پور) چوہڑکانہ، سانگلہ ہل، مڑھ بلوچاں

اور حافظ آباد جہاں ریلوے اسٹیشن تھے وہاں مظاہرین نے بڑے ہنگامے کھڑے کئے۔

۱۴ اپریل ۱۹۱۹ء جب بیساکھی کا تہوار تھا۔ حافظ آباد ریلوے اسٹیشن پر ہنگامہ ہو گیا۔ اسی دوران لائل پور سے ایک گاڑی آئی تو ہجوم نے اسے روک لیا۔ اس میں ایک لیفٹیننٹ ٹائم اپنے سات سالہ بچے کے ہمراہ سفر کر رہا تھا۔ لوگ اسے دیکھ کر دیوانہ ہو گئے۔ عین ممکن تھا کہ یہ انگریز جان سے ہاتھ دھو بیٹھتا کہ وہ گاڑی کے طہارت خانے میں چھپ گیا اور غچہ دے کر پچھلے دروازے سے ڈرائیور تک پہنچا اور بغیر سگنل دیے گاڑی چلوا دی۔ جب یہ خبر حافظ آباد کے رہنماؤں ڈاکٹر امریک سنگھ، لالہ رام سہائے، لالہ بہاری لال، سردار میوہ سنگھ اور دیوان سنگھ مفتون وغیرہ کو پہنچی تو وہ مشتعل ہجوم کو سمجھانے کے لیے آئے مگر لوگ ان کی کوئی بات سننے کے لیے تیار نہ تھے۔ انہوں نے ریلوے لائن اکھاڑ دی، تاریں کاٹ دیں، تحصیل ڈاک خانہ اور ریلوے اسٹیشن کی عمارتوں کو تہہ و بالا کر دیا۔ شکست و ریخت کا یہ سلسلہ رات گئے تک جاری رہا۔ بالآخر انتظامیہ نے فوج طلب کی۔ ڈپٹی کمشنر گوجرانوالہ ۲۲ اپریل کو خود حافظ آباد آیا اور حکم دیا کہ جو شخص اپنے سر پر پگڑی باندھتا ہو وہ صبح سات بجے تحصیل کے ساتھ ملحق میدان میں جمع ہو جائے۔ جو شخص دیدہ و دانستہ نہیں آئے گا یا بیماری کا بہانہ بنائے گا اسے گولی مار دی جائے گی۔ یہ فرنگی ظلم و استبداد کی ابتداء تھی اور انتہا قید و بند کی صعوبتوں اور سزائے موت کی سزاؤں تک جا پہنچی۔ ۱۱۹ افراد پر مقدمہ چلایا گیا منگل سنگھ گجراتی کو سزائی موت اور کیسر مل اور کرم چند کو قید کی سزائیں سنائیں گئیں۔ (۴۴) اسی دوران حالات کو قابو میں رکھنے کے لیے کرنل اوبرائن جلالپور اور پنڈی بھٹیاں بھی آیا اور حفاظتی اقدام کے طور پر یہاں کی پولیس نفری میں اضافہ کر دیا۔ مگر یہاں کوئی ناخوشگوار واقعہ رونما نہ ہوا۔

تحریک خلافت :

جنگ کے اختتام پر جب برطانیہ کو فتح حاصل ہو گئی تو اس نے ترکی خلافت کے علاقوں کو تقسیم کرنا شروع کر دیا۔ اس پر برصغیر کے مسلمانوں کو تشویش لاحق ہوئی کہ ترکی کے ٹکڑے کرنے کے علاوہ ان کے متبرک مقامات کو نقصان نہ پہنچایا جائے۔ چنانچہ ان کے تحفظ کے لیے مسلمانوں نے کانگرس سے مل کر ۱۹۱۹ء میں تحریک خلافت شروع کر دی۔ اس دوران ولائتی مال کا بائیکاٹ کیا گیا اور انگریزوں کے خلاف مظاہرے کئے گئے۔ شروع شروع میں بار کے علاقے میں اس تحریک کے حوالے سے کوئی سرگرمی نظر نہ آئی مگر بعد میں جب مولانا محمد علی جوہر کی والدہ بی اماں پنجاب کے دورے کے دوران چنیوٹ پہنچیں اور وہاں مولانا ذاکر حسین (جامع محمدی شریف) نے تحریک کے سلسلے میں مظاہروں کا آغاز کیا۔ (۴۵) تو ان کے اثرات یہاں بھی پہنچے۔ چنانچہ جلالپور اور پنڈی

بھٹیاں میں بھی اس تحریک کی حمایت میں فضا ہموار ہوئی اور مقامی طور پر یہ گیت بڑا مشہور ہوا۔

ہن گیت وطن دے گاواں گے
اسیں کھدر آپ ہنڈاواں گے
غازی مصطفے پاشا کمال دے
آکے ویکھ سمرنا دا حال دے
تیریاں دور بلائیاں
بیوہ ہو گئی آں مائیاں

انگریزی مال کے بائیکاٹ کی وجہ سے بار کے علاقے کے ہر گھر میں چرخہ رواج پا گیا تھا اور اس سے مقامی صنعت کو بڑا فروغ حاصل ہوا تھا۔

الیکشن پنجاب کونسل ۱۹۲۱ء :

اسی دوران کہ جب پورے ملک میں انتشار اور افراتفری پھیلی ہوئی تھی۔ مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات یعنی قانون حکومت ہند ۱۹۱۹ء کا نفاذ عمل میں لایا گیا۔ اس قانون کے تحت ۹۴ رکنی پنجاب لیجسلیٹو کونسل تشکیل دی گئی۔ اس میں ۷۱ اراکین کا انتخاب عوام کے ووٹوں سے ہوتا تھا۔ ان میں سے ۳۵ مسلمان نشستیں تھیں۔ پنڈی بھٹیاں، جلالپور، کالیکے، وزیرآباد، رسولپور، سکھیکی اور حافظ آباد کے علاقے دیہاتی حلقہ میں شامل کئے گئے تھے۔ یہ ایک بڑا وسیع حلقہ تھا۔ ہر وہ شخص جو زمین کا مالک تھا یا اس پر کاشت کرتا تھا خواہ اس کا رقبہ کتنا ہی مختصر کیوں نہ ہو۔ ووٹ کا حق رکھتا تھا۔ کاشتکار اور زمینداروں دونوں کے ووٹ مساوی تھے۔ یعنی اوسطاً پانچ ایکڑ لینڈ اوونر کثیر تعداد میں نکل آئے تھے۔ اس حلقے میں (جس میں موجودہ ضلع حافظ آباد کا تقریباً پورا علاقہ شامل تھا) مسلمان ووٹرز کی کل تعداد ۳۰۷۷ تھی۔ تمام فوجیوں اور سابق فوجیوں کو ووٹ دینے کا حق تھا اور اس طرح وہ تمام لوگ بھی ووٹ دینے کے مجاز تھے جن کے اپنے مکانات تھے اور ان کا دو روپے ماہانہ کرایہ تھا۔ عورتوں کو البتہ ووٹ ڈالنے کی اجازت نہ دی گئی تھی۔

۱۹۲۱ء میں پنجاب کونسل کے اس حلقہ کے انتخاب میں مسلمانوں کی دیہی نشست پر چوہدری عطاءاللہ خاں ذیلدار کولوتارڑ کامیاب ہوئے۔ (۴۶) چونکہ اس وقت کانگرس، مجلس خلافت اور دیگر سیاسی جماعتوں نے ان انتخابات کا بائیکاٹ کیا تھا۔ اس لیے وہ آزاد امیدوار کے طور پر کامیاب ہوئے تھے۔ اس انتخاب میں ۹۰ فیصد رائے دہندگان کی ناخواندگی کے باعث دلچسپ طریق کار اختیار کیا گیا تھا۔ جو لوگ پڑھنا لکھنا نہیں جانتے تھے ان کے بیلٹ پیپر پر پریذائیڈنگ افسر خود نشان لگا دیا کرتا تھا۔

الیکشن پنجاب لیجسلیٹو کونسل ۱۹۲۳ء :

دو سال بعد ہی پنجاب لیجسلیٹو کونسل کے دوسرے انتخابات ۱۹۲۳ء میں جماعتی بنیادوں پر منعقد ہوئے۔ اس وقت سر فضل حسین نے پنجاب یونینسٹ پارٹی تشکیل دے لی تھی۔ کانگریسیوں نے سوراج پارٹی کے پلیٹ فارم پر انتخاب میں حصہ لیا۔ حلقہ پنڈی بھٹیاں بمعہ جلالپور، وزیر آباد، سکھیکی، حافظ آباد (جو گوجرانوالہ ۱ کہلاتا تھا) میں دو امیدواروں کے مابین مقابلہ ہوا۔ ایک امیدوار خاں بہادر چودھری کرم الٰہی چٹھہ تھے۔ ان کے مقابلے میں چودھری راج محمد تارڑ (رسولپور تارڑ) تھے۔ چودھری کرم الٰہی چٹھہ نے چوہدری راج محمد تارڑ کو ۱۳۵۱ ووٹوں کی اکثریت سے شکست دی۔ حلقے میں کل ۷۷۳۰ ووٹ تھے۔ ان میں سے ۲۳۴۰ ووٹران نے اپنا حق رائے دہی استعمال کیا۔ چوہدری کرم الٰہی چٹھہ نے ۲۸۲۷ جبکہ ان کے مدمقابل راج محمد تارڑ نے ۱۵۱۳ ووٹ حاصل کئے۔ کرم الٰہی چٹھہ ضلع بورڈ کے رکن، احمد نگر کے ذیلدار اور ڈویژنل درباری تھے۔ ۱۹۱۴ء میں انہیں خان بہادر کا اور چار سال بعد ایم بی ای کا خطاب ملا۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران بھی انہوں نے انگریزوں کے لیے نمایاں خدمات انجام دیں جس کے بدلے میں انہیں انعام و اکرام سے نوازا گیا۔ وہ دو دہائیوں تک اعزازی مجسٹریٹ اور سول جج درجہ اول کے فرائض بھی انجام دیتے رہے۔ ۱۹۳۰ء میں وفات پائی۔

موجودہ ضلع حافظ آباد کے ہندو اور سکھ ووٹرز کے لیے بہت وسیع حلقہ قائم کیا گیا تھا۔ یہ راولپنڈی اور لاہور ڈویژن (شمالی) کے غیر مسلم حلقے میں شامل تھا۔ اس حلقے سے پنجاب کونسل کے انتخاب میں ہندوؤں کی طرف سے دیوان نرنجن داس بار ایٹ لاء بلا مقابلہ کامیاب ہوئے تھے۔ سکھوں کا حلقہ جس میں پنڈی بھٹیاں، جلالپور، حافظ آباد وغیرہ شامل تھے۔ راولپنڈی ڈویژن اور گوجرانوالہ ضلع پر مشتمل تھا۔ اس حلقے سے ۱۹۲۳ء میں رائے صاحب ہرنام سنگھ (راولپنڈی) سردار نرائن سنگھ وکیل (گوجرانوالہ) اور سردار سندر سنگھ (منڈیالہ وڑائچ۔ گوجرانوالہ) امیدوار تھے۔ ان میں سے سردار نارائن سنگھ ۴۵۲۴ ووٹ لے کر کامیاب ہوئے تھے۔ دراصل ان انتخابات میں صرف وہی امیدوار کامیاب ہوئے جن کو انگریز سرکار کی سرپرستی حاصل تھی۔ یہ سب کے سب جاگیردار اور انگریز سرکار کے خدمت گزار تھے۔ (۴۷)

الیکشن سمال ٹاؤن کمیٹی ۱۹۲۵ء :

۱۹۲۵ء میں سمال ٹاؤن کمیٹی پنڈی بھٹیاں کے انتخابات ہوئے تو میاں سعد اللہ خاں، ایشر داس پاہوہ، کندن لال، گنپت رائے اور ڈاکٹر کرم چند اس کے رکن منتخب ہوئے۔ (۴۸)

الیکشن پنجاب کونسل ۱۹۲۶ء :

۱۹۱۹ء کے ایکٹ کے تحت پنجاب کونسل کے تیسرے انتخابات ۱۹۲۶ء میں منعقد ہوئے- ضلع گوجرانوالہ کی دیہی نشست (موجودہ ضلع حافظ آباد بشمول پنڈی بھٹیاں) پر چوہدری علی احمد چٹھہ کامیاب ہوئے- ان کے خاندان نے سکھوں کے خلاف جنگ میں انگریزوں کا بھرپور ساتھ دیا تھا اور خود انہوں نے پہلی جنگ عظیم میں فوجی بھرتی کے سلسلے میں ان کے لیے اہم خدمات سرانجام دی تھیں- سکھ نشست پر اس حلقے سے بھائی نارائن سنگھ وکیل کامیاب ہوئے- وہ ۱۹۲۳ء کے الیکشن میں بھی اس نشست پر کامیاب ہوئے تھے- ہندوؤں کی نشست پر اس حلقے سے مسٹر لبھ سنگھ بار ایٹ لاء نے کامیابی حاصل کی تھی-(۴۹)

الیکشن ٹاؤن کمیٹی ۱۹۲۸ء :

۱۹۲۵ء میں سمال ٹاؤن کمیٹی پنڈی بھٹیاں کا درجہ بڑھا کر اسے ٹاؤن کمیٹی بنا دیا گیا تھا- ۱۹۲۸ء میں اس کے انتخابات ہوئے تو میاں عطا محمد بھٹی، میاں اللہ یار، میاں سعد اللہ، تلسی داس کالڑہ، لالہ تلسی داس پاہوہ اور ڈاکٹر گنپت رائے ممبر بنے-(۵۰)

الیکشن پنجاب کونسل ۱۹۳۰ء :

متذکرہ قانون کے تحت پنجاب کونسل کے آخری انتخابات ۱۹۳۰ء میں ہوئے- یونینسٹ پارٹی، نیشنل پروگریسو پارٹی، مسلم لیگ اور دیگر جماعتوں نے ان میں اپنے اپنے امیدوار کھڑے کئے- دیہی حلقہ گوجرانوالہ ا (پورا ضلع حافظ آباد بشمول وزیر آباد) کی مسلم نشست پر دو امیدواروں کے درمیان مقابلہ ہوا- یونینسٹ پارٹی کے امیدوار خان بہادر چوہدری ریاست علی چٹھہ نے مخالف امیدوار کو ہرا کر کامیابی حاصل کی- انہیں پنڈی بھٹیاں کے بھٹیوں اور دیگر بااثر مسلمان خاندانوں کی مکمل حمایت حاصل تھی- اس وقت اس حلقے سے کل مسلم ووٹرز کی تعداد ۹۱۲۸ تھی اور ان میں صرف ۸۸۷ رائے دہندگان نے اپنے حق رائے دہی کا استعمال کیا تھا- اس طرح اس حلقے سے صرف ۹٫۷ فیصد مسلم ووٹرز نے عملی طور پر ووٹ کے عمل میں حصہ لیا تھا- یہ تناسب پورے پنجاب کے تمام حلقوں کے مقابلے میں سب سے کم تھا-(۵۱) چوہدری ریاست علی (علی پور چٹھہ) اس حلقے سے ۱۹۲۳ء میں منتخب ہونے والے رکن اسمبلی کے چچازاد بھائی ن.م قادر کے فرزند تھے ۱۹۲۴ء کے بعد وہ کئی مرتبہ گوجرانوالہ میونسپلٹی کے رکن رہے- بعد ازاں وہ اس کے صدر بھی رہے- اس حلقہ سے سکھوں کی نشست پر مسٹر لبھ سنگھ ہی کامیاب ہوئے- یہ وہ دن تھے جب

کانگرس نے ہندوستان میں سول نافرمانی کی تحریک شروع کی ہوئی تھی۔اس حوالے سے اس علاقے میں کوئی احتجاج نہیں ہوا۔صرف ضلعی انتظامیہ کی طرف سے چوہدری غلام مصطفےٰ بیرسٹر گوجرانوالہ کا تحریر کردہ ایک پمفلٹ بعنوان "تحریک سول نافرمانی کی تحریک میں طلباء کو کیا کرنا چاہیے" یہاں کے تعلیمی اداروں میں تقسیم کیا گیا۔

الیکشن ٹاؤن کمیٹی پنڈی بھٹیاں ۱۹۳۲ء :

صوبائی الیکشن کے دو سال بعد جنوری ۱۹۳۲ء میں ٹاؤن کمیٹی پنڈی بھٹیاں کے انتخابات ہوئے تو (۱) میاں دوست محمد خاں بھٹی۔(۲) میاں محمد حسین بھٹی۔(۳) چوہدری عبدالحق (لودھرا) (۴) لالہ تلسی داس پاہوہ (۵) لالہ خوشی رام کالڑہ اور بلحاظ عہدہ ڈاکٹر دیوان چند ممبر منتخب ہوئے۔ بلدیہ کی صدارت ایک مرتبہ پھر مسلمانوں سے چھن کر ہندوؤں کے پاس چلی گئی اور ساہوکار لالہ خوشی رام کالڑہ ٹاؤن کمیٹی کے پریذیڈنٹ منتخب ہو گئے۔(۵۲)

مقامی مسلمانوں کی ناگفتہ حالت :

یہ وہ زمانہ تھا جب پنڈی بھٹیاں اور گردونواح کے عام لوگوں کی سماجی حالت انتہائی قابل رحم اور افسوسناک حد تک ناگفتہ بہ تھی۔یہاں کا جاگیردار طبقہ اپنی من مانی کارروائیوں میں اپنے ذرائع اور وسائل کے اعتبار سے آمرانہ رویہ اختیار کیے ہوئے تھا۔غریب عوام سے جبراً بیگار لی جاتی تھی اور ان کی عزت نفس کا ان کو کوئی پاس نہ تھا۔تعلیمی لحاظ سے عام مسلمان ابھی بہت پیچھے تھے۔اہل ہنود جو علاقے کی کل آبادی کا ایک تہائی تھے اپنی دولت اور تعلیم کی وجہ سے بڑی حد تک محفوظ تھے۔لیکن غریب مسلمانوں کی حالت زار کا قصہ بڑا دردناک تھا۔علاقے کی تمام تجارت پر ہندوؤں کا قبضہ تھا۔ قصبہ پنڈی بھٹیاں اور جلالپور میں پانچ چھ مسلمان دکاندار تھے اور وہ بھی زیادہ تر کرایہ دار تھے۔اکثر مسلمان ہندو ساہوکاروں کے قرض دار رہتے۔ذرائع مواصلات کی کمی کے باعث بھی علاقے کی ترقی کی راہیں ابھی چاروں طرف سے کھلی نہیں تھیں۔صرف ایک پختہ سڑک لاہور تا سرگودھا تعمیر ہوئی تھی۔ٹرانسپورٹ کے شعبے میں بھی ہندوؤں کی اجارہ داری قائم تھی۔اس دوران ایک مقامی مسلمان محمد بخش ڈھیرہ نے چار ہزار روپے میں خرید کر بس چلائی بھی مگر کچھ عرصہ بعد یہ بند ہو گئی۔ لاہور جاتے ہوئے سکھیکی کے قریب نہر کے پل پر اس کے آگے بیٹھا ہوا ایک شخص اس کے ٹائر کے نیچے آکر مر گیا تھا۔اس وقت بسوں میں بیٹری کے ذریعے روشنی کرنے کا بندوبست نہیں ہوا کرتا تھا۔اس شخص کے مرنے کے بعد یہ بس چلنی بند ہو گئی۔بعد ازاں ایک اور مسلمان شیخ لال حسین

ودہاون نے بھی ٹرانسپورٹ سروس شروع کی لیکن یہ بھی زیادہ دیر نہ چل سکی- پھر ہندو ٹرانسپورٹر ہی اس شعبہ میں چھائے رہے- سرداری لال یہاں کا مشہور ٹرانسپورٹر تھا- یہاں یہ بات بڑی دلچسپ ہو گی کہ اس وقت کے ٹائر بڑے سخت اور بغیر ٹیوب کے ہوتے تھے اور اکثر سڑکیں غیر پختہ تھیں چنانچہ دوران سفر بس اتنی اچھلتی کودتی تھی کہ مسافروں کا برا حال ہو جاتا تھا- بعض اوقات تو ان کے سر بس کی چھت سے ٹکرا کر پھٹ جاتے تھے- چنانچہ سرکاری ڈسپنسر کی یہ ڈیوٹی ہوتی تھی کہ جب کوئی بس اڈے پر آکر رکے تو وہ فوری طور پر ابتدائی طبی امداد کا سامان لے کر وہاں پہنچ جاتا اور جن مسافروں کے سر بس کی چھت سے ٹکرا ٹکرا کر زخمی ہو جاتے ان کی مرہم پٹی کرتا- یہ سلسہ اس وقت تک جاری رہا جب تک ٹائر میں ٹیوب نہ آگئی اور سڑکیں پختہ نہ ہو گئیں-(۵۳) اس وقت پنڈی بھٹیاں تا لاہور آٹھ آنے کرایہ ہوتا اور سوا روپے میں کل گاڑی مل جاتی تھی-

اس زمانے میں علاقے کی فرقہ ورانہ صورتحال کی طرف نظر کی جائے تو یہاں آریہ سماجیوں کی انتہا پسندانہ سرگرمیاں وقتاً فوقتاً جاری تھیں-۱۹۲۵ء کے قریب جلالپور بھٹیاں میں ہندوؤں کے کچھ مبلغوں نے آکر ستیار تھ پرکاش کی تبلیغ کی- اس کتاب میں چونکہ مسلمانوں اور اسلام کے خلاف زہر اگلا گیا تھا اس لیے اس کے خلاف یہاں کے مسلمانوں میں رد عمل پیدا ہوا- پنڈی بھٹیاں میں بھی کچھ اس نوعیت کی سرگرمیاں ہوتی رہیں- ان تمام حالات کی عکاسی مقامی شاعر شیخ محمد اصغر منشا (مرحوم) نے اپنی مشہور نظم وجود مسعود میں یوں کی تھی-

یہ وہ دن تھے کہ جب انساں پہ انساں کی خدائی تھی
جدھر دوڑاؤ نظریں کج روی تھی بے حیائی تھی!
جفا کا دور دورہ تھا ستم کا بول بالا تھا
میرے قصبے کا یہ انداز دنیا سے نرالا تھا
کہاں جرات کہے کوئی کچھ ان عشرت پسندوں سے
کہ ازلی بیر تھا ان کو خدا کے نیک بندوں سے
غریبوں کی دل آزاری تھا صبح و شام کام ان کا
اسی ڈر سے تھا ہر فرد و بشر گویا غلام ان کا

عوامی شعور کا پہلا مظاہرہ :

ان بدترین سماجی و معاشی حالات نے پنڈی بھٹیاں کے مسلمانوں کو اس بات پر مجبور کر دیا تھا کہ وہ مقامی طور پر اپنی ایک نمائندہ تنظیم قائم کریں- چنانچہ اپریل ۱۹۳۲ء میں چند متوسط اور غریب

مسلمانوں نے انجمن اصلاح المسلمین کے نام سے ایک جماعت قائم کی۔ اگلی کئی دہائیوں تک یہ انجمن مقامی مسلمانوں کی سماجی و تعلیمی پسماندگی کو دور کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی نمائندگی کا بھی صحیح صحیح حق ادا کرتی رہی۔

انجمن کی دی ہوئی طاقت اور شعور کا پہلا مظاہرہ جاگیرداروں کے ایک کمی جمعہ نامی پاؤلی (جولاہا) نے کیا۔ اس وقت دوست محمد بھٹی ٹاؤن کمیٹی کے چیئرمین تھے۔ اس دوران ایک دفعہ تحصیلدار دورے پر آیا۔ گرمیوں کے دن تھے اور بجلی اس وقت شہر میں ہوتی نہیں تھی۔ اس لیے دوست محمد بھٹی نے تحصیلدار کو ہاتھ سے پنکھا جھلنے کے لیے جمعہ پاؤلی کو اس خدمت پر مامور کردیا۔ یہ ایک معمول تھا کہ جب کبھی سرکاری افسر یہاں آتا تو ان کی خدمت پر ایسے غریب کمی لوگوں کو سارا سارا دن مامور رکھا جاتا اور اس خدمت کے عوض ان کو معاوضہ نہ دیا جاتا۔

انجمن اصلاح المسلمین کے کارکنوں نے جمعہ پاؤلی کو اس کے حقوق کا احساس پہلے ہی دلایا دیا تھا۔ چنانچہ جب تحصیلدار کی سارے دن کی خدمت سے فارغ کیا گیا اور تحصیلدار واپس جانے لگا تو اس نے اپنی خدمت کا معاوضہ طلب کیا۔ تحصیلدار بڑا پریشان اور شرمندہ ہوا اور پاس بیٹھے چیئرمین کی طرف ناراض نظروں سے دیکھا۔ اس پر انہیں بڑی ندامت اٹھانا پڑی۔ لیکن جمعہ پاؤلی اپنے حق کی طلبی پر ڈٹا رہا۔ یہ تھی شعور اور حق کی پہلی آواز جو صدیوں سے جاگیرداروں کے سماجی و اقتصادی دباؤ میں دبی چلی آرہی تھی۔ اب یہ آواز بلند ہوئی تو بلند ہوتی ہی چلی گئی۔

پوسٹ مارٹم کا عذاب :

اسی دوران ایک اور واقعہ یہ پیش آیا کہ کسی دیہات میں کوئی شخص قتل ہو گیا تو سب غریب غربا نوجوان بوڑھے چھپنے کی جگہ تلاش کرنے لگے۔ وجہ یہ تھی کہ جب علاقے میں کوئی قتل ہو جاتا تو پوسٹ مارٹم کے لیے لاش گوجرانوالہ لے جانا پڑتی تھی۔ بسوں گاڑیوں کی سہولت ہوتی نہ تھی اور نہ ابھی سڑکیں پختہ بنی تھیں۔ چنانچہ علاقے کے غریبوں کی شامت آجاتی اور یہ ان کی ذمہ داری تھی کہ وہ میت اٹھا کر گوجرانوالہ لے جائیں۔ انجمن اصلاح المسلمین نے اس جبر کے خلاف آواز اٹھائی اور کچھ آغا سعادت علی (بعد میں ایس پی کے عہدے سے ریٹائر ہوئے) ایس ایچ او ان غریبوں کے کام آیا۔ اس نے اس جبریہ روایت کو ختم کرتے ہوئے آئندہ کے لیے یہ حکم دے دیا کہ صرف مقتول کے لواحقین کی ذمہ داری ہوگی کہ وہ پوسٹ مارٹم کی غرض سے سواری کا بندوبست کریں۔

جبریہ شادی ٹیکس کا خاتمہ :

اس واقعہ کے ٹھیک تین سال بعد عوام کو ایک اور جبر سے نجات ملی۔ جب انجمن اصلاح المسلمین کے تیسرے سالانہ جلسہ ۱۹۳۶ء کے موقع پر مولانا ظفر علی خاں (ایڈیٹر روزنامہ زمیندار لاہور) یہاں تشریف لائے تو ان کے سامنے جلالپور بھٹیاں کے عوامی نمائندوں نے شکایت کی کہ وہاں کا جاگیر دار طبقہ ہر شخص سے شادی کے موقع پر (شادی خواہ لڑکی کی ہو یا لڑکے کی) ایک مخصوص رقم بطور جگا ٹیکس وصول کرتا ہے۔ مولانا ظفر علی خاں نے اپنی تقریر کے دوران اس استحصالی رسم اور سراسر ناجائز ٹیکس کی شدید ترین الفاظ میں مذمت کی اور عوام کو تلقین کی کہ وہ اس ظالمانہ ٹیکس کی ادائیگی سے انکار کر دیں۔ جلسہ میں بیٹھے ہوئے جلالپور بھٹیاں کے ایک جاگیر دار نے مداخلت کی کوشش کی لیکن مولانا ظفر علی خاں کی تابناک اور گرج دار آواز میں دب کر رہ گئی۔ وہ لوگ جلسہ میں تو کوئی جرات نہ کر سکے۔ البتہ انہوں نے اپنے پروردہ غنڈوں کو جلالپور کے باہر متعین کر دیا کہ جن لوگوں نے انجمن کے جلسہ میں ہماری بے عزتی کروائی ہے انہیں ٹھیک کرو۔ چنانچہ سیدار شاد حسین شاہ گیلانی اور مستری غلام علی وغیرہ جب یہ کارکن واپس لوٹے تو شہر سے باہر ان پر حملہ کیا گیا کچھ کارکن شدید زخمی ہوئے۔ اس واقعہ کی مولانا ظفر علی خاں نے اپنے اخبار
زمیندار میں اداریے کے ذریعے شدید مذمت کی۔ (۵۴) بعد میں مقدمہ چلا اور عدالتی فیصلہ یہ ہوا کہ یہ ناجائز ٹیکس ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا گیا۔ بعد میں یہ کارکن انجمن اشاعت اسلام جلالپور کے تحت منظم ہو کر استحصالی قوتوں کے خلاف ایک عرصہ تک نبرد آزما رہے اور دینی تعلیمی اور رفاہی سرگرمیوں کو جاری رکھا۔

یہ حریت پسندی، یہ شجاعت ہم نواؤں کی
جھکا دیں گردنیں جنہوں نے قصبہ کے خداؤں کی
(منشا)

مذہبی رواداری :

اس کے ساتھ ساتھ انجمن اصلاح المسلمین مقامی مساجد کی دیکھ بھال، پرائمری سکول اور لائبریری کو جاری کر کے اور انجمن حمایت اسلام لاہور کی مدد سے مبلغین بلوا کر غیر مسلموں کے پروپیگنڈے کا توڑ کرنے کے ذریعے بھی مقامی مسلمانوں کی خدمات بجالاتی رہی۔ یوں تو اس زمانے میں مجموعی طور پر قصبہ میں مذہبی رواداری عام تھی جیسا کہ ۱۹۳۳ء میں مقامی مسلمانوں نے شب معراج کے حوالے سے ایک جلسہ منعقد کیا تو اس میں دو ہندوؤں سردار پر تھی پال (ٹیچر) اور لالہ

رواداری کی یہ ایک شاندار مثال تھی- پھر بھی کبھی کبھار کوئی اکا دکا واقعہ رونما ہو جاتا کہ جس سے دونوں قوموں کے مابین کشمکش پیدا ہو جاتی لیکن یہ کشمکش کسی دنگے فساد کی صورت کبھی نہ اختیار کرتی- اس طرح کی صورت حال خود مسلمانوں کے دو فرقوں یعنی شیعہ اور سنیوں میں بھی پیدا ہو جاتی تھی لیکن اکثر افہام و تفہیم سے باہمی شکایات کو دور کر لیا جاتا-

الیکشن ٹاؤن کمیٹی پنڈی بھٹیاں ۱۹۳۴ء :

جدید سماجی تبدیلیوں کا یہ عمل شروع ہی ہوا تھا کہ ۱۹۳۴ء میں ٹاؤن کمیٹی پنڈی بھٹیاں کے انتخابات منعقد ہوئے-بلدیہ کی صدارت ایک مرتبہ پھر مسلمانوں کے ہاتھ آگئی اور میاں دوست محمد بھٹی صدر منتخب ہو گئے- جبکہ میاں محمد حسین بھٹی وائس پریذیڈنٹ بنے- دیگر ممبران میں لالہ خوشی رام، چوہدری عبد الحق لودھرا، میاں عطا محمد بھٹی (موجودہ ایم پی اے میاں انتصار حسین بھٹی کے دادا) اور ڈاکٹر جوالا رام بلحاظ عہدہ منتخب ہوئے- چوہدری عبد الحق بھٹیوں کے علاوہ کسی دوسری قوم سے منتخب ہونے والے پہلے مسلمان تھے-(۵۵)

الیکشن صوبائی اسمبلی (تحصیل حافظ آباد) ۱۹۳۷ء :

اس کے تین سال بعد ملک کے نئے آئین کے تحت ۱۹۳۷ء میں پنجاب صوبائی اسمبلی کے الیکشن ہوئے-اب سابقہ صوبائی حلقے کی وسعت کو کم اور ووٹرز کی تعداد کو بڑھا دیا گیا تھا-ان کی تعداد گزشتہ انتخاب کی نسبت سے تقریباً دوگنا ہو گئی تھی-اس الیکشن میں صوبائی حلقہ حافظ آباد، سکھیکی، کالیکے، رسولپور، جلالپور، پنڈی بھٹیاں اور علی پور کے علاقہ جات پر مشتمل تھا اور یہاں سے پانچ امیدواروں کے درمیان مقابلہ ہوا- چوہدری ریاست علی چٹھہ جو یونینسٹ پارٹی کے امیدوار تھے بھاری اکثریت سے کامیاب ہوئے-اس حلقے میں مسلم لیگ کا کوئی امیدوار موجود نہیں تھا- یہاں کل مسلم ووٹر کی تعداد ۱۴۴۳۵ تھی اور ۲۹ء۸۰ کے تناسب سے ۴۳۰۲ ووٹرز نے ووٹ ڈالے تھے اور ان میں سے چوہدری ریاست علی چٹھہ نے ۳۹۳۹ ووٹ حاصل کئے تھے-ان کے قریبی مدمقابل مراد نقش کو صرف ۳۴۴ ووٹ حاصل ہو سکے تھے-اس علاقے سے ہندوؤں کی نشست پر ہندو الیکشن بورڈ اور سکھوں کی نشست پر خالصہ نیشنل بورڈ کا امیدوار کامیاب ہوا تھا-ان انتخابات میں زیادہ تر دیہاتی ووٹ پیروں اور جاگیرداروں کے زیر اثر رہے تھے-(۵۶)

زرعی بل کی تقسیم :

ان انتخابات کے نتیجے میں پنجاب میں یونینسٹ پارٹی کی وزارت قائم ہو گئی اور سر سکندر حیات وزیر اعظم بن گئے۔ انہوں نے سر چھوٹو رام کو وزیر مال مقرر کیا۔ سر چھوٹو رام رہتک کے پسماندہ ضلع سے تعلق رکھتے تھے۔ ذاتی طور پر لالہ ذہنیت رکھنے کے باوجود سود خور بنیوں کے زخم خوردہ ہونے کے باعث ان کے سخت مخالف تھے۔ انہوں نے غریب کسان اور بے کس مزارع کی حالت زار کو سنوارنے، سود خوروں کے چنگل سے آزاد کرانے اور استحصال کی بے رحم چکی میں پسنے والے مقروضین کو نجات دلانے کے لیے ایک کامیاب کوشش کی۔ انہوں نے غریب کسانوں کے تحفظ کے لیے پنجاب اسمبلی سے زرعی بل منظور کروایا۔ اس کے متعلق حاجی لق لق نے کہا تھا کہ زرعی بل ستارے ہیں اندھیری رات کے کیا کہنے ہیں جناب سکندر حیات کے، بل قانون کی شکل اختیار کر گیا۔ مگر بد قسمتی سے دلے کی بار کے دیہاتی لوگ ان پڑھ ہونے کے باعث ان مفید دفعات سے کماحقہ فائدہ نہ اٹھا سکتے تھے۔ چنانچہ پنڈی بھٹیاں میں انجمن اصلاح المسلمین نے جلالپور میں انجمن اشاعت اسلام اور سکھیکی میں انجمن انصار المسلمین نے اس کام کا بیڑا اٹھایا اور اس بل کا عام فہم اور اردو ترجمہ کرا کے ہزاروں کی تعداد میں پمفلٹ شائع کئے اور ان کے کارکن تمام دیہات میں پھیل کر کسان مزارع اور دیگر مقروض افراد کو ان قوانین کی تفصیل سے آگاہ کرتے رہے۔ نتیجتاً ہزاروں مقروض سود خوروں کے جابرانہ ہتھکنڈوں سے بچ گئے۔ (۵۷)

واردھا سکیم کے خلاف احتجاج :

اس عرصے میں ایک طرف تو پنجاب حکومت غریب آدمی کی فلاح کے لیے مصروف کار تھی تو دوسری طرف ہندوستان کے جو سات آٹھ صوبوں میں کانگرسی حکومتیں قائم ہوئی تھیں انہوں نے مسلمانوں کے مفادات کو سخت نقصان پہنچانا شروع کر دیا تھا۔ ان حکومتوں نے بندے ماترم کو قومی ترانہ قرار دے دیا اور واردھا اور ودیا مندر تعلیمی سکیم کے تحت مسلمانوں کی تعلیم، ان کے تمدن و معاشرت روایات اور زبان سب کو ختم کرنے کی کوشش کی گئی۔ پورے ہندوستان میں مسلمانوں نے اس اسکیم کے خلاف سخت احتجاج کیا۔ اس احتجاج میں پنڈی بھٹیاں اور گردونواح کے مسلمان بھی کسی سے پیچھے نہ تھے۔ چنانچہ ۱۸ اکتوبر ۱۹۳۸ء کو مسلمانوں کے ایک عام جلسے میں مندرجہ ذیل قرارداد منظور کی گئی۔

> ''مسلمانان پنڈی بھٹیاں کا یہ جلسہ گاندھی جی کی واردھا سکیم کے خلاف سخت نفرت کا اظہار کرتا ہے۔ یہ سکیم مسلمانوں کے لیے مذہبی مداخلت

کے علاوہ ان کے تمدن اور معاشرت کے لیے ضرب کاری ہے۔" (۵۸)

قائداعظم کے منصوبہ کی حمایت :

اس کے دو ماہ بعد سندھ صوبائی مسلم لیگ نے اکتوبر ۱۹۳۸ء میں ایک کانفرنس بمقام کراچی منعقد کی۔ جس کی صدارت قائداعظم رحمتہ اللہ نے فرمائی۔ کانفرنس نے ایک قرارداد کے ذریعے یہ سفارش کی کہ ایک ایسا دستوری خاکہ بنادیا جائے جس کے مطابق مسلمان مکمل آزادی حاصل کر سکیں اور کل ہندوفاق کے منصوبے کو ختم کر دیا جائے۔ اس وقت تک پنڈی بھٹیاں میں مسلم لیگ کی کوئی شاخ وجود میں نہیں آئی تھی لیکن مقامی مسلمانوں کی نمائندگی کا فریضہ انجمن اصلاح المسلمین پورے طور پر نبھا رہی تھی۔ چنانچہ سندھ مسلم لیگ کی قرارداد کے منظر عام پر آتے ہی اس نے ایک اجلاس منعقدہ اکتوبر ۱۹۳۸ء میں اس کی حمایت و تائید میں درج ذیل قرارداد منظور کی۔

> "یہ اجلاس مسلم لیگ کے مورخہ ۸ اکتوبر کراچی کے منعقدہ اجلاس میں مسٹر جناح نے مسلم فیڈریشن اور ہندو فیڈریشن کی جو معقول تجویز پیش کی ہے۔ اس پر مسرت کا اظہار کرتا ہے اور اس کی مکمل تائید و حمایت کرتا ہے۔" (۵۹)

مسلم لیگ کے تاریخی اجلاس ۱۹۴۰ء لاہور میں شرکت :

اس کے ٹھیک ایک سال بعد کانگریس کی صوبائی وزارتیں مستعفی ہو گئیں اور مسلمانوں نے اس پر یوم نجات منایا۔ اب برصغیر کے مسلمانوں کی نمائندہ جماعت مسلم لیگ نے اپنی تنظیم نو کی طرف پورا دھیان دینا شروع کیا۔ اسی دوران ضلع گوجرانوالہ کے مختلف شہروں میں پرائمری لیگیں قائم ہونا شروع ہوئیں۔ جلالپور بھٹیاں میں تو مسلم لیگ کی شاخ ۱۹۳۷ء میں ہی قائم ہو چکی تھی مگر پنڈی بھٹیاں میں یہ کام دیر تک پایہ تکمیل کو پہنچا اور اس کا سرا بھی انجمن اصلاح المسلمین کے متوسط طبقے کے کارکنوں کے سر ہے کہ جنہوں نے اس پلیٹ فارم پر ہی یہاں لیگ کی شاخ قائم کی۔ اور جب ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور میں مسلم لیگ کا تاریخی اجلاس منعقد ہوا تو اس میں بھی اس کے کارکن اپنے طور پر شریک ہوئے۔ البتہ جلالپور بھٹیاں مسلم لیگ کی طرف سے آٹھ افراد کا ایک وفد میاں اسلم حیات بھٹی کی قیادت میں تاریخی اجلاس میں باقاعدہ حیثیت سے شریک ہوا۔ وفد کے دیگر ارکان میں شیخ نور محمد، محمد حسین زرگر، نور محمد درزی، حکیم فیض محمد، قاضی عبدالرسول اور میاں اصغر علی بھٹی وغیرہ شامل تھے۔ یہ کارکن باورچی اور دو دیگیں اپنے ساتھ لے کر گئے تھے اور تین

روز تک کھانا پکوا کر حاضرین کے طعام کا بندوبست کرتے رہے۔ اجلاس میں شرکت کے بعد واپس آ کر ان کارکنوں نے مسلم لیگ اور پاکستان کے پیغام کو گھر گھر پہنچانے کا باقاعدہ آغاز کر دیا۔ (۶۰)

پنڈی بھٹیاں میں کانگرسیوں کی تحریک ۱۹۴۲ء:

دوسری طرف مقامی کانگریس کی سرگرمیاں بھی کافی زوروں پر ہو چکی تھیں۔ یہاں کانگریس کی شاخ اگرچہ ۱۹۳۶ء میں قائم ہوئی تھی لیکن بعض انقلابی ہندوؤں نے اپنے قومی سیاسی خیالات کے باعث اس کو کافی تقویت پہنچا دی تھی۔ جن دنوں لاہور میں قرارداد پاکستان منظور ہوئی تھی۔ اس زمانے میں پنڈی بھٹیاں کانگریس کے صدر حویلی رام سچدیو کے گھر کو مقامی انگریز پرست جاگیرداروں نے آگ لگوا دی تھی۔ اس میں خود حویلی رام زخمی ہو گئے تھے اور ان کا مکان جل کر خاکستر ہو گیا تھا۔ اس واقعہ کے چند دنوں بعد ہی یہاں کانگریس کا جلسہ اندرون غلہ منڈی میں پنجاب کانگریس کے صدر ستیہ پال کی صدارت میں منعقد ہوا تو اس میں اس واقعہ کی مذمت کی گئی۔ کانگریس کی سرگرمیوں کو مقامی طور پر بوٹا رام کالڑہ، مہاشہ برکت رام، جیون پرکاش جیون، ہرکشن لال اور مسٹر غلام رسول کامریڈ جیسے کارکنوں نے بھی جلا بخشی تھی۔ کانگریس کی وطن پرست سرگرمیوں کے دوران ہی یہاں کے ایک کارکن پنڈی داس نے سرکاری سکول میں Up Up the Union jack کی بجائے Down Down the Union Jack یعنی برطانیہ کا جھنڈا جھک جائے کا نعرہ لگایا۔ اس پر اسے سخت سزا دی گئی۔ یہ وہ دن تھے جب کانگریس نے ہندوستان بھر میں دوسری جنگ عظیم کے دوران انگریزو ہندوستان چھوڑ دو تحریک شروع کی ہوئی تھی۔ کانگریس کے رہنما مہاتما گاندھی نے سب کانگرسیوں کو یہ حکم دیا ہوا تھا کہ وہ گھر پر کچھ وقت چرخہ کاتا کریں اور اس سوت سے جولاہوں سے کھدر بنوا کر اس کے کپڑے سلوا کر پہنیں۔ اس حکم کے تحت پنڈی بھٹیاں کانگریس کے جو عہدے دار تھے ان میں اکثر روز سوت کاتتے اور دیسی کپڑے پہنتے۔ انہوں نے انگریزی مال کا مکمل بائیکاٹ کیا تھا۔ چنانچہ ایک روز کانگریس کی مقامی شاخ کے صدر حویلی رام سچدیو جو کپڑوں کا کاروبار کرتے تھے اپنی دکان سے سارا انگریزی کپڑا نکال کر اندرون غلہ منڈی میں لے آئے اور اسے اکٹھا کر کے آگ لگا دی۔ ۱۹۴۲ء میں جب انڈین کانگریس نے انگریزی حکومت کا تختہ الٹنے کے لیے ستیہ گرہ کا وچار کیا تو انفرادی طور پر سب کانگریسی ورکروں کو مطلع کر دیا گیا تھا کہ جو گھر پر اچھا سوت کات سکتا ہے وہ ہی ستیہ گرہ میں شامل ہو سکتا تھا اور اس کو ہی جیل میں جانے کی اجازت ملتی کیونکہ انگریز حکومت اس زمانے میں جنگ عظیم دوم کے لیے لوگوں کو فوج میں بھرتی کر رہی تھی اور کوئی اتنا ہی کہہ دیتا کہ کوئی ہندوستانی انگریز حکومت کی مدد کرنے کے لیے فوج میں بھرتی نہ ہو صاف انکار کر

دے۔ تو اس کو اسی وقت گرفتار کر لیا جاتا تھا کیونکہ اتنا کہنے پر ہی وہ وطن کا باغی خیال کر لیا جاتا تھا اور جیل میں بنا کوئی فرد جرم لگائے بند کر دیا جاتا تھا جس کے لیے نہ کوئی وکیل، نہ دلیل اور نہ ہی اپیل ہو سکتی تھی۔ انگریز سرکار جتنی دیر چاہتی ان کو جیل میں بند کر سکتی تھی۔

اس وقت کئی مقامی کانگریسی ورکروں کے نام ان کے کاتتے ہوئے سوت کے نمونوں کے ساتھ آل انڈیا نیشنل کانگریس کے مرکزی دفتر بھیجے گئے۔ وہاں سے جن ورکروں کو ستیہ گرہ کی اجازت ملی صرف انہوں نے ہی گرفتاری دی۔ چنانچہ پنڈی بھٹیاں میں گرفتاری پیش کرنے والوں میں (۱) ہر کشن لال سچدیو۔ (۲) کرشن لال سچدیو۔ (۳) بھگوان داس کھرانا۔ (۴) غلام رسول کامریڈ۔ (۵) جیون پرکاش جیون شامل تھے۔ یہ ستیہ گرہ بھی اپنی نوعیت کا بڑا انوکھا اور نرالا تھا۔ اس میں ایک وقت صرف ایک ہی ستیہ گر گرفتاری کے لیے جا سکتا تھا۔ اس لیے سب کی باری باندھ دی گئی۔ جس دن ستیہ گرہی نے گرفتاری دینی ہوتی اس دن سارے قصبہ میں منادی کر دی جاتی اور اندرون غلہ منڈی میں جلسہ ہوتا اور اس میں اس ستیہ گرہی کے نام کا اعلان کر کے اسے پھولوں کے ہاروں سے سجادیا جاتا۔ سب سے پہلے کچھ شعرا جو باہر سے بھی آئے ہوتے اور مقامی بھی ہوتے وہ نغمے اور نظمیں سنا کر لوگوں میں جوش بھرتے اور بعد میں ایک جلوس کی شکل میں ستیہ گرہی خود بخود پولیس سٹیشن پر پہنچ کر اپنی گرفتاری دے دیتا۔ یہ ستیہ گری (عدم تعاون) پرامن ہوتا۔ ستیہ گرہوں کو گرفتار کر کے گوجرانوالہ کی سنٹرل جیل رکھا گیا۔ اس تحریک کے دوران لاہور سے استاد دامن، سرگودھا سے رام لبھایا طائر، لائل پور سے کیدار ناتھ باغی، گوجرانوالہ کے ہرنام سنگھ باغی کے علاوہ کوٹ نکہ کے میلارام اور پنڈی بھٹیاں کے جیون پرکاش جیون اور ہرکشن لال سچدیو اپنی پنجابی انقلابی نظموں سے کانگریس کے جلسوں کو رونق بخشتے رہے۔ انہی دنوں یہاں یہ پنجابی شعر بڑا مشہور ہوا تھا۔(۶۱)

سانو ہن راج دھکے شاہی دا نہیں چاہی دا
بھنیا بو تھاڑ اساں اس گورا شاہی دا

پتاتوڑ سبھا کا قیام:

کانگریسیوں کی ان سیاسی سرگرمیوں سے قطع نظر اگلے ایک دو برسوں میں کچھ ایسے واقعات رونما ہوئے کہ جن کے باعث پنڈی بھٹیاں کے عوام میں قدرے بے چینی رہی۔ ایک واقعہ مئی ۱۹۴۳ء میں پیش آیا کہ ایک ساہوکار لالہ سرداری لال کالڑہ نے مسلمانوں کے قدیم قبرستان کے ایک حصے کو کھود کر اپنے باغیچہ میں ملانا شروع کر دیا۔ قبروں کی بے حرمتی سے مسلمانوں میں سنسنی

پھیل گئی اور انہوں نے اس حرکت پر سخت احتجاج کیا- بعد میں ڈپٹی کمشنر گوجرانوالہ کی مداخلت سے معاملہ فرو ہو گیا- اس کے ایک سال بعد یعنی اپریل ۱۹۴۴ء میں ایک حرکت آریہ سماجیوں کے سالانہ جلسے کے موقع پر کی گئی- یہ وہ زمانہ تھا جب پاکستان کی تحریک روز بروز ترقی کرتی جا رہی تھی- چنانچہ آریہ سماج کے مقامی سالانہ جلسہ میں ایک اوپدیشک نے اپنی تقریر میں مطالبہ پاکستان کی پرزور مخالفت کی- آریہ سماجیوں کی طرف سے مطالبہ پاکستان کی مخالفت کوئی نئی بات نہیں تھی مگر ہندو اوپدیشک نے اس آڑ میں مذہب اسلام کی شان میں گستاخانہ الفاظ استعمال کئے- مسلمانوں کی نماز کو اوٹھک بیٹھک سے تشبیہ دی- اس پر مقامی مسلمانوں میں ہیجان پیدا ہوا- چنانچہ مقامی مسلمانوں کے نمائندوں کا ایک غیر معمولی اجلاس فوری طور پر طلب کیا گیا اور فیصلے کے مطابق آریہ سماج کے مقامی صدر کے نام ایک خط کے ذریعے احتجاج کیا گیا- اس احتجاجی مراسلے میں لکھا گیا تھا کہ !

> "زمانہ تو اس امر کا متقاضی ہے کہ ہندو مسلم اتحاد پر زور دیا جائے- امن و صلح کی فضا پیدا کی جائے اور ایسی حرکات سے کلی اجتناب کیا جائے کہ وہ کسی مذہب کی دل آزاری، اشتعال انگیزی، تفرقہ بازی یا امن عامہ کے فعل کا باعث ہوں-"

آریا سماج کے صدر نرائن داس نے بھی اس خط کے جواب میں نیک نیتی کا ثبوت دیا پھر دونوں فرقوں کی نمائندہ جماعتوں کے طویل مذاکرات ہوئے جس میں دونوں اطراف سے آئندہ کسی معترض فعل سے اجتناب کرنے کا عزم کیا گیا- رواداری کے ساتھ معاملے کو نبٹانے کے بعد دونوں اطراف کے نمائندوں پر مشتمل ایک مشترکہ کمیٹی "پتا توڑ سبھا" کے نام سے تشکیل دی گئی- مسلمانوں کی طرف سے (۱) پیر علی حسین شاہ (۲) شیخ چراغ دین پھپھرہ (۳) میاں غلام محمد مسن (۴) شیخ محمد حسین ودہاون (۵) بابا رحمت (۶) باو علی محمد جبکہ ہندوؤں کی طرف سے (۱) رائے صاحب لالہ حکومت رائے پنشنر (۲) لالہ رلیارام پنشنر (۳) لالہ نرائن داس (۴) لالہ جوندہ مل کالڑہ (۵) لالہ بوڑامل کالڑہ اس متحدہ و متفقہ کمیٹی میں شامل کئے گئے- سبھا کا اصل مقصد اہالیان شہر کی تکالیف اور مسائل کو دور کرنا تھا- مثلاً چینی، کپڑا، تیل مٹی، صفائی، روشنی، پہروں کے معاملات میں بہت سی اصلاحات ہونے والی تھیں- دراصل یہ قحط سالی اور جنگ عظیم دوم کا زمانہ تھا اور چینی، کپڑے اور مٹی کے تیل کی قلت کے باعث عوام بالخصوص مسلمان بہت پریشان تھے- کیونکہ کنٹرول شدہ اشیاء کے سو فیصد ڈپو غیر مسلموں کے ہاتھوں میں تھے- کپڑے کی ان دنوں اتنی قلت و نایابی تھی کہ بعض اوقات تو مردوں کے لیے کفن تک نہ ملتا تھا- مسلمان عورتوں کو برقعوں کے لیے کپڑے کا حصول بھی بہت کٹھن ہو چلا تھا- مٹی کا تیل تو نایاب ہو گیا- چونکہ یہاں کے اکثر لوگ پیشہ

ور تھے- مثلاً سنار، لوہار، راج، سراج، موچی، درزی، جو جاڑے کی لمبی راتوں میں خوب کام کرتے تھے- مگر باوجود کثرت کام کے بے کار ہو گئے تھے کیونکہ مٹی کے تیل کی نایابی کے باعث وہ رات کے اندھیرے میں کام کرنے کے قابل نہ رہے تھے- ایسے عدیم النظیر خوفناک اور مہیب قحط کے دوران میں بے کار رہنا ان کی مالی مشکلات میں اور بھی اضافے کا باعث بن گیا تھا- (۶۲)

ادھر بنگال میں بھی اس صدی کا سب سے سنگین قحط پڑا ہوا تھا- ملک کی سماجی و سیاسی انجمنوں نے ان کی مدد کے لیے فنڈز قائم کر دیئے تھے- پنڈی بھٹیاں کے مسلمانوں نے اپنی پریشان حالی کے باوجود بنگال کے عوام کی مدد کے لیے رقم جمع کی اور انجمن اصلاح المسلمین کے ذریعے نواب افتخار حسین ممدوٹ کی وساطت سے مسلم لیگ کے بنگال ریلیف فنڈ میں جمع کرایا-

قائداعظم کی حمایت کی قرارداد :

ان مقامی حالات سے ہٹ کر قومی سطح پر اس زمانے میں دوسری جنگ عظیم عروج پر پہنچ کر اپنے اختتام کی طرف جا رہی تھی اور انگریزی حکومت ہندوستان کے اس وقت کے پیچیدہ سیاسی آئینی مسائل کے حل کے لیے بھی کوششیں کر رہی تھی- انہیں کوششوں کے ضمن میں ۱۹۴۲ء میں پہلے کرپس مشن ہندوستان آیا- پھر ۱۹۴۵ء میں وائسرائے ہند لارڈ ویول کی طرف سے ایک دستوری منصوبہ پیش کیا گیا- اس منصوبے کی تفصیل میں جائے بغیر ایک شق اس میں ایسی تھی کہ جس کے تحت ہندوستان کی قوموں کے نمائندوں پر مشتمل ایک عبوری کونسل مقرر کی جانی تھی- کانگریس اس نکتے پر بضد تھی کہ مسلم لیگ مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت نہیں ہے- لہٰذا اس کونسل میں ایک مسلمان نمائندہ مقرر کرنے کا اختیار اسے بھی حاصل ہونا چاہیے- دوسری طرف مسلم لیگ اور قائداعظم کانگریس کے اس نکتے کو تسلیم کرنے پر ہرگز تیار نہ تھے- ان کا موقف یہ تھا کہ مسلم لیگ ہی ہندوستان کی وہ واحد جماعت ہے جسے مسلمانوں کی نمائندگی کرنے کا حق حاصل ہے- مسلم لیگ کا یہ دعویٰ مبنی بر حق تھا- چنانچہ پنڈی بھٹیاں کے مسلمانوں کے نمائندوں نے ۶ جولائی ۱۹۴۵ء کو اپنے ایک اجلاس میں قائداعظم کے موقف کی مکمل حمایت کی قرارداد منظور کی- قرارداد میں کہا گیا کہ مسلم ایگزیکٹو کونسلر کے انتخاب کا حق صرف مسلم لیگ کو ہی ہے جو کہ مسلمانوں کی واحد نمائندہ اور ترجمان سیاسی جماعت ہے- اس قرارداد کی نقول وائسرائے ہند اور قائداعظم کو ارسال کی گئیں- جس اجلاس میں مذکورہ قرارداد منظور کی گئی اس کی صدارت انجمن اصلاح المسلمین کے سینئر وائس پریذیڈنٹ شیخ چراغ دین پھپھڑہ نے کی تھی- اس نوعیت کی اور قرارداد انجمن اور مسلم لیگ کی مقامی شاخ کی طرف سے ۳۱ جولائی کو پاس کی گئی جس میں کہا گیا کہ

"انجمن ہذا شملہ کانفرنس میں آل انڈیا مسلم لیگ کی اختیار کردہ پالیسی اور طرز عمل کی پرزور تائید کرتی ہے اور اس پالیسی کو مسلمانوں کے صحیح جذبات واحساسات کا سچا مرقع اور حقیقی تصویر خیال کرتی ہے اور آل انڈیا مسلم لیگ اور قائداعظم پر کلی اعتماد کا اظہار کرتی ہے۔"(۶۳)

اس قرارداد کی نقول بھی وائسرائے ہند اور قائداعظم کو ارسال کی گئیں۔ پورے برصغیر کی مسلمان انجمنوں اور تنظیموں کی طرف سے اس طرح کی قراردادیں حکومت تک پہنچنا شروع ہوئیں تو اسے اس حقیقت کو تسلیم کرنا پڑا کہ آل انڈیا مسلم لیگ ہی ہندوستان کے مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہے۔

☆☆☆
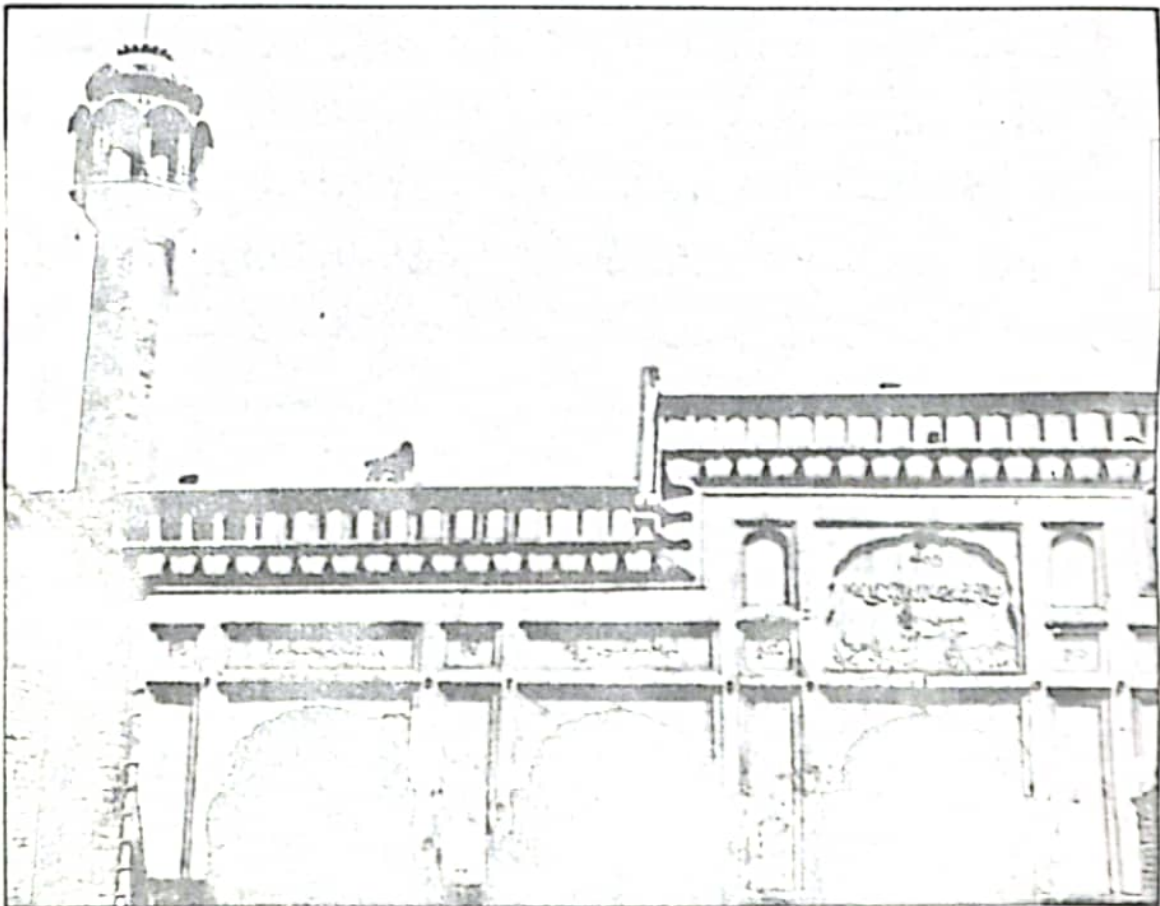
عہد شاہجہاں کی شاہی مسجد (پنڈی بھٹیاں) تعمیر نو سے قبل

تحریک پاکستان میں کردار

انتخاب ۱۹۴۶ء :

بہر حال سیاسی مصالحت کرانے میں شملہ کانفرنس ناکام ہوئی تو نئے انتخابات کرانے کا اعلان کر دیا گیا- یہ انتخابات بڑی اہمیت کے حامل تھے- کیونکہ ان کے نتائج نے ثابت کرنا تھا کہ مسلم لیگ مسلمانان ہند کی واحد نمائندہ جماعت ہونے کی حقدار ہے یا نہیں- یہ انتخابات جداگانہ طرز پر ہونا تھے اور گزشتہ انتخابات سے اس لیے مختلف تھے کہ اب مسلم لیگ پنجاب میں یونینسٹ جاگیرداروں کی مخالفت کے باوجود عام مسلمانوں میں کافی مقبول ہو چکی تھی- انتخابی عمل کا آغاز ہوا تو تحصیل حافظ آباد کے حلقے (جس میں پنڈی بھٹیاں، جلالپور، رسول پور، کالیکی، سکھیکے، کولو تارڑ کے علاقے بھی شامل تھے) سے چوہدری ارشاد اللہ تارڑ (سکنہ رسولپور تارڑ) نے پنجاب مسلم لیگ انتخابی بورڈ کو ٹکٹ کے لیے درخواست دی- ان کی خدمات اور علاقے میں اثر و رسوخ کے باعث ان کا امیدوار بننا یقینی تھا مگر اپنے قریبی رشتہ دار راج محمد تارڑ کے حق میں دستبردار ہو گئے- اس کی وجہ یہ تھی کہ یونینسٹ پارٹی نے راج محمد تارڑ کو پیر محل کے علاقے میں چند مربع زمین اور رجسٹرار کی نوکری کا لالچ دے کر اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کی تھی- اس سے پہلے کہ راج محمد تارڑ اس لالچ میں آنے کو تیار ہو جاتے برادری کے ایک اجلاس میں راج محمد تارڑ کے حق میں فیصلہ ہو گیا کہ وہ مسلم لیگ کا ٹکٹ حاصل کریں گے- چنانچہ ارشاد اللہ تارڑ ان کے حق میں دستبردار ہو گئے- بلاشبہ راج محمد تارڑ بھی برادری کے ایک بااثر شخص تھے- ان کے مقابلے میں یونینسٹ پارٹی نے خان بہادر غلام محمد کو اپنا امیدوار بنا لیا جبکہ عطا اللہ خاں ذیلدار بھی اس انتخابی میدان میں آزاد امیدوار کی حیثیت سے کود پڑے-(۶۴)

حلقے کی انتخابی مہم :

چونکہ یہ انتخابات پاکستان کے مطالبے کی بنیاد پر لڑے جا رہے تھے اس لیے مسلم لیگ کی انتخابی مہم کا آغاز بڑے جوش و خروش کے ساتھ ہوا- مہم کے دوران اسلامیہ کالج لاہور کے طالب علموں کا ایک گروپ حلقے میں جگہ جگہ جا کر رائے عامہ ہموار کرتا رہا- ان طالب علموں میں احمد یار لک بھی شامل تھے جو قیام پاکستان کے بعد قومی اسمبلی کے رکن بنے- ان کی جوشیلی تقریروں نے مسلم

لیگ کی انتخابی مہم میں خوب جان پیدا کر دی تھی -اس دوران حلقے میں تین بڑے انتخابی جلسے بھی ہوئے- پہلا جلسہ حافظ آباد میں ہوا جس سے نواب افتخار حسین ممدوٹ اور میاں ممتاز دولتانہ نے خطاب کیا- دوسرا جلسہ جلالپور بھٹیاں میں ہوا- اس سے ممدوٹ کے علاوہ سردار شوکت حیات اور فضل الٰہی پراچہ نے خطاب کیا-

جبکہ تیسرا بڑا جلسہ پنڈی بھٹیاں میں مسجد عاقل والی (لاہور روڈ) میں ہوا- اس جلسے سے خطاب کے لیے جناب فیرور خان نون (سابق وزیر اعظم پاکستان) خاص طور پر لاہور سے تشریف لائے تھے- اس روز یہاں شدید بارش ہوئی تھی اور یہ خدشہ پیدا ہو گیا تھا کہیں جلسہ ناکام نہ ہو جائے- کیونکہ بارش کی وجہ سے دیہاتی راستوں میں بڑی دلدل بن گئی تھی اور لوگوں کے آنے میں مشکلات تھیں- اسی خدشے کے پیش نظر مسلم لیگی امیدوار چوہدری راج محمد تارڑ نے لیگی کارکن غلام محمد فاروقی کو دو دیگر کارکنوں کے ہمراہ لاہور کی طرف روانہ کر دیا کہ فیروز خان نون صاحب کی گاڑی راستے میں جہاں کہیں بھی ملے انھیں روک کر اطلاع دی جائے کہ بارش کے باعث جلسہ ناکام ہونے کا خدشہ ہے لہذا آپ یہاں تشریف نہ لائیں- چوہڑکانہ کے قریب ان کارکنوں کا سامنا جناب فیروز خان نون کی گاڑی سے ہو گیا- انھوں نے روک کر راج محمد تارڑ کا پیغام ان تک پہنچایا مگر نون صاحب نے واپس جانے سے انکار کر دیا اور جواب دیا کہ وہ جلسہ ضرور کر کے جائیں گے کیونکہ اپنے بزرگ (میاں خیر محمد نون مدفون پنڈی بھٹیاں) کے شہر جا رہے ہیں- اب وہ ہرگز واپس نہیں جائیں گے- چنانچہ جب وہ یہاں پہنچے تو دیکھتے ہی دیکھتے مسجد کا پورا صحن اور باہر والا حصہ لوگوں سے کھچا کھچ بھر گیا- بارش بھی رک گئی- اس پرجوش ہجوم نے ان کا فقید المثال استقبال کیا- مسلم لیگ نیشنل گارڈ کے باوردی کارکنوں نے فیروز خان نون کو سلامی پیش کی- ان کارکنوں میں قاضی شیر احمد، محمد یوسف صاحب، غلام محمد پاکستانی، مہر عبدالکریم، مولا بخش مسن، محمد رفیق پھپھرہ، محمد بشیر مسن، قاضی محمد حسین، میاں نوازش علی بھٹی، نذیر احمد سراج، شیخ مقبول الٰہی وغیرہ شامل تھے- مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کی مقامی شاخ کے کارکن بھی انتظام اور نعرہ بازی میں کسی سے پیچھے نہ تھے- ان کے جوش و ولولے سے خوش ہو کر جناب فیروز خان نون نے ان کو بیس روپے انعام بھی دیا جو لیگی کارکن سائیں اسماعیل ڈھیرہ کے بیٹے خلیل احمد نے وصول کئے تھے- فیروز خان نون نے پنجابی میں تقریر کی اور میاں خیر محمد نون کا واسطہ دے کر لوگوں سے اپیل کی کہ وہ اس بزرگ ہستی کے صدقے مسلم لیگ اور اسلام کو ووٹ دیں- اس جلسے کے بعد علاقے کے مسلمانوں میں بڑا جوش و خروش پیدا ہو گیا- کارکن گاؤں گاؤں جا کر مسلم لیگی امیدوار کے حق میں رائے عامہ ہموار کرنے لگے- اس مقصد کے لیے طالب علموں نے اپنی سائکلیں استعمال کیں- لیکن لیگی امیدوار نے دو جیپیں بھی فراہم

گئی ہوئی تھیں- لیگی کارکنوں کو دیہاتوں میں کنویسنگ کے لیے بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ دیہاتی علاقوں میں ذیلدار بھٹیوں کا بڑا اثر و رسوخ تھا اور بلدیہ کے چیئرمین دوست محمد بھٹی کا پورا خاندان یونینسٹوں کے ساتھ ملا ہوا تھا- اگرچہ مقامی بھٹی قبیلہ کے سرکردہ افراد میاں محمد حسین بھٹی جو اس وقت مسلم لیگ کی مقامی شاخ کے صدر بھی تھے اور میاں نذر حسین بھٹی مسلم لیگ میں شامل تھے اور اس کی انتخابی مہم میں پوری طرح حصہ لے رہے تھے لیکن بھٹی ذیلدار خاندان کے مقابلے میں زیادہ اثر رسوخ کے مالک نہیں تھے- اس وجہ سے لیگی کارکن کسی دیہات میں جاتے تو ان کے پوسٹر اور اشتہار پھاڑ دیے جاتے- لیگی امیدوار نے اپنے کارکنوں کو سختی کے ساتھ یہ ہدایت دی ہوئی تھی کہ وہ کسی بھی طرح لڑائی جھگڑا نہیں ہونے دیں گے- کیونکہ یونینسٹ اپنی شکست کو دیکھتے ہوئے یہی چاہتے تھے کہ دنگا فساد ہو جائے اور لیگی کارکنوں کو گرفتار کرا دیا جائے- اس طرح وہ کنویسنگ نہ کر سکیں گے- لیکن لیگی کارکن استقامت کے ساتھ دیہاتی لوگوں تک اپنا موقف پہنچانے میں مگن رہے- سادہ لوح دیہاتی لوگوں کو قائل کرنے کے لیے ان کارکنوں نے دو مولویوں کی خدمات بھی حاصل کی ہوئی تھیں جو ہر گاؤں میں جا کر نعتیں سنا کر لوگوں کو یہ بتانے کی کوشش کرتے کہ مسلم لیگ اسلام کی پارٹی ہے، مسلمانوں کی پارٹی ہے، لہٰذا اسی جماعت کو ہی وہ ووٹ دیں- دیگر کارکن پاکستان کی غرض و غایت بتاتے اور مقصد واضح کرتے کہ آپ لوگوں نے مسلم لیگ کا ساتھ نہ دیا اور پاکستان نہ بنا تو مسلمان ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہندوؤں کی غلامی میں جکڑ جائیں گے- اس کا بڑا مثبت اثر ہوا اور لوگ جوق در جوق مسلم لیگ کی طرف کھنچتے چلے آئے- اس مہم کے دوران ایک بزرگ دینی شخصیت جناب محمد حیات شاہ نے بھی مسلم لیگ کے حق میں رائے عامہ ہموار کرنے کے سلسلے میں انتہائی اہم کردار ادا کیا- وہ جگہ جگہ جمعہ کے خطبوں میں مسلمانوں کو مسلم لیگ کا پیغام پہنچاتے رہے اور پاکستان کا پرچار کرتے رہے- انہوں نے مسلم لیگ کے حق میں ووٹ دینے کے لیے فتویٰ بھی جاری کیا- ایک علاقائی پنجابی شاعر خانو رانجھا بھی اپنی شاعری کے ذریعے مسلم لیگ کی انتخابی مہم کی رونق کو دوبالا کرتا رہا- اس نے مخصوص لہجے کی پنجابی شاعری کے ذریعے بڑی مقبولیت حاصل کی اور خوب جوش و ولولہ پیدا کیا-

یونینسٹوں کا جلسہ :

مسلم لیگ کی انتخابی مہم کے مقابلے میں یونینسٹ پارٹی نے پنڈی بھٹیاں کی اندرون غلہ منڈی میں ایک جلسے کا اہتمام کیا- اس کا انتظام میاں دوست محمد بھٹی نے کیا تھا- مسلم لیگ نے انتخابی مہم میں چونکہ اسلام کے حوالے سے کافی پروپیگنڈہ کیا تھا- چنانچہ اس کا توڑ کرنے کے لیے یونینسٹوں

نے مولانا عبدالرحمن جامی کو اپنے جلسے میں بلوایا- مولانا جامی نے اپنی پنجابی تقریر کے آغاز میں سورۃ فاتحہ پڑھی اور یہ بتانے کی کوشش کی کہ الحمد للہ رب العلمین کا مطلب ہے کہ خدا ہر رنگ و ہر ترسب انسانوں کا رب اور خدا ہے- صرف مسلمانوں کا نہیں ہے- اس لیے یونینسٹ پارٹی مسلم لیگ کی نسبت سے زیادہ اسلام کے قریب ہے کیونکہ مسلم لیگ ایک فرقہ ورانہ جماعت ہے جبکہ یونینسٹ میں سب مذہبوں کے لوگ ہیں- یوں انہوں نے اسلام کے حوالے سے یونینسٹ پارٹی کو جائز ثابت کرنے کی کوشش کی- مگر ان کی یہ تاویلیں یہاں کے عام مسلمانوں کو قائل نہ کر سکیں- چنانچہ مولانا جامی جلسہ کے اختتام پر جب شاہی جامع مسجد میں نماز کے لیے داخل ہونے لگے تو نمازیوں نے ان کی مزاحمت کی-(۶۵)

پولنگ :

انتخابی مہم کے اختتام پر بالآخر جنوری ۱۹۴۶ء میں پولنگ کا دن آیا تو بڑی دلچسپ صورتحال دیکھنے میں آئی- پنڈی بھٹیاں میں دو پولنگ اسٹیشن قائم کئے گئے تھے- ایک ریسٹ ہاؤس اور دوسرا موجودہ گرلز ہائر سیکنڈری سکول میں- مردوں کے پولنگ اسٹیشن جو کہ ریسٹ ہاؤس میں تھا کے قریب یونینسٹ اور لیگی کارکنوں کے انتخابی کیمپ بنائے گئے تھے- اس روز دلچسپ واقعہ یہ ہوا کہ ایک جیپ جس پر نیسیٹ پارٹی کا جھنڈا لگا ہوا تھا دیہاتی ووٹروں کو لے کر آئی جب وہ لیگی کارکنوں کے پاس سے گزری تو کارکنوں نے بڑے پرجوش انداز میں نعرے لگانے شروع کر دیئے- جب مسلم لیگ زندہ باد، پاکستان کا مطلب کیا لا الہ اللہ، اسلام زندہ باد کے نعرے بلند ہوئے تو جیپ میں سے ایک بوڑھا دیہاتی چھلانگ لگا تا اور زخم کھاتا لیگی کیمپ میں آ گیا اور یونینسٹوں کو گالیاں دیتے ہوئے کہنے لگا کہ یہ مجھے دھوکہ دے کر کافر کرنے لگے تھے- میں نے تو صرف اسلام کی پارٹی کو ووٹ دینا ہے- یہ مجھے اسلام کی پارٹی بتا کر اپنے ساتھ لائے تھے- اسلام کی پارٹی کا کیمپ تو یہ لگتا ہے جہاں سبز رنگ کا جھنڈا لگا ہوا تھا- اس پر لیگی کارکنوں نے زخمی بوڑھے کو کندھوں پر اٹھا لیا اور زبردست نعرے بازی کرتے ہوئے اس کا ووٹ ڈلوانے پولنگ اسٹیشن لے گئے- اس واقعہ سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ تحریک کے دوران سادہ لوح مسلمانوں میں کس قسم کا جذبہ کارفرما تھا- حالانکہ ان پر یونینسٹ جاگیرداروں کا دباؤ بھی تھا لیکن انہوں نے اس کی بھی پرواہ نہ کی تھی-

دوسرا واقعہ یہ پیش آیا کہ پنڈی بھٹیاں کے نواحی گاؤں مچھونکہ سے دو لیگی ووٹر مولا داد اور مغل خاں ووٹ دینے کے لیے پولنگ اسٹیشن کی طرف آ رہے تھے کہ ہائی سکول کے قریب میاں عطا محمد بھٹی نے انہیں ورغلانے کی کوشش کی لیکن وہ اپنے سیاسی عقیدے پر ڈٹے رہے کچھ لیگی کارکنوں نے

جا کر اپنے قائدین کو اطلاع دی کہ لیگی ورکروں کی راہ میں رکاوٹ پیدا کی جا رہی ہے۔اس پر مقامی لیگی رہنما میاں غلام محمد مسن، سید اکبر شاہ اور الہی بخش لودھرا وہاں پہنچے۔دونوں طرف سے تکرار ہوئی تو میاں عطا محمد بھٹی اور الہی بخش لودھرا گتھم گتھا ہو گئے۔اس پر میاں مظفر خاں اور اکبر شاہ نے بیچ بچاؤ کر کے معاملے کو رفع دفع کرایا۔(٦٦)اس طرح کے واقعات میں پولنگ کا عمل مکمل ہوا اور نتائج نکلے تو حلقے میں مسلم لیگ کو شاندار کامیابی نصیب ہوئی۔ مسلم لیگ کے امیدوار راج محمد تارڑ کو ۸۲۹۰ ووٹ حاصل ہوئے تھے جبکہ ان کے مخالف یونینسٹ امیدوار غلام محمد کو صرف ۳۱۶۸ ووٹ حاصل ہو سکے۔ تیسرے امیدوار خان بہادر عطاء اللہ آخری وقت میں راج محمد تارڑ کے حق میں دستبردار ہو گئے تھے۔اس لیے انہیں صرف ایک ووٹ ہی حاصل ہو سکا۔(٦٧) لیگ کی اس شاندار کامیابی کا سارا سہرا لیگی کارکنوں کی شبانہ روز اور انتھک محنت کا ثمر تھی۔ان میں نمایاں ترین پنڈی بھٹیاں کے غلام محمد مسن (سیکرٹری مسلم لیگ) میاں محمد حسین بھٹی (صدر مسلم لیگ) میاں نذر حسین بھٹی، شیخ چراغ دین، شیخ دوست محمد، بابو علی احمد، غلام محمد فاروقی، غلام محمد پاکستانی، مہر عبدالکریم، چوہدری الہی بخش لودھرا، بابا نبی بخش، شیخ مولا بخش، سید علی احمد اور سائیں محمد اسماعیل ڈھیرہ جبکہ جلالپور بھٹیاں سے میاں اسلم حیات بھٹی، محمد حسین زرگر، نور محمد درزی، حکیم فیض محمد، قاضی عبدالرسول، خلیفہ سراج الدین اور پیر ارشاد حسین کے نام ہیں۔

انتخابات میں شاندار کامیابی پر آل انڈیا مسلم لیگ نے ۱۱ جنوری ۱۹۴۶ء کو یوم فتح منانے کا اعلان کیا۔اس روز جلالپور، حافظ آباد اور پنڈی بھٹیاں اور گردونواح کے مسلمانوں نے اپنے گھروں میں چراغاں کیا اور مستقبل کی آزادی کی شمعیں روشن کیں۔یہاں ایک جلوس بھی نکالا گیا۔لیگ کی کامیابی پر مسلم لیگ پنڈی بھٹیاں کی طرف سے قائداعظم محمد علی جناح کو مبارکباد کا تار ارسال کیا گیا۔یہ تار غلام محمد مسن اور شیخ محمد حیات پھپھڑہ کے دستخطوں سے ارسال کیا گیا تھا اور اس کی وصولی رسید قائداعظم کے دستخطوں سے موصول ہوئی تھی۔

راست اقدام ۱۹۴۶ء:

انتخابات کے بعد انگریزی حکومت کو یہ احساس ہو چکا تھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو نظر انداز کر دینا ممکن نہیں رہا اور اب مسلمانوں کا واضح طور پر یہ نصب العین بن چکا تھا کہ پاکستان کے حصول کے سوا وہ کسی اور دستوری حل کو قبول نہیں کریں گے۔ چنانچہ جب مارچ ۱۹۴۶ء میں وزارتی مشن ہندوستان آیا اور اس نے اپنی آئینی تجاویز پیش کیں تو ان میں پاکستان کی دھندلی سی تصویر موجود ہونے کی وجہ سے مسلم لیگ نے انہیں قبول کر لیا۔ مگر منصوبے کی ایک شق کے مطابق مسلم

لیگ کو انگریز حکومت نے عبوری حکومت بنانے کی دعوت دینے سے انکار کر دیا- یہ کابینہ مشن منصوبے کی دفعات کی کھلی خلاف ورزی تھی-اس بد عہدی پر مسلم لیگ نے مسلم عوام سے اپیل کی کہ وہ ۱۶ اگست ۱۹۴۶ء کو نہایت منظم طریقے سے براہ راست، راست اقدام کا دن منائیں تاکہ سب کو معلوم ہو جائے کہ وہ پاکستان کے لیے ہر قسم کی قربانی دینے کے لیے تیار ہیں-اس دن مسلم لیگ کی پنڈی بھٹیاں شاخ اور دیگر پرائمری لیگوں نے مل کر حکومت برطانیہ کی بد عہدی کے خلاف ایک احتجاجی جلسہ کیااور بعد میں جلوس بھی نکالااور یہ ثابت کیا کہ وہ پاکستان کے قیام کے لیے کسی بھی قربانی سے دریغ نہیں کریں گے-اسی دوران انجمن اصلاح المسلمین کا تیسرا سالانہ جلسہ منعقد ہوا تو اس کی صدارت کے لیے مسلم لیگی رہنما سردار شوکت حیات کو مدعو کیا گیا-لیکن وزارتی وفد کی آمد کی وجہ سے ان کو دہلی روانہ ہونا پڑا جس کی وجہ سے وہ یہاں تشریف نہ لا سکے-البتہ جلسہ میں علامہ علاؤالدین صدیقی اور مولانا مسلم صاحب جیسے مقررین نے مطالبہ پاکستان کے حق میں پرجوش تقریریں کیں-

بہاری مسلمانوں کی مدد :

یہ وہ دن تھے جب ہندوستان مکمل فرقہ وارانہ کشیدگی کی لپیٹ میں آ چکا تھا اور کلکتہ، بمبئی، نواکھلی، بہار، آگرہ، گڑھ مکتشر، مدراس، پنجاب، بنارس پھر کلکتہ ان سب جگہوں کو ہندوستانیوں نے ایک دوسرے کے خون سے لالہ زار بنایا ہوا تھا- صوبہ بہار میں تو ہزاروں بے گناہ مسلمان اس شیطانی چکر میں تعصب اور جنون کی بھینٹ چڑھ گئے تھے- سینکڑوں عورتیں بیوائیں اور ہزاروں بچے یتیم ہو گئے تھے-ان سنگین اور نازک حالات میں بہار کے مظلوم مسلمانوں کی امداد کے لیے پنڈی بھٹیاں کے مسلمانوں نے زبردست مہم چلائی اور امدادی رقم جمع کر کے قائداعظم کے قائم کردہ بہار فنڈ حبیب بنک چاندنی چوک دہلی میں جمع کرائی-

فرقہ وارانہ کشیدگی :

ملکی سطح پر فرقہ وارانہ کشیدگی کے اثرات یہاں کی مقامی سیاست پر بھی مرتب ہونا شروع ہو گئے تھے- چنانچہ ٹاؤن کمیٹی کے جدید انتخابات کے لیے جنوری ۱۹۴۷ء میں نئی وارڈبندی کے کام کا آغاز ہوا تو اس پر دونوں قوموں میں شدید تناؤ پیدا ہو گیا-اس وقت قصبہ پنڈی بھٹیاں میں مسلمانوں کی تعداد ۳۳۰۰ ہندوؤں کی ۲۰۰۰ اور سکھوں کی ۳۰۰ تھی- مگر مردم شماری میں قصبہ کے ایک محلہ غریب پورہ کو شامل نہیں کیا گیا تھا-اس محلہ کی آبادی پانچ سو نفوس پر مشتمل تھی اور لوگ زیادہ

تر مزدوری پیشہ مصلی و موچی تھے ۔ جو دوسرے لوگوں کی طرح ہر قسم کا راشن اپنے راشن کارڈوں پر قصبہ ہذا سے لیتے تھے مگر کسی مصلحت کے ماتحت ان کو نظر انداز کیا گیا تھا۔ غربا کی اس بھاری تعداد کو حق رائے دہی سے محروم رکھنا ان کی صریحاً حق تلفی تھی ۔ اس کے علاوہ مسلمانوں کو وارڈوں کی غیر مساویانہ تقسیم بندی پر بھی اعتراض تھا۔ چنانچہ ان کے نمائندوں نے اس مسئلے پر کمشنر لاہور اور وزیر لوکل سیلف گورنمنٹ کے نام مراسلات ارسال کئے ۔ لیکن ابھی یہ تناؤ جاری تھا کہ پنجاب میں خضر وزارت کے خلاف مسلم لیگ نے سول نافرمانی کی تحریک شروع کر دی اور یہ مسئلہ ویسے کا ویسا ہی رہا۔ (۶۸)

تحریک سول نافرمانی میں گرفتاریاں :

۱۹۴۶ء کے انتخابات کے نتیجے میں مسلم لیگ پنجاب کی سب سے بڑی جماعت بن کر سامنے آئی تھی ۔ اگرچہ اسے ایوان میں واضع اکثریت حاصل نہیں ہوئی تھی لیکن دوسری تمام جماعتوں کے مقابلے میں واحد اکثریتی جماعت کے طور پر اسے وزارت بنانے کی دعوت دی جانی چاہیے تھی ۔ لیکن یونینسٹ، کانگریس اور گورنر کی ملی بھگت سے مسلم لیگ کی بجائے دیگر تمام چھوٹی جماعتوں کی مخلوط حکومت قائم کر دی گئی اور خضر حیات ٹوانہ وزیر اعلیٰ بنا دیے گئے ۔ اس غیر نمائندہ مخلوط حکومت کے قیام کے رد عمل کے طور پر مسلمانان پنجاب نے جلسے اور جلوسوں کا انعقاد شروع کر دیا۔ بالآخر یہ سلسلہ تحریک سول نافرمانی پر جا پہنچا۔ یہ تحریک ۲۴ جنوری ۱۹۴۷ء کو شروع ہوئی جب حکومت پنجاب نے پنجاب امنڈ منٹ ایکٹ کی دفعہ ۱۶ کے تحت مسلم لیگ نیشنل گارڈ کو خلاف قانون قرار دیا۔ گورنر پنجاب نے پبلک سیفٹی ایکٹ کی دفعہ ۲۷ کے تحت گارڈ کو وردی پہننے اور لیگ کا جھنڈا استعمال کرنے پر بھی پابندی عائد کر دی ۔ اس حکم کے فوری بعد پولیس نے لیگ گارڈ کے لاہور دفتر پر چھاپہ مارا اور وہاں موجود بہت سے لیگی کارکنوں کو گرفتار کر لیا۔ ان میں لیگ کے سرکردہ لیڈر بھی شامل تھے ۔ مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے کارکنوں نے اسی روز تحریک سول نافرمانی کا آغاز کر دیا۔ ہر جگہ جلسے اور جلوس نکلنے اور گرفتاریاں ہونے لگیں ۔ پنڈی بھٹیاں کے عوام اس موقع پر بھی پیچھے نہ رہے ۔ یہاں لاہور سے لیگ کی طرف سے خفیہ ہدایات اس طرح موصول ہوتیں کہ لیگی کارکن قائدین کی تحریری ہدایات کو مخصوص رومالوں میں بند کر کے لاہور سے سرگودھا جانے والی بس میں سوار ہو جاتے اور رستے میں جتنے بھی قصبے اور مقامات آتے وہاں اپنے کارکنوں کو یہ رومال دے دیتے ۔ پنڈی بھٹیاں کے نیشنل گارڈ کے کارکنوں کو بھی مرکزی دفتر سے اسی طریقے سے ہدایات ملتیں ۔ انہیں ہدایات پر عمل کرتے ہوئے لیگی کارکن جلسے جلوس کو منظم کرتے اور گرفتاریاں پیش کرنے

کے پروگرام مرتب کرتے- چنانچہ پہلے روز شاہی جامع مسجد سے ایک بڑے جلوس کا آغاز ہوا تو کارکنوں نے خضر حیات کا پتلا اٹھار کھا تھا- جب جلوس مسلم لیگ زندہ باد، پاکستان زندہ باد اور خضر ٹوانہ مردہ باد کے نعروں کی گونج میں چوک لاری اڈہ کے قریب پہنچا تو پہلے خضر ٹوانہ کے پتلے کو آگ لگا کر جلایا گیا پھر سات مسلم لیگی کارکنوں نے خود کو گرفتاری کے لیے پیش کر دیا- گرفتاری پیش کرنے والے یہ کارکن (۱) مہر عبدالکریم (۲) رانا فضل الٰہی (۳) محمد بشیر مسن (۴) محمد منشا مسن (۵) محمد علی (۶) غلام رسول درزی (۷) سائیں اسماعیل ڈھیرہ (گروپ لیڈر) تھے- جب یہ سات کارکن گرفتاریاں دے چکے اور ان کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پہنائی جا چکیں تو ایک سکھ سپاہی نے آگے بڑھ کر طنزاً پکارا کہ وہ تو آٹھ ہتھکڑیاں لایا تھا- ایک بچ گئی ہے یہ کون پہنے گا- اس پر ایک جوشیلا کارکن محمد بشیر (قلفی والا) پاکستان زندہ باد کا نعرہ بلند کرتے ہوئے آگے بڑھا اور اپنے دونوں ہاتھ گرفتاری کے لیے پیش کر دیئے-

ان کارکنوں کو پہلے حافظ آباد لے جایا گیا پھر گوجرانوالہ جیل منتقل کر دیا گیا- جہاں پہلے ہی حافظ آباد مسلم لیگ کے رہنما علی بہادر اعوان، چوہدری ارشاد اللہ تارڑ اور چوہدری صلاح الدین چٹھہ (حامد ناصر چٹھہ کے والد) سینکڑوں لیگی کارکنوں سمیت جیل میں موجود تھے- اگلے روز ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ جیل معافی نامے لے کر ان کارکنوں کے پاس آیا اور انھیں اس پر دستخط کرنے کو کہا اس پر یہ کارکن طیش میں آ گئے اور ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کی خوب پٹائی کی- صلاح الدین چٹھہ نے معاملہ رفع دفع کرایا- آٹھ دس روز جیل میں بند رہنے کے بعد ان کارکنوں کو رہائی ملی- بالآخر پورے پنجاب میں تحریک کامیاب ہوئی اور خضر ٹوانہ کو مستعفی ہونا پڑا- ان سرگرمیوں سے تحریک پاکستان کے جوش اور ولولہ میں اور اضافہ ہو گیا- اب انگریزوں کے لیے اس بات کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ مطالبہ پاکستان کو تسلیم کر لیں- چنانچہ ۳ جون ۱۹۴۷ء کو ہندوستان کی تقسیم کا اعلان کر دیا گیا اور ۱۴ اگست کو دنیا کے نقشے پر پاکستان کے نام سے ایک خود مختار مسلم مملکت وجود میں آ گئی- یہاں لوگ ریڈیو پر پاکستان کے قیام کی خبر سننے کے لیے بڑے بے تاب تھے- ایک لیگی کارکن علی احمد لودھرا نے اس کا اہتمام کیا اور عام مسلمانوں کو اپنے گھر جمع کر کے ریڈیو پر پاکستان کے قیام کا اعلان سنوایا جونہی یہ تاریخی اعلان ہوا- مسلمان زندہ باد کے نعرے لگاتے ہوئے جلوس کی شکل میں مین بازار آ گئے اور خوشی کا اظہار کیا-(۶۹)

قصبہ سے ہندوؤں کا انخلاء:

قیام پاکستان کا اعلان ہوتے ہی مشرقی پنجاب میں جہاں ہندوؤں اور سکھوں کی اکثریت تھی-

بدامنی، لوٹ مار اور قتل و غارت گری کے واقعات ہونا شروع ہو گئے۔ امر تسر میں تو مسلمانوں کے خون سے جو ہولی کھیلی گئی تھی اس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔ چنانچہ وہاں سے مسلمان مہاجرین کا ایک سیلاب مغربی پنجاب کی طرف امڈ آیا تھا۔ مسلمانوں پر ظلم و ستم کی داستانیں جوں جوں یہاں پہنچتیں ویسے ویسے اس کا ردعمل بھی ہوتا رہا۔ چنانچہ پاکستان کے علاقوں سے ہندوؤں کا انخلاء شروع ہو گیا۔ دلے کی بار کے پورے علاقے میں مسلمان واضح اکثریت میں تھے مگر انہوں نے یہاں ہندوؤں کے پرامن اور باعزت انخلاء میں ان کی پوری پوری مدد کی۔ شروع شروع میں کچھ افواہیں پھیلی تھیں کہ دریائے چناب کے کنارے آباد راجھے شاہ اور سید شاہ جو اپنے وقت کے مشہور قذاق تھے، لوٹ مار کریں گے۔ ان کی طرف سے قصبہ میں یہ اعلان بھی کروا دیا گیا تھا کہ مسلمان اپنے گھروں میں سبز جھنڈا لہرائیں تاکہ انہیں اندازہ ہو سکے کہ یہ مسلمانوں کے گھر ہیں۔ ان اعلانات پر قصبہ کے تمام ہندو مسلم باہم متحد ہو گئے اور ان کے مقابلے کے لیے تیاریاں شروع کر دیں۔ جب حالات بگڑتے دیکھے تو ٹاؤن کمیٹی کے چیئرمین دوست محمد بھٹی نے اپنے اثر و رسوخ کو استعمال میں لاتے ہوئے راجھے شاہ کو شہر کے باہر ہی روک دیا اور اسے سمجھا بجھا کر واپس کر دیا۔ اس دوران غیر مسلموں کے پرامن انخلاء کے بندوبست کے لیے سرکاری فورس بھی آ گئی تھی۔ چنانچہ حالات قابو میں رہے اور سوائے ہندو لڑکی کے ساتھ زیادتی کے واقعہ کے یہاں کے غیر مسلم انتہائی پرامن طور پر بھارت کی طرف روانہ ہو گئے۔

ہندو لڑکی سے زیادتی :

ہندو لڑکی کے ساتھ ایک مسلمان سپاہی کی زیادتی کا واقعہ کچھ یوں ہوا تھا کہ ایک فوجی افسر کی نگرانی میں جب سرکاری فورس یہاں تعینات کی گئی تھی تو ان دنوں مشرقی پنجاب کی مسلمان لڑکیوں کے ساتھ سکھوں اور ہندوؤں کی زیادتیوں کے المناک واقعات یہاں پہنچنا شروع ہو گئے تھے۔ ان واقعات سے یہاں کے مسلمانوں میں بڑا ہیجان پیدا ہو گیا تھا۔ چنانچہ جب ایک مسلمان سپاہی محلہ غربی جدید میں گشت پر تھا تو ایک ہندو لڑکی کو گھر میں اکیلا پا کر اس سے زیادتی کا موجب بنا۔ لڑکی کے باپ کو معلوم ہوا تو وہ گریہ زاری کرتا ہوا دوست محمد بھٹی کے پاس شکایت لے کر آیا۔ چونکہ اس واقعہ سے شہر میں ایک بڑے فساد کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ اس لیے دوست محمد بھٹی نے لڑکی کے باپ سے انتہائی دلگیری کی اور اسے ساتھ لے جا کر سارا واقعہ میجر کے گوش گزار کیا۔ میجر نے فوراً سپاہی کو گرفتار کر کے گوجرانوالہ روانہ کر دیا اور لڑکی کے باپ سے دست بدست معافی طلب کی۔ یوں قصبہ آگ کی اس چنگاری کے پھیلنے سے بچ گیا۔ (۷۰)

بھلیر میں قتل و غارت گری :

البتہ پنڈی بھٹیاں کے جنوب میں واقع ایک گاؤں بھلیر میں جو سنگین واقعہ رونما ہوا۔ علاقے کی تاریخ میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ بھلیر پنڈی بھٹیاں سے جنوب کی طرف (سانگلہ ہل کے قریب) واقع سکھ آبادی کا ایک دیہات تھا۔ اس وقت نرنجن سنگھ گاؤں کا سربراہ تھا جو ایک متمول اور بڑا زمیندار تھا۔ اس نے اعلیٰ نسل کی گائیں، بھینسیں اور گھوڑے پال رکھے تھے۔ تقسیم کے دنوں میں فسادات کا آغاز ہوا تو نرنجن سنگھ نے حملے کے خطرے کے پیش نظر بہت سارا اسلحہ ریاست پٹیالہ سے منگوا کر جمع کر لیا۔ پہلے بھی اس کے پاس جدید ہتھیار موجود تھے۔ ادھر سے علاقے کے بعض دیہاتی مسلمان لوٹ مار کی غرض سے جمع ہوئے اور گھوڑوں پر سوار ہو کر بھلیر کی طرف روانہ ہو گئے۔ سکھ سردار نرنجن سنگھ کو اس حملے کی اطلاع ملی تو اس نے دیہات کے چاروں اطراف اپنے مسلح آدمیوں کو کھڑا کر دیا۔ لیکن خود حملہ آوروں کا مقابلہ کرنے سے پہلے ایک سنگین کام یہ کیا کہ دیہات کی تمام سکھ نوجوان لڑکیوں کو اکٹھا کر کے ان کو اپنی عزتوں کی خاطر ست سری اکال کی راہ میں قربان ہو جانے کی اپیل کی۔ تمام لڑکیوں نے اس کے آگے سر تسلیم خم کر دیا اور قربان ہو جانے پر تیار ہو گئیں۔ چنانچہ نرنجن سنگھ نے ایک نوجوان سکھ کو تلوار دے کر گاؤں میں واقع دو منزلہ کنویں کے پاس کھڑا کر دیا۔ پھر سکھ لڑکیاں باری باری آتی گئیں اور اپنا سر کٹوا کر ست سری اکال کے نام پر قربان ہوتی گئیں۔ جب نرنجن یہ کام کر چکا تو سکھ نوجوانوں کے ساتھ چاروں طرف مورچہ بند ہو گیا۔ اس دوران مسلمانوں کا وہ گروہ جو پہلے ہی رسہ گیری اور چوری کے پیشہ سے وابستہ تھا بھلیر پہنچ گیا اور اس کا محاصرہ کر لیا۔ ان کا محض مقصد مال مویشی کی لوٹ مار کرنا تھا۔ مگر ان کو نرنجن سنگھ کی جمع کی ہوئی طاقت کا اندازہ نہیں تھا۔ چنانچہ سکھوں نے ان کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور بیسیوں مسلمان اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ مرنے والوں میں قصبہ پنڈی بھٹیاں کا ایک شخص محمد مصلی بھی شامل تھا۔ اس المناک واقعہ کے بعد رسہ گیروں اور چوروں کو لوٹ مار کرنے کی ہمت نہ ہو سکی۔ (۷۱)

☆☆☆

قیام پاکستان کے بعد کی تاریخ

مہاجرین کی آمد :

اس علاقے سے اکتوبر ۱۹۴۷ء کے وسط تک غیر مسلموں کا انخلاء مکمل ہو چکا تھا- لیکن ساتھ ہی وہ مسلمان لٹے پھٹے مہاجرین جو لاہور مہاجر کیمپ میں پناہ لیے ہوئے تھے مستقل آبادکاری کے لیے دوسرے علاقوں میں منتقل ہونا شروع ہو گئے تھے- چنانچہ سینکڑوں مہاجر خاندان پنڈی بھٹیاں آکر پناہ گزین ہوئے- یہ مسلمان پاکستان کے لیے اپنا سب کچھ لٹا کر بے یارومددگار اور بے آسرا ہو کر آئے تھے- ان کو بنیادی ضروریات کی فراہمی، دیکھ بھال اور بحالی مقامی لوگوں کا فرض تھا- چنانچہ اس مقصد کے لیے مقامی طور پر ایک ریلیف کمیٹی شیخ محمد اسلم تحصیلدار کی نگرانی میں تشکیل دی گئی- جبکہ غلام محمد مسن، شیخ محمد حسین ودھاون، شیخ محمد حیات پھپھرہ اور محمد حسین بھٹی اس میں بطور رکن شامل کئے گئے- بعد میں شیخ عبدالعزیز (مہاجر) کو بھی کمیٹی میں شامل کر لیا گیا- کمیٹی نے چوک لاری اڈہ کے قریب مہاجرین کیمپ قائم کیا جہاں مہاجرین کو عارضی طور پر ٹھہرایا گیا- بعد میں بحالی مہاجرین کمیٹی نے ہندوؤں کے چھوڑے ہوئے مکانوں کو اپنے قبضے میں لے کر ان میں مہاجرین کے قیام کا بندوبست کیا اور ان کی روزانہ کی ضرویات کی فراہمی کا انتظام انتہائی خوش اسلوبی سے کیا- مقامی مسلمانوں نے بھی ان کی مدد کرنے میں کوئی کسر روانہ رکھی اور ہر ممکن امداد بہم پہنچائی- پھر مستقل بنیادوں پر ان کی بحالی کے کام کا آغاز ہوا تو جائز حقداروں کے ساتھ ساتھ جائیدادوں کے حصول کے لیے خوب لوٹ مار بھی مچی- مقامی افسران، محکمہ بحالیات کے کارندے اور کئی دوسرے جعلی کلیموں کے اس کاروبار میں ملوث تھے- پنڈی بھٹیاں قصبے میں ان دنوں سہولتوں کی کمی تھی- کاروبار کے ذرائع بھی زیادہ نہ تھے- چنانچہ کئی مہاجرین یہاں سے بڑے شہروں کی طرف رجوع کر گئے- یہاں کے کاروبار پر زیادہ تر ہندوؤں کا قبضہ تھا- تجارتی لحاظ سے ان کے چلے جانے کے بعد ایک خلا پیدا ہو گیا تھا- یہ خلا کسی حد تک مہاجر مسلمانوں نے پورا کیا جن کے حصے میں اکثر دکانیں آئی تھیں- یہاں جو مہاجرین آباد ہوئے وہ زیادہ تر مشرقی پنجاب کے دہلی، نجف گڑھ، گوڑگاؤں، جالندھر، انبالہ اور ہوشیارپور کے پسماندہ طبقوں سے تعلق رکھتے تھے- البتہ بعض خاندان اپنی سابقہ خوشحالی کے باوجود یہاں آکر ستم ظریفی کا شکار رہے- ان مہاجرین کا رہن سہن، رسم ورواج اور زبان کا لہجہ کافی حد تک مقامی مسلمانوں سے مختلف تھے- چنانچہ پچاس سال گزرنے کے باوجود اور سماجی اختلافات کی وجہ سے

مقامی اور مہاجر کی تفریق مٹ نہیں سکی۔

قائداعظم کی رحلت کا سوگ :

ابھی شہر کی نئی سماجی واقتصادی زندگی کا آغاز ہوا ہی تھا کہ اسے بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح رحمتہ اللہ کی بے وقت ناگہانی وفات حسرت آیات کا دکھ سہنا پڑا۔ ۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ء کی صبح ریڈیو پر ان کی رحلت کی خبر نشر ہوتے ہی تمام علاقے میں کہرام مچ گیا تھا۔ ہر ایک آدمی سنسنی زدہ دیوانہ وار ادھر ادھر بھاگتا دکھائی دیتا تھا اور پوچھتا تھا کہ کیا قائداعظم فی الحقیقت انتقال فرما گئے ؟ تمام دکانیں اور کاروبار، ٹریفک بند ہو گیا۔ قصبہ میں ماتمی جلوس نکالا گیا اور شام ۵ بجے اندرون غلہ منڈی میں ایک بھاری اجتماع ہوا۔ ہزار ہا لوگ چشم گریاں اور دل بریاں شامل جلسہ ہوئے۔ مقررین نے غم واندوہ میں ڈوبی ہوئی تقریریں کیں۔ مقرریں شیخ فیض احمد، شیخ محمد اسلم نائب تحصیلدار اور شیخ چراغ دین تھے۔ مسلسل پانچ روز تک قصبہ ماتم کدہ بنا رہا اور تمام قسم کے کاروبار بند رہے۔(۷۲)

ترقی پسند تحریک کی ابتداء :

اس غم کو سے ابھی دو سال بھی نہ بیتے تھے کہ ستمبر ۱۹۵۰ء میں سیلاب کی تباہ کاریوں نے پورے علاقے کو آن گھیرا۔ دیہات دریائے چناب کی سیلابی لہروں کی نذر ہو گئے۔ کئی روز تک شہر کے اندر پانی کھڑا رہا اور کئی غریبوں کے گھر اس کی نذر ہو گئے۔ اس وقت سیلاب کی روک تھام کے لیے موجودہ بند تعمیر نہیں ہوا تھا۔ چنانچہ کچھ عرصہ بعد ہی ان تباہ کاریوں کو روکنے کے لیے حکومت نے شہر کے مغرب کی طرف بند کی تعمیر شروع کر دی۔ یہ کام ایک نجی ٹھیکیدار کے سپرد کیا گیا تھا جو مزدوروں کا خوب استحصال کرتا تھا۔ ان سے کام زیادہ لیتا اور معاوضہ کم دیتا۔ ان مزدوروں کے حقوق کے تحفظ کے لیے پنڈی بھٹیاں میں پہلی مزدور یونین تشکیل دی گئی۔ اس کا نام جنرل مزدور یونین رکھا گیا۔ اس نے مزدوروں کے معاوضہ کی ادائیگی کے لیے عدالت میں مقدمہ بھی دائر کیا اور فیصلہ مزدوروں کے حق میں ہوا۔ اس کامیابی کے بعد عام محنت کش طبقہ اس کے ساتھ ملتا گیا۔ اس کے سرکردہ کارکنوں میں رانا محمد طفیل، شیخ مقبول الٰہی پھپھرہ، لطافت حسین اور مظاہر حسین مرحوم شامل تھے۔ یہ تنظیم علاقے میں ترقی پسند خیالات کا پہلا ہراول دستہ ثابت ہوئی۔ اگرچہ قیام پاکستان سے قبل چند ایسے نام سامنے آتے ہیں جو ترقی پسند خیالات کا واضح پرچار کرتے رہتے تھے۔ ان میں ایک نام جیون پرکاش جیون کا تھا جو آج کل دہلی میں مقیم ہیں اور ایک انقلابی شاعر کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں۔

قیام پاکستان کے بعد جب میاں افتخار الدین وزیر مہاجرین نے مسلم لیگ سے الگ ہو کر آزاد پاکستان پارٹی قائم کی تو جنرل مزدور یونین پنڈی بھٹیاں کے کارکن اس کے ساتھ وابستہ ہو گئے۔ دراصل اس کی ترغیب یوپی کے ایک مہاجر لطافت حسین نے دی تھی جو ترقی پسند نظریات کا پہلے ہی سے حامی تھا۔ اس نے رانا محمد طفیل، حفیظ الدین شومیکر اور طفیل محمد قلعی گر کے ساتھ مل کر ان نظریات کو مقامی طور پر اور تقویت بخشی۔ ان ترقی پسندوں کا مقابلہ عام طور پر دائیں بازو کی جماعتوں کے کارکنوں سے رہتا اور ان کا اکثر حق جائیداد، زمین کی ملکیت اور دولت کی منصفانہ تقسیم کے مسئلوں پر بحث مباحثہ رہتا۔ مقامی جاگیرداروں کو ترقی پسندوں اور سوشلسٹوں کے تقسیم جائیداد اور ملکیت جائیداد کے نظریات سے پریشانی رہتی۔ چنانچہ اپنے کارندوں کے ذریعے ان پر اکثر آوازے کسے جاتے اور گالیاں دی جاتیں۔ مگر یہ کارکن استقامت کے ساتھ اپنے مخصوص نظریات پر کاربند رہے اور آزاد پاکستان پارٹی اور ازاں بعد پاکستان نیشنل پارٹی کی شاخ قائم کر کے اپنی سرگرمیوں کو جاری رکھا۔(۷۳)

پولیس انسپکٹر کی زیادتی :

ان سرگرمیوں کے ذریعے یہاں کے عوام ایک طرف تو شعور کی ابتدائی منزلوں کو طے کرنے کی کوشش کر رہے تھے تو دوسری طرف ان کے حقوق چھیننے کا سلسلہ بھی برابر جاری تھا۔ ۱۹۵۰ء میں سردار اللہ بخش نامی ایک سب انسپکٹر پولیس یہاں تعینات ہوا۔ کم تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے عقل اور تدبر سے عاری تھا۔ آتے ہی جاگیردار حضرات کے ہتھے چڑھ گیا اور من مانی کارروائیاں شروع کر دیں اسی اثناء میں اس نے حکم دیا کہ آٹھ بجے شب کے بعد لاری اڈے پر کوئی دکاندار بتیاں نہ جلائے کیونکہ اس کی نیند میں خلل آتا ہے۔ اپنے ہمسایہ بخش حجام کو حکم دیا کہ تم اپنی چھت پر نہ سویا کرو کیونکہ اس کے اہل خانہ کی بے پردگی ہوتی ہے۔ شہریوں نے اس بھیانک صورتحال کے خلاف شدید احتجاج کیا اور جلوس نکالا اس کے جواب میں تھانیدار کے حمایتی جاگیرداروں نے دیہات سے آدمی بلا کر اس کی حمایت میں جلوس نکالا۔ جس کی قیادت بھٹی خاندان کے چند افراد نے کی۔ اس پر شہریوں کی نمائندہ تنظیم انجمن اصلاح المسلمین نے قصبہ کے امن کو تباہ کرنے کے الزام میں تھانیدار کے خلاف رپورٹ درج کرا دی۔ اخبارات میں اس کا چرچا ہوا۔ حمید نظامی ایڈیٹر نوائے وقت کو جب پنڈی بھٹیاں کی صورتحال کا علم ہوا تو انہوں نے نوائے وقت میں درج ذیل ادارتی نوٹ لکھا۔

"پنڈی بھٹیاں سے یہ اطلاع موصول ہوئی ہے کہ وہاں تھانیدار نے حکم

دیا کہ کوئی ہمسایہ چھت پر نہ سوئے کیوں کہ اس کی بے پردگی ہوتی ہے۔
کوئی دکاندار رات کو بتی نہ جلائے کیونکہ اس کی نیند میں خلل پڑتا ہے۔
ہمارے خیال میں ایسے نازک مزاج تھانیدار کو لکھنو بھیج دیا جائے اور حکومت
پاکستان بھارتی حکومت سے سفارش کرے کہ وہ اس کا وظیفہ مقرر کر
دے۔ کیونکہ ایسے نازک مزاج لوگ لکھنو میں ہی خوش رہ سکتے ہیں۔"

عوام کے شدید ترین احتجاج کے نتیجہ میں تھانیدار مذکورہ کا فوری طور پر تبادلہ ہو گیا۔ اس کے حمایتی میاں ممتاز دولتانہ کے پاس پہنچے۔ دولتانہ صاحب نے معاملہ میاں غلام حسین بھٹی (شیخوپورہ) کے حوالے کر دیا۔ میاں غلام حسین نے شہریوں کے حق میں فیصلہ دیا۔ اس طرح ایک بار پھر عوامی قوت کے سامنے جاگیرداروں کو ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ (۴۷)

الیکشن صوبائی اسمبلی ۱۹۵۱ء:

مقامی طور پر سیاسی و سماجی تبدیلیوں کا یہ سلسلہ جاری تھا کہ ۱۹۵۱ء میں پنجاب اسمبلی کے انتخابات منعقد ہوئے۔ صوبائی سطح پر مسلم لیگ کا ایک دھڑا الگ ہو کر جناح عوامی مسلم لیگ کے پلیٹ فارم پر جمع ہو گیا تھا اور ان انتخابات میں کود پڑا تھا۔ ٹکٹوں کی تقسیم کا مرحلہ آیا تو پنڈی بھٹیاں کے حلقہ سے (جس میں جلالپور اور رسولپور کے علاقے بھی شامل تھے) غلام حسین بھٹی نے مسلم لیگ کے ٹکٹ کے لیے درخواست دی۔ وہ تحریک پاکستان کے دنوں میں مسلم لیگ کی سرگرمیوں میں بڑے پیش پیش رہے تھے اور ان کے چوہدری محمد حسین چٹھہ اور کرنل عابد حسین کے ساتھ بھی گہرے مراسم تھے۔ چنانچہ مسلم لیگ کی طرف سے ان کا امیدوار ہونا یقینی تھا۔ اس وجہ سے مقامی لیگی کارکنوں نے ان کی انتخابی مہم بھی شروع کر دی تھی۔ لیکن اچانک مظفر خاں قزلباش، صلاح الدین چٹھہ کے ہمراہ پنڈی بھٹیاں آئے اور سابق یونینسٹ دوست محمد بھٹی (جنہوں نے ۱۹۴۶ء کے انتخابات میں مسلم لیگ کی سخت مخالفت کی تھی) سے ملاقات کی اور ان سے مسلم لیگ میں شمولیت کا اعلان کروا کر لیگ کا ٹکٹ انھیں دے دیا۔ قزلباش اور دوست محمد بھٹی شیعہ ہونے کے باعث قریبی تعلقات رکھتے تھے اور قزلباش بھی اپنے حامیوں کی تعداد بڑھا کر اپنی وزارت پکی کروانا چاہتے تھے۔ یہ تبدیلی اتنی اچانک اور حیرت انگیز تھی کہ لیگی کارکن بددل ہو گئے۔ اب تک وہ انہی جاگیرداروں اور پاکستان مخالفوں کا مقابلہ کرتے آئے تھے۔ اس لیے اب وہ ان کا ساتھ دینے پر قطعی طور پر تیار نہ تھے۔ چنانچہ ان کارکنوں نے جن کے پاس مقامی سطح پر انجمن اصلاح المسلمین کا سماجی و سیاسی پلیٹ فارم موجود تھا، علاقے کے ایک زمیندار محمد نواز ہنسکیں کو اپنا امیدوار بنا لیا۔ جماعت اسلامی بھی اس

حلقے میں زور آزمائی کے لیے تیار تھی- اس نے چوہدری محمد اسلم کو اپنا امیدوار نامزد کر دیا- ان کی انتخابی مہم کے سلسلے میں مولانا مودودی بذات خود پنڈی بھٹیاں تشریف لائے اور اندرون غلہ منڈی میں جلسے سے خطاب کیا- جناح عوامی لیگ کی طرف سے غلام محمد (موضع جندرالکا) کو امیدوار نامزد کیا گیا اور موضع نشا کے فتح محمد آزاد امیدوار کے طور پر میدان میں تھے- ہر امیدوار نے اپنی اپنی انتخابی مہم پر زور طریقے سے چلائی مگر کامیابی مسلم لیگی امیدوار میاں دوست محمد بھٹی کو حاصل ہوئی- انہوں نے ۱۱۵۴۰ ووٹ حاصل کئے- جبکہ انجمن صلاح المسلمین کے حمایت یافتہ آزاد امیدوار محمد نواز بھٹی نے ۶۹۴۶ ووٹ لیے- جماعت اسلامی کے امیدوار چوہدری محمد اسلم کو صرف ۴۹۱ جناح مسلم لیگ کے امیدوار غلام محمد کو ۱۹۳۱ اور آزاد امیدوار فتح محمد کو ۳۵۳۴ ووٹ ملے تھے- اس حلقے سے کل ۴۸۵۷۵ ووٹرز تھے اور ۵۵ فیصد کے تناسب سے ۲۶۹۸۴ ووٹرز نے اپنا حق رائے دہی استعمال کیا تھا- نتائج کو دیکھا جائے تو باغی لیگیوں کے امیدوار نے صرف ۱۰۸ ووٹوں سے شکست کھائی تھی اور اگر جماعت اسلامی کے امیدوار ان کے حق میں دستبردار ہو جاتے تو دوست محمد بھٹی کی کامیابی کے امکانات ختم ہو جاتے-

تحصیل حافظ آباد کے دیگر دو حلقوں سے فضل حسین اور جناح عوامی لیگ کے امیدوار سیف اللہ تارڑ نے کامیابی حاصل کی تھی- فضل حسین نے ۸۸۴۳ ووٹ حاصل کئے تھے جبکہ ان کے مدمقابل مسلم لیگی امیدوار علی بہادر اعوان ۳۵۶۲ ووٹ لے سکے تھے- دوسرے حلقے سے سیف اللہ تارڑ کو ۱۱۵۳۹ ووٹ ملے تھے (۷۵) اور ان کے مدمقابل مسلم لیگی امیدوار راج محمد تارڑ کو ۸۱۸۴ ووٹ حاصل ہوئے تھے- دراصل ان دونوں حلقوں میں ممتاز احمد خاں دولتانہ نے مسلم لیگ کے امیدواروں راج محمد تارڑ اور علی بہادر اعوان کی بجائے ان کے مخالفوں کی حمایت کی تھی کیونکہ یہ دونوں لیگی امیدوار دولتانہ کے مخالف ممدوٹ گروپ سے تعلق رکھتے تھے- یوں ان لیگی امیدواروں کو دولتانہ ممدوٹ کشمکش کی بھینٹ چڑھنا پڑا-

اس انتخاب کے کچھ سال بعد مغربی پاکستان کے چاروں صوبوں کو یکجا کر کے ون یونٹ تشکیل دے دیا گیا اور پورے مغربی پاکستان کے لیے ایک اسمبلی کی تشکیل کی گئی- طریق کار کے مطابق گوجرانوالہ سے سات صوبائی ارکان کا انتخاب میاں منظور حسین، ظفر اللہ خاں، نوابزادہ سجاد علی خاں، چوہدری نبی احمد، ظفر حسین، اقبال چیمہ، فضل حسین (حافظ آباد) سیف اللہ تارڑ (کولو تارڑ) اور دوست محمد بھٹی (پنڈی بھٹیاں) کو بطور ووٹر کرنا تھا- چنانچہ چناؤ ہوا تو حافظ آباد سے سیف اللہ تارڑ اور میاں دوست محمد خاں بھٹی مغربی پاکستان اسمبلی کے ممبر منتخب ہونے میں کامیاب ہو گئے-

تحریک ختم نبوت میں گرفتاریاں :

۱۹۵۱ء کے صوبائی الیکشن کے تقریباً ایک سال بعد ہی پنجاب میں تحریک ختم نبوت شروع ہو گئی۔اس سلسلے میں جگہ جگہ ہنگامے اور توڑ پھوڑ ہوئی۔اس دوران پنڈی بھٹیاں میں مجلس ختم نبوت قائم ہوئی جس کے پہلے صدر حافظ ممتاز احمد تھانوی اور سیکرٹری شیخ محمد حسین ودہاون منتخب ہوئے۔ بعد ازاں اس مجلس کے زیر اہتمام نومبر ۱۹۵۲ء میں روزنامہ زمیندار کے ایڈیٹر مولانا اختر علی خاں کی زیر صدارت ختم نبوت کانفرنس منعقد ہوئی۔جس میں قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے اور وزیر خارجہ سر ظفر اللہ خاں کو وزارت سے نکالنے کی قرار دادیں منظور کی گئیں۔پھر جلسے جلوس اور گرفتاریاں بھی ہوئیں۔گرفتار ہونے والوں میں شیخ محمد حسین ودہاون، غلام محمد مسن، شیخ حیات محمد پھپھرہ، سید علی حسین شاہ، غلام رسول کامریڈ، میاں نبی بخش، سائیں محمد اسماعیل ڈھیرہ، محمد حسین مسن بابو نذر محمد اور ڈاکٹر محمد عبداللہ شامل تھے۔میاں دوست محمد بھٹی ایم ایل اے نے استغاثہ کا ساتھ دیا اور قاضی محمد اسماعیل انسپکٹر چونگی کو استغاثے کا گواہ بنایا جو بھٹیوں کے زیر اثر تھا۔کچھ روز بعد رانا آفتاب احمد مجسٹریٹ گوجرانوالہ نے اسیروں کو ضمانت پر رہا کر دیا۔بعد ازاں ان کو الزامات سے بری کر دیا گیا۔لیکن اس دوران کہ جب یہ کارکن جیلوں میں بند تھے قصبے کے نوجوانوں کو بلا جواز گرفتار کر کے ان سے تھانے کی دیوار چنوائی گئی یعنی بیگار لی گئی۔اس پر شہر میں بڑا رد عمل پیدا ہوا اور احتجاج کیا گیا جس پر ان بے گناہ لوگوں کو رہائی نصیب ہوئی۔(۷۶)

بلدیاتی انتخاب ۱۹۵۴ء اور شہری محاذ کی جیت :

۱۹۵۱ء کے صوبائی الیکشن کے بعد بھٹی ذیلدار خاندان اور شہری محاذ کے درمیان دوسرا بڑا سیاسی معرکہ ۱۹۵۴ء کے بلدیاتی انتخاب کے موقع پر ہوا۔شہری محاذ میں انجمن اصلاح المسلمین، ترقی پسندوں کا گروپ اور ذیلدار بھٹیوں کے مخالف بھٹی شامل تھے۔اس دوران ترقی پسندوں نے بیرون غلہ منڈی میں انتخابی جلسہ بھی منعقد کرایا۔جس کی صدارت فضل الٰہی لودھرانے کی اور آزاد پاکستان پارٹی کے لیڈر راؤ مہروز اختر نے خطاب کیا۔جلسہ میں سدھو میراثی نے ووٹ کے حوالے سے ایک نظم پڑھی جس کے الفاظ کچھ یوں تھے۔

ووٹ سوچ سمجھ کے پائیں اوغریبا بھولیا بھالیا
تیرے ہتھ وچ نوٹ پھڑان گے تینوں جھوٹے لارے لان گے
کدے قوم نوں ویچ نہ کھائیں او غریبا بھولیا بھالیا

اس وقت چونکہ ذیلدار خاندان برسر اقتدار تھا اس لیے اس نے الیکشن جیتنے کے لیے ہر طرح

کے جائز ناجائز ہتھکنڈے استعمال کیے۔اس کے باوجود انہیں شہری محاذ کے مقابلے میں زبردست شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ ۱۹۴۶ء کے بعد یہ ان کی دوسری بڑی شکست تھی۔ شہری محاذ نے میونسپلٹی کی کل ۹ نشستوں میں سے ۷ نشستوں پر کامیابی حاصل کی۔ بھٹیوں کی طرف سے صرف میاں حق نواز اور میاں دوست محمد کامیاب ہو سکے۔ جبکہ شہری محاذ کے کامیاب ممبران میں شیخ محمد شفیع، میاں نذر حسین بھٹی، ڈاکٹر محمد عبداللہ، شیخ عبدالعزیز (مہاجر)، چوہدری محمد اسماعیل، غلام محمد مسن اور شیخ محمد حیات شامل تھے۔ شہری محاذ کی طرف سے ڈاکٹر محمد عبداللہ نے میاں جہانگیر خاں بھٹی کو شکست دی تھی۔ شیخ محمد حیات کو میونسپلٹی کا پریذیڈنٹ منتخب کیا گیا۔ مگر کچھ ہی عرصے کے بعد اندرونی جوڑ توڑ کے باعث انہیں مستعفی ہونا پڑا اور ان کی جگہ شہری محاذ کی طرف سے ہی نذر حسین بھٹی چیئرمین بن گئے جبکہ شیخ محمد حیات وائس چیئرمین کے عہدے پر فائز ہو گئے۔

میونسپل الیکشن ۱۹۵۷ء۔ ۱۹۶۰ء :

میونسپلٹی کے اگلے الیکشن منعقدہ ۱۹۵۷ء میں سیاسی صورتحال تبدیل ہو گئی اور میونسپلٹی کی صدارت ایک مرتبہ پھر ذیلدار خاندان کے ہاتھوں چلی گئی۔ میاں حق نواز بھٹی چیئرمین بن گئے اور وائس چیئرمین کے عہدے پر ڈاکٹر محمد عبداللہ فائز ہوئے۔دیگر منتخب اراکین میں میاں جہانگیر خاں بھٹی، عبدالعزیز، خدا بخش، شیخ محمد رفیق، نصیر حسین بھٹی، نوازش علی بھٹی اور میاں نذر حسین بھٹی شامل تھے۔اس الیکشن کے فوری بعد ملک میں ایوب خان نے مارشل لاء نافذ کر دیا تھا اور بنیادی جمہوریتوں کے نئے نظام کو متعارف کرایا گیا۔ چنانچہ ۱۹۶۰ء میں ایک مرتبہ پھر بلدیاتی الیکشن کرائے گئے۔اس الیکشن کے نتیجے میں بلدیہ کی صدارت ایک مرتبہ پھر ذیلدار خاندان کے ہاتھ سے نکل گئی اور ان کے مخالف میاں نذر حسین بھٹی انجمن اصلاح المسلمین کی حمایت سے چیئرمین منتخب ہو گئے۔دیگر منتخب ہونے والوں میں شیخ محمد حسین ودہاون، نصیر حسین بھٹی، حاجی نذر حسین، حق نواز بھٹی، میاں جہانگیر بھٹی، حفیظ الدین، ظہور احمد مسن، شیخ محمد رفیق، ڈاکٹر فضل الٰہی لودھرا، شیخ محمد حنیف پھپھرہ، غلام رسول کامریڈ اور شیخ شفیع جاوید شامل تھے۔(۷۷)

انتخابات ۱۹۶۲ء (حلقہ ضلع حافظ آباد) :

صدر ایوب نے ۱۹۶۲ء میں نیا آئین متعارف کروایا تو اس کے تحت قومی و صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات بھی منعقد کرائے۔ان انتخابات میں تمام بالغ ووٹروں کو ووٹ ڈالنے کی اجازت نہ تھی۔ بلکہ بلدیاتی اداروں کے اراکین ہی کو صوبائی اور قومی اسمبلی کے اراکین کا چناؤ کرنا تھا۔سیاسی جماعتوں

کو بھی ان میں حصہ لینے کی اجازت نہ تھی۔ بڑے وسیع حلقے تشکیل دیئے گئے تھے۔ قومی اسمبلی کا حلقہ جس میں پنڈی بھٹیاں بھی شامل تھا اس میں موجود ضلع حافظ آباد کے علاوہ نوشہرہ ورکاں کو بھی شامل کیا گیا تھا۔ ۱۹۶۲ء کے انتخابات میں قومی اسمبلی کی نشست پر اس حلقے سے تین امیدوار چوہدری ارشاد اللہ تارڑ، رائے محمد شفیع آف پیلو اور جمیل احمد منج ایک دوسرے کے مدمقابل تھے۔ چوہدری ارشاد اللہ تارڑ اس وقت کنونشن مسلم لیگ میں شامل تھے اور اس لحاظ سے انہیں تمام تر حکومتی حمایت حاصل تھی۔ اس طرح وہ الیکشن جیتنے میں کامیاب ہو گئے۔ ارشاد اللہ تارڑ کو ۲۲۴ جبکہ رائے محمد شفیع کو ۱۲۸ ووٹ حاصل ہوئے۔ تیسرے امیدوار جمیل احمد منج نے صرف ۴۶ ووٹ حاصل کئے تھے۔ مغربی پاکستان کی صوبائی اسمبلی کے لیے اس حلقے سے اصل مقابلہ سیف اللہ تارڑ (کولو تارڑ) اور میاں رحمت خاں بھٹی (جلالپور) کے درمیان ہوا۔ رحمت خاں بھٹی کو چوہدری ارشاد اللہ کی حمایت حاصل تھی۔ نتیجہ نکلا تو دونوں کے ووٹ برابر یعنی ۱۹۸، ۱۹۸ نکلے۔ پھر ٹاس کے ذریعے نتیجہ برآمد کرنے کا فیصلہ ہوا لیکن اس دوران سیف اللہ تارڑ نے دوبارہ گنتی کی درخواست دائر کر دی۔ چنانچہ دوبارہ گنتی ہونے پر سیف اللہ تارڑ محض ایک ووٹ کی برتری سے جیت گئے۔ باقی ناکام امیدواروں میں سے محمد غوث کو ۲۲، ریاض احمد کو ۲ اور نذیر احمد کو ۲ ووٹ ملے تھے۔ (۷۸)

انتخابات ۱۹۶۵ء:

ایوبی دور حکومت میں قومی و صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات ۱۹۶۵ء میں منعقد ہوئے تو تحصیل (موجودہ ضلع) حافظ آباد کے حلقے میں یہ تبدیلی کر دی گئی کہ اس میں نوشہرہ ورکاں کو کاٹ کر وزیر آباد کے علاقے کو شامل کر دیا گیا۔ دراصل چوہدری صلاح الدین چٹھہ نے ایوب خاں کے مقابلے میں محترمہ فاطمہ جناح کا ساتھ دیا تھا اور حکومتی پارٹی میں شامل نہیں ہوئے تھے۔ اس وجہ سے گورنر پنجاب نواب آف کالاباغ امیر محمد خاں ان سے پرخار رکھتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے صلاح الدین چٹھہ کے حلقے کی قومی اسمبلی کی نشست ہی ختم کروا دی اور ان کے حلقے کا ایک حصہ تحصیل حافظ آباد اور دوسرا تحصیل گوجرانوالہ میں شامل کر دیا۔ حلقہ بندیوں میں اس انتقامی تبدیلی کے بعد چوہدری صلاح الدین نے الیکشن میں حصہ ہی نہ لیا۔ چنانچہ چوہدری ارشاد اللہ تارڑ کا مقابلہ چچازاد شریف تارڑ سے ہوا۔ چوہدری محمد انور بھنڈر (سابق سپیکر قومی اسمبلی) کی حمایت اور ذاتی اثر ورسوخ کے بل بوتے پر ارشاد اللہ تارڑ دوبارہ قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہو گئے۔ جبکہ صوبائی حلقہ (جو حافظ آباد، پنڈی بھٹیاں، جلالپور، سکھیکے، کالیکے تھانوں پر مشتمل تھا) سے سیف اللہ تارڑ نے کامیابی حاصل کی۔ میاں رحمت بھٹی اور میاں جہانگیر خاں بھٹی ان کے حق میں دستبردار ہو گئے تھے۔

سیف اللہ تارڑ نے ۲۷۷ ووٹ حاصل کیے تھے۔(۷۹) علاقے کے بھٹیوں اور شہری محاذ کے ارکان نے ارشاد اللہ تارڑ اور سیف اللہ تارڑ کی حمایت کی تھی۔

اسی دوران ملک میں صدارتی الیکشن ہوا تو علاقے کے اکثر ارکان نے حکومتی دباؤ میں آکر محترمہ فاطمہ جناح کے مقابلے میں ایوب خاں کا ساتھ دیا۔البتہ جماعت اسلامی کے مقامی کارکن جگہ جگہ جاکر محترمہ فاطمہ جناح کو ووٹ دینے کی ترغیب دیتے رہے۔لیکن انہیں کوئی خاطر خواہ کامیابی نصیب نہ ہو سکی۔ پنڈی بھٹیاں کے صرف ایک کونسلر شیخ محمد رفیق (شیخ مطاہر کے والد) نے اپنے ہاتھوں میں محترمہ فاطمہ جناح کے انتخابی نشان لالٹین کو پکڑ کر حافظ آباد جاکر ووٹ دینے کی جرات کی۔

جنگ ۱۹۶۵ء میں حصہ :

صدارتی الیکشن کے کچھ ماہ بعد ہی ستمبر ۱۹۶۵ء میں رات کی تاریکی میں بھارتی فوجیں پاکستان کی سرزمین پر حملہ آور ہوئیں۔ ۱۷ یوم کی مجاہدانہ جدوجہد میں پنڈی بھٹیاں، جلالپور، سکھیکی کے سماجی کارکنوں نے شب وروز کام کیا۔علاقائی پلوں پر پہرے دیئے۔ عوام کے حوصلوں کو بلند رکھا اور معقول مالی امداد بھی فراہم کی۔ ان خدمات میں قاضی شیر محمد، باؤ نذر محمد لودھرا، عطا محمد زوار، عبدالقیوم قادری، غلام رسول کامریڈ اور کئی دیگر کارکنوں کی خدمات قابل ذکر ہیں۔ جنگ میں کامیابی کے بعد یکم نومبر ۱۹۶۵ء کو پنڈی بھٹیاں میں ایک دفاع کانفرنس منعقد کی گئی جس میں ستارہ جرات سکواڈرن لیڈر جناب ایم ایم عالم کو بطور خاص مدعو کیا گیا تھا۔مگر وہ سرکاری مصروفیات کے باعث کانفرنس میں شامل نہ ہو سکے البتہ ایک ہفتہ بعد یہاں تشریف لائے تو اہل قصبہ کی جانب سے ان کی خدمت میں اعزازاً ایک تلوار پیش کی گئی۔محاذ جنگ میں اس علاقے سے تعلق رکھنے والے میجر رب نواز بھٹی نے دشمن کی گولیوں کا جوانمردی سے سامنا کیا اور انہی خدمات کے عوض ستارہ جرات سے نوازے گئے۔

میونسپلٹی الیکشن ۱۹۶۶ء :

جنگ کے فوری بعد ۱۹۶۶ء میں ایک مرتبہ پھر ملک میں بنیادی جمہوریتوں کے انتخاب منعقد کرائے گئے۔میونسپلٹی پنڈی بھٹیاں کے انتخاب میں میاں ذوالفقار علی بھٹی، میاں نوازش علی بھٹی، ڈاکٹر محمد عبداللہ، میاں نذر حسین، عبدالواحد مستری، حق نواز بھٹی اور میاں جہانگیر بھٹی اپنے اپنے وارڈوں میں منتخب ہوئے اور میاں حق نواز بھٹی چیئرمین کے عہدے کے لیے چنے گئے۔ایوبی دور حکومت کے تحت یہ آخری بلدیاتی انتخابات تھے۔

انتخابات ۱۹۷۰ء :

اس کے کوئی تین سال بعد ایوب خان کے خلاف زبر دست عوامی تحریک چلی اور انہیں اقتدار سے الگ ہونا پڑا- نئی مارشل لاء حکومت نے لیگل فریم ورک آرڈر کے تحت ۱۹۷۰ء میں عام انتخابات کرانے کا اعلان کیا- یہ الیکشن ایوبی نظام کے بر عکس بالغ رائے دہی کی بنیاد پر ہونا تھے-اس دوران ملک میں ذوالفقار علی بھٹو کی قیادت میں ایک نئی سیاسی جماعت وجود میں آچکی تھی اور یہاں بھی فدا حسین شاہ (حافظ آباد) شیخ مطاہر حسین، مختار ریحان، بابو نسیم احمد، فضل احمد لودھرا، عبدالغنی زرگر، شیخ محمد رمضان، محمد سعید بھٹہ، حمید رضا شاہ، حفیظ موچی، بھائی سلیم اور شیخ عبدالرؤف جیسے سیاسی کارکنوں نے اس کی شاخ قائم کر دی تھی-الیکشن کے دوران میاں نواز ش علی بھٹی نے بھی پیپلز پارٹی میں شمولیت اختیار کر کے اس کا ٹکٹ حاصل کرنے کی کوشش کی مگر وہ جلد ہی اس سے الگ ہو کر آزاد حیثیت سے الیکشن میں کود پڑے-پیپلز پارٹی نے اس حلقے سے قومی اسمبلی کے لیے شہادت خاں بھٹی اور صوبائی اسمبلی کے لیے درمیانے درجے کے ایک زمیندار رائے فتح محمد کو اپنا امیدوار بنایا- قومی اسمبلی کے دیگر امیدواروں میں چوہدری ارشاد اللہ تارڑ (کونشن لیگ) اور چوہدری سیف اللہ تارڑ (آزاد) شامل تھے- جبکہ صوبائی نشست پر رائے فتح کے علاوہ نوازش علی بھٹی (آزاد) میاں جہانگیر خاں بھٹی، رائے محمد شفیع (کونشن لیگ قادر گروپ) اور محمد نواز ہنجرا (آزاد) میں مقابلہ تھا-انتخابی مہم کے دوران تمام سیاسی جماعتوں کے خوب جلسے اور جلوس ہوئے- ذوالفقار علی بھٹو نے خود حافظ آباد آکر انتخابی جلسے سے خطاب کیا تھا- مذہبی جماعتیں اس دوران بھٹو کے سوشلزم پر خوب تنقید کرتی رہیں اور ان پڑھ ووٹروں کو یہ کہہ کر متاثر کرنے کی کوشش کرتی رہیں کہ سوشلزم کو ماننے والا کافر ہے- علاقے میں جاگیر داریت کے گہرے اثرات کی وجہ سے پیپلز پارٹی کے کارکنوں کو اپنی مہم چلانے میں کافی مشکلات درپیش رہیں- کیونکہ ابھی تک یہاں کا عام

آدمی ان جاگیرداروں کے شکنجے میں اس طرح جکڑا ہوا تھا کہ اس سے آزادی دلانا آسان کام نہ تھا-اس کے باوجود روٹی کپڑا اور مکان کے نعرے نے عام آدمی کو اپنی طرف کھینچ لیا تھا اور جب نتائج نکلے تو تمام لوگ حیران اور ششدر رہ گئے- علاقے کی تمام نشستوں پر پیپلز پارٹی کے امیدوار کامیاب ہو گئے- قومی اسمبلی کی نشست پر اس کے امیدوار شہادت خاں بھٹی نے ۶۵۸۹۹ ووٹ حاصل کئے- جبکہ ناکام امیدواروں میں ارشاد اللہ تارڑ کو ۳۱۲۴۶ اور سیف اللہ کو ۵۷۶۴۶ ووٹ ملے تھے- صوبائی حلقہ پنڈی بھٹیاں کی نشست پر رائے فتح محمد (پی پی پی) ۲۶۲۲۸ ووٹ لے کر کامیاب ہوئے تھے- جبکہ ان کے مدمقابل ناکام امیدواروں میں سے جہانگیر خاں بھٹی نے ۲۳۸۴۹ میاں نوازش علی نے ۱۴۲۸، چوہدری محمد نواز ہنجرا نے ۱۹۷۰۳ اور رائے محمد شفیع نے ۲۹۰ ووٹ حاصل کئے

تھے-حافظ آباد کی صوبائی نشست پر پیپلزپارٹی کے فدا حسین ۳۹۲۵۶ووٹ لے کر کامیاب ہوئے تھے-جبکہ ناکام امیدواروں میں فضل حسین کو ۳۶۵۰۷، فضل احمد تارڑ (کنونشن لیگ) کو ۲۹۰اور محمد اسماعیل خاں (پی ڈی پی) کو صرف ۲۶۵اووٹ حاصل ہو سکے تھے-(۸۰)

ملک میں انتخابات کا عمل تو مکمل ہو گیا تھا لیکن ابھی انتقال اقتدار کا مرحلہ باقی تھا کہ ملک سنگین حالات سے دوچار ہو گیا-۱۹۷۰ء میں بھارت کی طرف سے جنگ مسلط کر دی گئی اور ملک دو ٹکڑے ہو گیا-لاکھوں پاکستانی جنگی قیدی بنا لیے گئے-ان قیدیوں میں پنڈی بھٹیاں اور گردونواح کے کئی افراد شامل تھے-مقامی عوام نے ان کی مالی امداد کے لیے رقم اور سازوسامان جمع کیا اور ان کو امدادی فنڈ میں جمع کرایا-بالآخر اٹھارہ ماہ بعد ایک معاہدے کے نتیجے میں ان قیدیوں کو رہائی نصیب ہوئی-تو پنڈی بھٹیاں سے تعلق رکھنے والے قیدی رہا ہو کر جب یہاں پہنچے تو ان کا پورے شہر نے بڑا پرتپاک استقبال کیا-ان قیدیوں میں شیخ انعام الٰہی، شیخ شاہجہاں، خالد شیخ، آغا نظام، عبدالرشید سرہندی اور دیگر لوگ شامل تھے-

بقیہ پاکستان میں پاکستان پیپلزپارٹی کی حکومت قائم ہوئی تھی-اس دوران معاشی سیاسی و سماجی تبدیلیوں کے واضح آثار دکھائی دینا شروع ہو گئے-لوگوں کے مسائل کو حل کرانے کے لیے تھانوں میں ٹاؤٹوں کی جگہ سیاسی کارکنوں کی جدوجہد کا آغاز ہوا-پسے ہوئے طبقات کے حقوق کی بازیابی کے لیے آواز اٹھائی جانے لگی-مگر بدقسمتی سے سماجی تبدیلی کا یہ عمل آگے نہ بڑھ سکا اور دو تین برسوں کے بعد ہی پورے ملک کی طرح اس علاقے میں بھی پیپلزپارٹی کی قیادت بھی کارکنوں کے ہاتھوں سے نکل کر جاگیرداروں کے ہاتھوں میں آ گئی-اب تک حاجی سیف اللہ تارڑ جیسے پیپلزپارٹی سے شکست کھانے والے تمام جاگیردار اس میں شامل ہو کر اپنے سیاسی مفادات کو پورا کرنے لگے تھے-چنانچہ اس شیرازہ بندی کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۹۷۷ء میں عام انتخابات کا موقع آیا تو تحصیل حافظ آباد کی قومی اور صوبائی نشستوں پر ٹکٹ جاگیرداروں کے حوالے کر دیئے گئے-قومی اسمبلی کا ٹکٹ حاجی سیف اللہ تارڑ اور صوبائی اسمبلی کا ٹکٹ میاں رحمت خاں بھٹی (جلالپور) کو دے دیا گیا-سابق ایم این اے شہادت خاں بھٹی کو کارکنوں کی شدید مخالفت کی وجہ سے ٹکٹ نہ دیا گیا-کیونکہ ان کا اصلی جاگیردارانہ چہرہ کھل کر سامنے آ گیا تھا-مگر سیاسی و سماجی شعور کی ابتدائی منزلوں کے ان بھولے بھالے سیاسی ورکروں کو شاید یہ معلوم نہ تھا کہ ان کی جگہ جس دوسرے جاگیردار حاجی سیف اللہ تارڑ کو ٹکٹ دیا گیا ہے وہ کل کلاں ان کی پارٹی کے شدید سیاسی دشمن جنرل ضیاء الحق کی مجلس شوریٰ میں شامل ہو جائے گا-بہر حال ۱۹۷۷ء میں پیپلزپارٹی کا مقابلہ ۹ سیاسی جماعتوں کے اتحاد کے ساتھ تھا-اتحاد کی طرف سے قومی اسمبلی کی نشست کے لیے ارشاد اللہ تارڑ اور صوبائی اسمبلی کی

نشست (پنڈی بھٹیاں) پر میاں نوازش علی بھٹی کو تحریک استقلال کے کوٹے سے نامزد کیا گیا- انتخابی مہم کے دوران خوب رونق رہی- قومی اتحاد کے جلسے سے یہاں اصغر خان اور مولانا شاہ احمد نورانی نے خطاب کیا تھا- پولنگ ہوئی تو قومی اسمبلی کی نشست پر پیپلزپارٹی کے امیدوار سیف اللہ تارڑ نے کامیابی حاصل کی- انہیں ۹۶۵۱۴ ووٹ ملے تھے، جبکہ قومی اتحاد کے امیدوار چوہدری ارشاد اللہ تارڑ کو صرف ۴۴۷۴۶ ووٹ حاصل ہو سکے-

قومی اتحاد نے انتخابات میں دھاندلیوں کے الزامات لگا کر صوبائی اسمبلیوں کے الیکشن کا بائیکاٹ کر دیا- اس طرح صوبائی حلقہ پنڈی بھٹیاں سے پی پی پی کے امیدوار رحمت خاں بھٹی بلا مزاحمت کامیاب ہو گئے-

لیکن قومی اتحاد نے انتخابات کے فوراًبعد ہی بھٹو کے خلاف باقاعدہ تحریک کا آغاز کر دیا جو بعد ازاں نظام مصطفےٰ تحریک میں بدل گئی- اس دوران علاقے بھر میں جلسے، جلوس اور توڑ پھوڑ ہوئی- جلالپور، حافظ آباد اور یہاں کے آڑھتیوں اور رائس ڈیلروں نے خاص طور پر مالی معاونت کی کیونکہ بھٹو دور میں صنعتوں کو قومیانے کی پالیسی کی وجہ سے ان کے معاشی مفادات کو خاص طور پر زد پہنچی تھی- تحریک کے دوران پنڈی بھٹیاں سے گرفتاری پیش کرنے والوں میں میاں نوازش علی بھٹی، حاجی نور محمد، رائے گلزار احمد ملیا، شیخ حفیظ الدین اور کئی دوسرے سیاسی کارکن شامل تھے- اس تحریک کے نتیجے میں جولائی ۱۹۷۷ء میں جنرل ضیاء الحق نے ملک میں مارشل لاء نافذ کر دیا اور پیپلزپارٹی کے کارکنوں کی پکڑ دھکڑ شروع کر دی- پیپلزپارٹی پنڈی بھٹیاں کے صدر چوہدری احسان احمد کو بھی نظر بند کیا گیا- کوئی ایک ماہ بعد ان کو رہائی ملی- (۸۱)

ٹاؤن کمیٹی کا انتخاب ۱۹۷۹ء :

جنرل ضیاء الحق نے ملک میں سیاسی خلاء کو پر کرنے کے لیے ۱۹۷۹ء میں بلدیاتی اداروں کے انتخابات منعقد کروائے تو ایک مرتبہ پھر قیادت ذیلدار بھٹیوں کے ہاتھوں میں آگئی- میاں حق نواز بھٹی چیئرمین اور حاجی نذر محمد وائس چیئرمین منتخب ہوئے- دیگر ارکان میں شیخ شفیع جاوید، چوہدری محمد اشرف طاہر، میاں جہانگیر بھٹی، نثار احمد خاں، بابو خاں، نوکر حسین سراج، محمد اشرف بودلہ، میاں ذوالفقار علی بھٹی، خوشی محمد رحمانی، نذر محمد (مزدور) اقبال بیگم (خاتون) شامل تھے-

مجلس شوریٰ میں نمائندگی :

جنرل ضیاء الحق نے اپنے اقتدار کو دوام بخشنے کے لیے ۱۹۸۱ء میں مجلس شوریٰ قائم کی تو

تحصیل حافظ آباد سے دو سیاستدانوں کو اس میں شامل کیا گیا- پہلے پہل مسلم لیگ نے چوہدری ارشاد اللہ تارڑ کی نامزدگی کی سفارش کی- مگر جب اس کی اطلاع ان کے سیاسی حریف سیف اللہ تارڑ کو ملی تو انہوں نے اپنی نامزدگی کے لیے ہاتھ پاؤں مارنا شروع کر دیئے- حالانکہ وہ گزشتہ انتخابات میں پیپلز پارٹی کی طرف سے ایم این اے منتخب ہوئے تھے- مگر فوراً بعد ہی ضیاء کی گود میں جا گرے تھے- جیسا کہ جاگیرداروں کا وطیرہ ہوتا ہے- انہوں نے اس مقصد کے لیے ضیاء الحق کے ملٹری سیکرٹری کے ساتھ روابط کو استعمال کیا- اس طرح حاجی سیف اللہ تارڑ ضیاء الحق کے ملٹری سیکرٹری کی سفارش کی بدولت ارشاد اللہ تارڑ کی جگہ مجلس شوریٰ کے رکن نامزد ہو گئے- اس نامزدگی پر مسلم لیگ نے احتجاج کیا تو چوہدری ارشاد اللہ کو بھی مجلس شوریٰ میں شامل کر لیا گیا- یوں ۱۹۷۷ء کے یہ دونوں سیاسی حریف ضیاء الحق کی مجلس شوریٰ میں حلیف بن کر شامل ہو گئے- (۸۲)

اہم انتخابی معرکہ :

اسی اثناء میں ذیلدار بھٹیوں کی ایک سرکردہ شخصیت ذوالفقار علی بھٹی کا انتقال ہو گیا- وہ اس وقت ٹاؤن کمیٹی کے وارڈ نمبر ۱ کے کونسلر بھی تھے- چنانچہ اس وارڈ کا ضمنی الیکشن ہوا- جس میں برسر اقتدار بھٹی گروپ اور شہری محاذ آمنے سامنے تھے- شہری محاذ کی طرف سے صوفی عنایت میراں زرگر اور بھٹی گروپ کی طرف سے شیر محمد جوگی کو امیدوار بنایا گیا تھا- یہ الیکشن پورے شہر کی سرگرمیوں کا مرکز بنا رہا- بالآخر شہری محاذ کے امیدوار صوفی عنایت میراں کامیاب ہو گئے- مخالف شکست کو برداشت نہ کر سکے اور اپنی ناکامی کا بدلہ وارڈ کے ایک فرد شیخ آفتاب احمد کے ساتھ غیر انسانی سلوک کی صورت میں لینے کی کوشش کی- اس پر معاملہ بڑھا اور شہر بھر میں کشیدگی پیدا ہو گئی- چنانچہ انتظامیہ نے دونوں اطراف کے سو سے زائد افراد کو نقص امن عامہ کے تحت گرفتار کر لیا- بھٹی گروپ کی طرف سے میاں جہانگیر بھٹی اور شہری محاذ کی طرف سے انجمن اصلاح المسلمین کے صدر شیخ محمد حسین ودہاون اور نو منتخب کونسلر صوفی عنایت میراں بھی گرفتار ہونے والوں میں شامل تھے- اگلے روز ان کی ضمانتیں ہو گئیں اور کوئی دو سال کی مقدمہ بازی کے بعد اگلے بلدیاتی الیکشن سے کچھ دن قبل دونوں سیاسی گروپوں کے مابین صلح ہو گئی اور یہ مقدمہ ختم ہو گیا-

بلدیاتی انتخاب ۱۹۸۳ء :

البتہ اس واقعہ نے سیاسی اعتبار سے شہری اور بھٹی گروپوں کے درمیان خلیج اور گہری کر دی تھی- چنانچہ ستمبر ۱۹۸۳ء میں بلدیاتی انتخابات کے موقع پر یہ دونوں گروپ ایک دوسرے کے

مقابل آکھڑے ہوئے-اس مرتبہ فرق صرف اتنا تھاکہ شہری محاذ کی قیادت انجمن اصلاح المسلمین کے ہاتھ سے نکل کر آرائیں گروپ کے ہاتھوں میں آچکی تھی-اس نے بلدیاتی انتخاب میں بھٹی گروپ کا ڈٹ کر مقابلہ کیااور کامیابی حاصل کی-اس نتیجے میں چوہدری محمد رفیق آرائیں چیئرمین ٹاؤن کمیٹی منتخب ہو گئے-دیگر وارڈوں سے منتخب ہونے والوں میں مستری بشیر احمد، نصیر حسین بھٹی،نوازش علی بھٹی، محمد یوسف صاحب، میاں جہانگیر بھٹی (بلامقابلہ) شیخ محمد یامین، محمد اشرف اللہ والا، محمد بشیر مغل، شفقت حسین بھٹی، چوہدری حسن محمد،ڈاکٹر محمد صفدر لودھرا، غلام رسول (مزدور) ثریا بیگم اور نسیم اختر (خواتین) منتخب ہوئے-نصیر حسین بھٹی وائس چیئرمین بنے-

جلالپور بھٹیاں ٹاؤن کمیٹی سے سارنگ خاں، میاں رحمت خاں بھٹی، محمد بشیر عالم، میاں صفدر علی بھٹی، میاں اسلم حیات بھٹی، چوہدری بشیر ناصر، مستر غلام حسین، میاں شہادت حسین اور چوہدری نذیر احمد کونسلر اور میاں اسلم حیات بھٹی چیئرمین منتخب ہوئے-جبکہ منڈی سکھیکی ٹاؤن کمیٹی سے نصر اللہ، شاہد پرویز، بشیر احمد، چوہدری ولی محمد، محمد حنیف، نصر اللہ ولد نور احمد، رب نواز وٹو، صفدر عبدالستار کو نسلر اور چوہدری ولی محمد چیئرمین منتخب ہوئے-(۸۳)

قومی وصوبائی الیکشن ۱۹۸۵ء:

بلدیاتی انتخاب کے کوئی ڈیڑھ سال بعد مارچ ۱۹۸۵ء میں غیر جماعتی بنیادوں پر قومی اسمبلی و صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات منعقد کرائے گئے- سیاسی جماعتوں کی عدم موجودگی کی وجہ سے امیدواروں کی زیادہ تر انتخابی مہم ذات برادریوں، ذاتی اور مقامی مقاصد کے تحت چلائی گئی- قومی اسمبلی کے تحصیل حافظ آباد کے حلقہ سے چوہدری ارشاد اللہ تارڑ، سیف اللہ تارڑ، بریگیڈئیر (ریٹائرڈ) افتخار بشیر تارڑ اور فضل حسین اعوان کے درمیان مقابلہ ہوا- تین امیدواروں کا تعلق تارڑ برادری اور ایک کا حافظ آباد کی اعوان برادری سے تھا- تحصیل پنڈی بھٹیاں کی زیادہ تر برادریوں کی حمایت چوہدری ارشاد اللہ کو حاصل تھی-لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکے-بریگیڈئیر افتخار بشیر تارڑ تینوں امیدواروں کو شکست دے کر قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہو گئے-انہوں نے ۴۱۶۹۰ووٹ حاصل کئے جبکہ ناکام امیدواروں میں ملک فضل حسین اعوان نے ۳۳۳۷۱، چوہدری ارشاد اللہ تارڑ نے ۳۳۱۱۳ اور سیف اللہ تارڑ نے ۲۱۴۱۳ووٹ حاصل کئے-

صوبائی حلقہ پنڈی بھٹیاں میں چھ امیدواروں میاں جہانگیر خاں بھٹی، میاں ظفر علی، میاں اختر علی بھٹی (جلالپور) اور میاں نوازش علی بھٹی وغیرہ میں مقابلہ تھا- گزشتہ بلدیاتی انتخابات میں آرائیں گروپ نے میاں نوازش علی گروپ کی حمایت سے کامیابی حاصل کی تھی اور چوہدری محمد رفیق

آرائیں اس شرط پر چیئرمین بنے تھے کہ آئندہ صوبائی الیکشن میں وہ میاں نوازش علی کی حمایت کریں گے -مگر جب الیکشن کا موقع آیا تو آرائیں گروپ اس وعدہ سے مکر گیا اور اس نے نوازش علی کی بجائے ظفر علی بھٹی کو اپنا امیدوار بنا لیا- بہر حال برادریوں کی اس جنگ میں میاں جہانگیر بھٹی کامیاب ہوئے اور منتخب ہونے کے بعد مسلم لیگ میں شامل ہو کر میاں نواز شریف کے ساتھ مل گئے- جہانگیر خاں بھٹی کو ۲۰۷۴۵، میاں اختر علی کو ۱۵۹۶۵، میاں ظفر علی خاں کو ۱۱۰۴۸، ظفر حسین بھٹی کو ۵۶۳۳، ارشاد اللہ کو ۲۱۳۷ اور میاں نوازش علی کو ۱۱۷۳ ووٹ حاصل ہوئے تھے- تحصیل حافظ آباد کے دوسرے صوبائی حلقے (سکھیکے، کالیکے وغیرہ) سے مہدی حسن بھٹی ۲۱۲۴۴ ووٹ حاصل کر کے کامیاب ہوئے تھے -ان کے مدمقابل امیدواروں رائے محمد شفیع کھرل نے ۱۳۲۵۶، سرفراز خاں بھٹی نے ۱۳۰۲۶، ممتاز احمد نے ۳۵۴۶، سلمان خاں نے ۳۱۴۶ اور منظور احمد نے ۱۹۶۱ ووٹ حاصل کیے تھے -(۸۴)

حلقہ پنڈی بھٹیاں کے ایم پی اے میاں جہانگیر بھٹی کا ایک سال بعد ہی انتقال ہو گیا اور ضمنی انتخاب میں ان کے بیٹے میاں انتصار حسین بھٹی بلا مقابلہ صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب ہو گئے -اس موقع پر شہری محاذ نے بھی انتصار حسین بھٹی کی حمایت کی اور ان کا مقابلہ نہ کرنے کا فیصلہ کیا -اس ایک اہم سیاسی موقع کو ضائع کرنے کے بعد بھٹیوں کے مقابلے میں شہری محاذ کی سیاسی قوت دم توڑتی چلی گئی-

بلدیاتی انتخاب ۱۹۸۸ء :

چنانچہ جب ۱۹۸۸ء کے آغاز میں بلدیاتی انتخابات منعقد ہوئے تو ٹاؤن کمیٹی کی قیادت ایک مرتبہ پھر شہری محاذ کے ہاتھوں سے نکل کر ذیلدار بھٹی خاندان کے ہاتھوں میں آ گئی -بھٹی گروپ نے ٹاؤن کمیٹی کی کل ۱۱ نشستوں میں سے ۸ پر کامیابی حاصل کر کے میاں حق نواز بھٹی کو چیئرمین اور چوہدری حسن محمد کو وائس چیئرمین منتخب کر لیا- شہری محاذ اپنی کمزور سیاسی حیثیت کے باعث کوئی موثر حزب اختلاف کا کردار بھی ادا نہ کر سکا -اس الیکشن میں منتخب کونسلروں میں محمد بشیر مستری، شیخ محمد ظفر، خوشی محمد، حاجی نذر محمد، میاں انتصار حسین، شبیر حسین، میاں رفیق حسین بھٹی، محمد امین زاہد، شیخ تنویر احمد، میاں فضل عباس بھٹی، حاجی محمد یعقوب، نذیر حسین (مزدور) صغراں بیگم اور خالدہ بیگم (خاتون) شامل تھے -ٹاؤن کمیٹی جلالپور بھٹیاں سے منتخب ہونے والوں میں محمد نذیر چدھڑ، میاں رحمت خاں، میاں اختر علی بھٹی، میاں اسلم حیات، حاجی عبدالستار، میاں بشیر عالم بھٹی، میاں [illegible] حیات، میاں شاہد حسین اور محمد نذر شامل تھے-

قومی وصوبائی الیکشن ۱۹۸۸ء :

ان بلدیاتی انتخابات کے پانچ ماہ بعد یعنی ۲۹ مئی ۱۹۸۸ء کو جنرل ضیاء الحق نے وزیر اعظم محمد خاں جونیجو کی حکومت کو بر طرف کر کے اکتوبر میں قومی و صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات کا اعلان کیا- قومی اسمبلی کے حلقہ ۷۵ جو تحصیل حافظ آباد پر مشتمل تھا سے کل چار امیدوار ملک فضل حسین (پیپلزپارٹی) چوہدری ارشاد اللہ تارڑ (اسلامی جمہوری اتحاد) رائے محمد شفیع (عوامی اتحاد) اور بریگیڈئیر افتخار بشیر (آزاد) میدان میں تھے- صوبائی حلقہ ۸۰ جو پنڈی بھٹیاں، جلالپور اور رسول پور کے علاقہ جات پر مشتمل تھا- میاں انتصار حسین بھٹی (اسلامی جمہوری اتحاد) چوہدری احسان احمد (پی پی پی) رائے مشرف سلطان (این پی پی کھر گروپ) شفقت حسین بھٹی (اسلامی اتحاد) حاجی سارنگ خاں (آزاد) محمد شفیع ندیم (آزاد) محمد نواز (آزاد) اور میاں نصیر حسین بھٹی (آزاد) امیدوار تھے- جبکہ صوباوی حلقہ ۸۰ سکھیکی، کالیکے سے چوہدری مہدی حسن بھٹی (اسلامی جمہوری اتحاد) افضل حسین تارڑ (پی پی پی) اور ارشاد اللہ (این پی پی کھر) امیدوار تھے-

انتخابی مہم کے دوران خوب جوش و خروش رہا- اس دوران غلام مصطفےٰ کھر نے اپنے امیدوار کے انتخابی جلسے سے بھی خطاب کیا تھا- نتائج کے مطابق قومی اسمبلی کی نشست پر پیپلزپارٹی کے امیدوار ملک فضل حسین اعوان ۶۳۳۱۳ ووٹ لے کر کامیاب ہوئے- جبکہ ان کے مدمقابل امیدواروں چوہدری ارشاد اللہ تارڑ کو ۵۲۷۰۰، رائے محمد شفیع کو ۲۹۲۰ اور بریگیڈئیر افتخار بشیر کو صرف ۷۶۶ ووٹ مل سکے- صوبائی حلقہ پنڈی بھٹیاں سے پیپلزپارٹی کے امیدوار چوہدری احسان احمد متوسط طبقہ سے تعلق رکھتے تھے- انہیں شہری محاذ کے ساتھ ساتھ خرم چوریڑہ کے سیدوں، کھرلوں اور دیگر اہم برادریوں کی حمایت بھی حاصل تھی مگر وہ تھانہ جلالپور سے خاطر خواہ حمایت حاصل نہ کر سکے- چنانچہ اسلامی جمہوری اتحاد کے امیدوار انتصار حسین بھٹی کو شکست دینے میں ناکام رہے- انتصار حسین بھٹی نے ۲۱۵۶۲، چوہدری احسان احمد نے ۱۷۴۶۴، رائے مشرف سلطان نے ۲۳۰۲، شفقت حسین بھٹی نے ۱۴۱۳ء حاجی سارنگ خان نے ۸۳۴، محمد شفیع ندیم نے ۲۰۴، میاں نصیر حسین بھٹی نے ۷۸۵ اور محمد نواز نے ۱۹۰ ووٹ حاصل کئے تھے- صوبائی حلقہ سکھیکی ۸۰ سے چوہدری مہدی حسن بھٹی (اسلامی جمہوری اتحاد) نے ۲۹۶۶۶ ووٹ لے کر کامیابی حاصل کی- ان کے مخالف امیدواروں افضل حسین تارڑ کو ۲۴۶۰۷ اور ارشاد اللہ کو ۱۰۹۵ ووٹ حاصل ہو سکے- (۸۵)

قومی وصوبائی الیکشن ۱۹۹۰ء :

۱۹۸۸ء کے الیکشن کو دو سال کا عرصہ ہی گزرا تھا کہ بے نظیر بھٹو اور نواز شریف کی محاذ آرائی کے نتیجے میں اسمبلیوں کا ایک مرتبہ پھر خاتمہ ہو گیا اور ۱۹۹۰ء کے آخر میں نئے انتخابات کا ڈول ڈالا گیا۔ اس مرتبہ تحصیل حافظ آباد کے حلقہ قومی اسمبلی کے لیے پیر محمد عارف شاہ (آئی جے آئی)، ملک وزیر اعوان (پیپلز پارٹی)، چوہدری افضل حسین تارڑ (آزاد) اور میاں رضا علی خاں بھٹی (آزاد) میدان میں اترے۔ چوہدری افضل حسین نے پہلے پیپلز پارٹی کا ٹکٹ حاصل کرنے کی بھرپور کوشش کی لیکن ناکام رہے اور آزاد حیثیت سے الیکشن میں حصہ لیا۔ اپنی تمام تر انتخابی مہم میں وہ غیر سرکاری طور پر پی پی پی کا امیدوار ہونے کا دعوی کرتے رہے کیونکہ پیپلز پارٹی کا ناراض دھڑا ان کے ساتھ تھا۔ دوسری طرف میاں رضا علی خاں اس لیے امیدوار بنے تھے کہ وہ اپنے بھتیجے میاں انتصار حسین بھٹی جو آئی جی آئی کے صوبائی امیدوار تھے کے لیے مشکلات اور رکاوٹ پیدا کر سکیں۔ پولنگ ہوئی تو چوہدری افضل حسین تارڑ جو بظاہر آزاد امیدوار تھے لیکن پی پی پی کے کارکنوں کی انہیں بھرپور حمایت حاصل تھی کامیاب رہے۔ اس کامیابی کے فوراً بعد وہ میاں نواز شریف کے ساتھ مل گئے اور جلد ہی ان کے جانثار ساتھی بن گئے۔ انہوں نے ۴۹۴۰۶، سید محمد عارف حسین شاہ نے ۴۰۱۷، ملک وزیر اعوان نے ۲۳۱۰۹ اور میاں رضا علی خاں بھٹی نے ۷۴۴۷ ووٹ حاصل کیے۔

صوبائی حلقہ ۸۱ پنڈی بھٹیاں سے میاں انتصار حسین (آئی جے آئی) میاں شاہد حسین بھٹی (پی پی پی) میاں نصیر حسین بھٹی (آزاد) اور چودھری امداد اللہ تارڑ آزاد امیدوار کے مابین مقابلہ ہوا۔ کامیابی میاں انتصار حسین بھٹی کو حاصل ہوئی۔ انہوں نے ۲۶۰۹۷ ووٹ حاصل کئے تھے۔ جبکہ ان کے مدمقابل امیدواروں شاہد حسین بھٹی کو ۱۵۴۳۵، حاجی امداد اللہ کو ۸۲۱۲ اور میاں نصیر حسین بھٹی کو ۹۹۸ ووٹ حاصل ہوئے تھے۔ تحصیل حافظ آباد کے صوبائی حلقہ ۸۰ (سکھیکی، کالیکے منڈی) سے چوہدری مہدی حسن بھٹی (آئی جے آئی) اور چوہدری سرفراز حسین (پی پی پی) کے مابین مقابلہ تھا۔ چوہدری مہدی حسن بھٹی نے سرفراز خان کے ۲۲۰۲۵ ووٹوں کے مقابلے میں ۳۴۳۱۹ ووٹ حاصل کر کے کامیابی حاصل کی۔ حافظ آباد کی شہری نشست پر آئی جے آئی کے امیدوار نور محمد تارڑ ۱۲۶۴۹ ووٹ حاصل کر کے کامیاب ہوئے تھے۔ ان کے مدمقابل ناکام امیدواروں میں جمشید عباس تھیم (پی پی پی) نے ۱۲۳۲۹، ملک فیاض احمد اعوان نے ۱۱۶۲۵ اور بریگیڈیئر افتخار بشیر نے ۷۸۱۳ ووٹ حاصل کئے تھے۔ (۸۶)

ان انتخابات نے علاقے کی سیاست کا رخ بدلنے میں اہم کردار ادا کیا۔ چوہدری محمد افضل تارڑ، مہدی حسن بھٹی اور انتصار حسین بھٹی ایک ہی جماعت مسلم لیگ میں شامل ہونے کے باوجود

علاقائی سطح پر متضاد دھڑوں میں تقسیم تھے - پنڈی بھٹیاں کا شہری محاذ انتصار حسین بھٹی کا مخالف مگر افضل تارڑ کا اتحادی تھا - اسی طرح چوہدری افضل حسین تارڑ اور مہدی حسن بھٹی روایتی حریف تھے - چنانچہ جوں جوں افضل حسین تارڑ اپنے قریبی رشتہ دار جسٹس (ریٹائرڈ) رفیق تارڑ کی وساطت سے نواز شریف کے قریب ہوتے گئے توں توں مہدی حسن بھٹی اور میاں انتصار حسین بھٹی مسلم لیگ سے دور ہوتے گئے - چنانچہ ۱۹۹۳ء میں جب صدر غلام اسحاق کی طرف سے نواز شریف حکومت کو برطرف کیا گیا اور اس دوران پنجاب میں نواز شریف کے دست راست وزیر اعلیٰ غلام حیدر وائیں کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک پیش کی گئی تو تحصیل پنڈی بھٹیاں کے ان دونوں اراکین صوبائی اسمبلی نے غلام حیدر وائیں کے خلاف ووٹ دیا اور ان کے مقابلے میں میاں منظور احمد وٹو کا ساتھ دیا -

انتظامی تبدیلی :

مہدی حسن بھٹی اور انتصار حسین بھٹی نے اس حکمت عملی کا فائدہ یہ اٹھایا کہ وہ منظور احمد وٹو سے حافظ آباد کو ضلع اور پنڈی بھٹیاں کو سب ڈویژن ہوانے میں کامیاب ہو گئے - اس طرح جولائی ۱۹۹۲ء سے علاقے کی جغرافیائی اور انتظامی حالت میں تبدیلی واقع ہو گئی - تحصیل پنڈی بھٹیاں میں، پنڈی بھٹیاں، جلالپور، رسول پور، سکھیے منڈی اور کالیکے منڈی کے علاقوں کو شامل کیا گیا اور یہاں اسسٹنٹ کمشنر کا تقرر کیا گیا - بعد ازاں سول جج کی عدالت بھی قائم کر دی گئی - ان تبدیلیوں کے نتیجے میں یہاں کے عوام کی سہولتوں اور ترقی کے مواقع میں بھی اضافہ ہو تا گیا -

بلدیاتی الیکشن ۱۹۹۱ء :

مذکورہ انتظامی تبدیلی سے کچھ عرصہ قبل ۱۹۹۱ء میں پنجاب میں بلدیاتی انتخابات منعقد ہوئے - اس مرتبہ بھٹی اور تارڑ گروپ کے درمیان مقابلہ تھا - جن کی قیادت علی الترتیب انتصار حسین بھٹی ایم پی اے اور افضل حسین تارڑ ایم این اے اور آرائیں گروپ کے ہاتھ میں تھی - انتخابات میں جعلی ووٹروں کے اندراج اور شناختی کارڈوں کے اجراء کی ایک نئی مثال قائم کی گئی - لیکن کامیابی بھٹی گروپ کے حصے میں آئی مگر اس گروپ کی سرکردہ شخصیت میاں حق نواز بھٹی کو شکست کا سامنا کرنا پڑا - چنانچہ ان کی جگہ فضل عباس بھٹی کو چیئرمین اور چوہدری حسن محمد کو وائس چیئرمین منتخب کیا گیا - دیگر منتخب کونسلرز میں شیخ محمد وارث، میاں نصیر حسین بھٹی، میاں نوازش علی بھٹی، محمد یوسف صاحب، چوہدری محمد رفیق آرائیں، انصر عباس بھٹی، شیخ بشیر پہلوان، میاں

رفیق حسین بھٹی، مہر محمد امین، شیخ تنویر احمد اور حاجی محمد یعقوب شامل تھے۔ انتخابات میں چوہدری محمد رفیق خود تو کامیاب ہو گئے مگر ان کے دونوں بیٹوں کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ شہری سطح پر شکست کے برعکس علاقے کی ۶ یونین کونسلوں میں چار کے انتخابات تارڑ گروپ نے جیتے جبکہ ۲ پر بھٹی گروپ کامیاب رہا تھا۔ یونین کونسلوں سے منتخب ہونے والے چیئرمینوں میں (۱) چوہدری محمد رشید (بدر علی) (۲) محمد اشرف خرم چوہریڑہ (۳) مہر محمد آفتاب ہندوانہ (۴) رائے محمد حیات (ٹھٹھہ خیر و مثمل) محمد نذیر بھٹی مرزا بھٹیاں اور قمر جاوید ایڈووکیٹ (کوٹ نکہ) شامل تھے۔

سانحہ پنڈی بھٹیاں :

یہ وہ زمانہ تھا جب ایک طرف دلے کی بار کے سینکڑوں دیہات دریائے چناب کے سیلابی پانی میں ڈوبے ہوئے تھے اور ہزاروں لوگ بے سروسامانی کی حالت میں اپنے گھروں سے بے گھر ہو کر ادھر ادھر پناہ لیے ہوئے تھے تو دوسری طرف ایک ایسا سانحہ رونما ہوا کہ جس نے قصبہ کے ہر چوتھے گھر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ اس سانحہ کی ابتداء یوں ہوئی کہ لاہور روڈ پر مسمیان محمد آصف اور عمر دراز کی ملکیتی کریانہ کی دوکان میں چوری کی واردات ہو گئی۔ اس شبہ میں پولیس چودہ پندرہ سالہ حافظ میر احمد بھٹو نامی لڑکے کو پکڑ کر لے گئی جس کا گھر واردات کی جگہ کے پچھواڑے میں واقع تھا۔ پولیس نے اس پر پانچ چھ روز تک اس قدر بہیمانہ تشدد کیا کہ وہ ۲۸ ستمبر ۱۹۹۲ء کو دم توڑ گیا۔ اتفاق سے اس روز پنجاب کے وزیر اعلیٰ غلام حیدر وائیں علاقے میں سیلاب کی تباہ کاریاں دیکھنے کے لیے یہاں آئے ہوئے تھے۔ متوفی کے لواحقین وزیر اعلیٰ کے روبرو پیش ہو گئے اور پولیس پر قتل کا مقدمہ درج کرنے کا مطالبہ کیا۔ اس پر وزیر اعلیٰ نے تحقیقات کا حکم صادر کر دیا۔ لیکن اگلے روز پوسٹ مارٹم کے بعد متوفی کا جنازہ اٹھا تو لوگ مشتعل ہو گئے۔ اس اشتعال انگیزی میں کچھ جذباتی نوجوانوں نے پہلے تھانے کو آگ لگائی پھر اس سے ملحقہ بابو محمد اسحاق کے کارخانے کو جلا دیا۔ اس پر پولیس تھانے کے اندر محصور ہو کر رہ گئی۔ یہ کارروائی کرنے کے بعد متوفی کا جنازہ پڑھا گیا لیکن اتنے میں انتظامیہ کی مدد کے لیے حافظ آباد اور سکھیکی سے بھاری تعداد میں پولیس نفری بھی پہنچ گئی۔ پھر کیا تھا، بندوقوں کی گولیاں تھیں اور آنسو گیس کے گولے۔ جنازہ پڑھنے والے تمام لوگوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ پورے شہر میں سناٹا چھا گیا۔ پولیس کے ہتھے جو چڑھا اسے حوالاتوں میں ٹھونس دیا گیا۔ بیسیوں بے گناہ مسافر، جوان، بچے، بوڑھے دھر لیے گئے۔ اس موقع پر سیاسی مخالفوں اور پولیس انسپکٹر عباس خاں نے سیاسی انتقام کی آگ بھی خوب ٹھنڈی کی۔ مخالفوں کو چن چن کر ان کے گھروں پر چھاپے مروائے ان کی عورتوں کی بے حرمتی اور مردوں کو ذلیل و خوار کروایا۔ خوف اور دہشت کی اس فضا

میں کئی افراد بوریا بستر لے کر شہر چھوڑ گئے- ۱۱۲ گرفتار شدگان اور ۲۹ دیگر افراد پر لوٹ مار، آتش زنی، قومی پرچم جلانے اور دہشت گردی کی جائز و ناجائز دفعات کے مقدمے بنا دیئے گئے- ان میں بلدیہ کے چیئرمین فضل عباس بھٹی کے علاوہ وائس چیئرمین چوہدری حسن محمد کے سات بیٹے بھی شامل تھے- بالآخر اخبارات میں اس ظلم و ستم کے خلاف چرچا ہوا اور ہائیکورٹ میں رٹ دائر کی گئی تو سانحہ کی تحقیقات شروع ہوئی- اس طرح کئی بے گناہوں کو مہینوں کی صعوبتوں کے بعد رہائی نصیب ہوئی، کچھ کی ضمانتیں ہو گئیں- بالآخر دو سال کی مقدمہ بازی اور تحقیقات کے بعد حکومت اور بابو محمد اسحاق کی طرف سے مقدمہ واپس لے لیا گیا اور لوگوں کو اس عذاب سے نجات حاصل ہوئی- لیکن یہ سانحہ شہر کی سیاسی و سماجی زندگی پر اثرات مرتب کرنے کے علاوہ اپنے پیچھے گہری نفسیاتی دشمنیاں بھی چھوڑ گیا-

نیا انتخابی معرکہ ۱۹۹۳ء :

انہی مذکورہ سیاسی اثرات کے تحت ۱۹۹۳ء میں قومی و صوبائی انتخابات ہوئے تو علاقے کی سیاسی فضا تبدیل ہو کر رہ گئی- تحصیل پنڈی بھٹیاں کے دونوں صوبائی حلقوں کے ممبران چوہدری مہدی حسن بھٹی اور انتصار حسین بھٹی جو پہلے نواز شریف کا ساتھ چھوڑ کر جونیجو گروپ میں شامل ہوئے تھے اور اس کے بدلے میں حافظ آباد کو ضلع اور پنڈی بھٹیاں کو تحصیل کا درجہ دلانے میں کامیاب ہوئے تھے- وٹو کی کمزور سیاسی پوزیشن کو دیکھتے ہوئے پیپلز پارٹی میں شامل ہو گئے- مہدی حسن بھٹی کے مسلم لیگ چھوڑنے کی ایک وجہ یہ تھی کہ ان کے اصل علاقائی سیاسی حریف چوہدری افضل حسین تارڑ نواز مسلم لیگ میں شامل تھے اور انہیں نواز شریف کی کافی قربت حاصل ہو چکی تھی- اسی بنا پر مسلم لیگ (ن) نے انہیں اس حلقے سے قومی اسمبلی اور صوبائی اسمبلی کے لیے امیدوار نامزد کیا- پیپلز پارٹی نے بھی انہی دونوں حلقوں کے لیے چوہدری مہدی حسن بھٹی کو امیدوار نامزد کیا جبکہ حلقہ پنڈی بھٹیاں کے لیے پیپلز پارٹی نے میاں انتصار حسین بھٹی کو ٹکٹ دیا- ان کے مقابلے میں مسلم لیگ (ن) نے ان کے چچا میاں حق نواز بھٹی کو لا کھڑا کیا- پہلی مرتبہ ذیلدار خاندان کی اندرونی نفسیاتی تقسیم عملی طور پر سیاسی تقسیم میں بدل گئی تھی- پنڈی بھٹیاں کا آرائیں گروپ جو ہمیشہ اپنی بقاء ذیلدار بھٹیوں کی مخالفت میں سمجھتا آیا تھا- اس تقسیم کا فائدہ اٹھا کر ذیلدار خاندان کے اصل وارث میاں حق نواز بھٹی کے ساتھ وابستہ ہو گیا- اس حلقے میں مذکورہ امیدواروں کے علاوہ شاہد حسین بھٹی (آزاد)، مرزا ظفر سلیم (سپاہ صحابہ)، نصیر حسین بھٹی (آزاد) اور سیٹھ عبدالرحمٰن (آزاد) بھی میدان میں تھے- اسلامی فرنٹ کا یہاں کوئی امیدوار نہیں

تھا- جماعت اسلامی نے سپاہ صحابہ کے امیدوار کی بجائے آزاد امیدوار شاہد حسین کی حمایت کی تھی- جبکہ قومی اسمبلی کی نشست پر مسلم لیگی امیدوار کی حمایت کی- انتخابی مہم کے دوران بے نظیر بھٹو اور میاں نواز شریف نے حافظ آباد میں بھاری بھر کم جلسوں سے خطاب کیا- مگر نتائج پورے ضلع میں پیپلز پارٹی کے امیدواروں کے حق میں بر آمد ہوئے- پیپلز پارٹی کے قومی اسمبلی کے امیدوار چوہدری مہدی حسن بھٹی نے مسلم لیگ کے امیدوار چوہدری افضل حسین تارڑ کو بری طرح شکست دی- انہیں ۵۷۸۱۲، جبکہ افضل حسین تارڑ کو ۵۷۰۶۶ ووٹ حاصل ہوئے تھے- اسی طرح صوبائی حلقہ (سکھیکے، کالیکے، کولو تارڑ) میں بھی مہدی حسن بھٹی نے افضل تارڑ کے ۲۰۶۴۱ ووٹوں کے مقابلے میں ۳۵۷۷۰ ووٹ حاصل کر کے کامیابی حاصل کی- پنڈی بھٹیاں کے صوبائی حلقہ ۸۱ میں بھی پی پی پی کے امیدوار میاں انصار حسین بھٹی کامیاب رہے- ان کے حریف میاں حق نواز بھٹی مسلم لیگ (ن) نے بری طرح شکست کھائی اور پنجاب بھر میں مسلم لیگ (ن) کے سب سے کم ووٹ لینے والے امیدوار کی حیثیت اختیار کر گئے- انصار حسین بھٹی نے ۲۵۷۰۸ حق نواز بھٹی نے ۶۳۴۰، شاہد حسین بھٹی نے ۱۷۷۷۶، مرزا ظفر سلیم نے ۱۴۳۰، نصیر حسین بھٹی نے ۵۳۰ اور سیٹھ عبد الرحمٰن نے ۱۳۹ ووٹ حاصل کئے تھے- حافظ آباد شہر کی صوبائی نشست پر مسلم لیگ کے امیدوار سید عارف حسین شاہ نے ۱۹۸۹۴ ووٹ حاصل کر کے کامیابی حاصل کی جبکہ ان کے مد مقابل پیپلز پارٹی کے امیدوار ملک وزیر اعوان ۱۶۰۱۵ ووٹ حاصل کر سکے تھے-(۸۷)

قومی و صوبائی الیکشن ۱۹۹۷ء :

اگلے انتخاب کے موقع پر ضلع کی سیاست میں ایک مرتبہ پھر تبدیلی واقع ہو گئی- پورے ملک کی طرح اس علاقے میں بھی نواز شریف کی سیاست نے اثرات دکھائے تھے- چنانچہ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ الیکشن ۱۹۹۷ء کے موقع پر یہاں پیپلز پارٹی کا کوئی امیدوار بھی کامیاب نہ ہو سکا- قومی اسمبلی کی نشست پر مسلم لیگ (ن) کے امیدوار چوہدری افضل حسین تارڑ نے سابقہ بدلہ چکاتے ہوئے پی پی پی کے امیدوار چوہدری مہدی حسن بھٹی کو واضح شکست دی- اسی طرح صوبائی حلقہ ۸۰ (سکھیکی، کالیکے، کولو تارڑ) میں بھی مہدی حسن بھٹی کے بھائی نذر عباس بھٹی کو مسلم لیگ (ن) کے امیدوار سر فراز حسین بھٹی کے مقابلے میں شکست کا سامنا کرنا پڑا- سر فراز بھٹی نے ۲۷۲۰۵ جبکہ نذر عباس بھٹی نے ۲۱۹۹۷ ووٹ حاصل کئے تھے- صوبائی حلقہ پنڈی بھٹیاں میں پیپلز پارٹی کے سابقہ ایم پی اے انصار حسین بھٹی پیپلز پارٹی کی حکومت کے خاتمے کے ساتھ ہی دوبارہ نواز شریف سے جا ملے اور ان کی طرف سے حلقے میں امیدوار بن گئے- اس الیکشن میں بھی انہوں نے ۱۹۵۳۸ ووٹ

لے کر کامیابی حاصل کی۔ ان کے مد مقابل میاں شاہد حسین بھٹی (آزاد) نے ۱۳۲۱۹، سید شعیب شاہ نواز نے ۱۱۹۷۰، نصیر حسین بھٹی نے ۲۷۸ اور شفقت حسین بھٹی نے ۵۲۸ ووٹ حاصل کئے تھے۔ آزاد امیدوار سید شعیب شاہ نواز خرم چوہر یڑہ کے گدی نشین ہیں اور انہیں مذہبی ووٹروں کے علاوہ علاقے کے بھٹی مخالف گروپوں کی بھی مکمل حمایت حاصل تھی۔ حافظ آباد کے صوبائی حلقے میں پیر سید عارف شاہ، جمشید عباس تھہیم کو شکست دے کر کامیاب ہوئے۔ اس طرح پورے ضلع میں مسلم لیگ (ن) کے امیدوار کامیاب ہو گئے تھے۔ (۸۸)

بلدیاتی الیکشن ۹۹-۱۹۹۸ء :

یہ انتخابات نئی حلقہ بندیوں کے مطابق منعقد ہوئے اور ان کے تحت شہر کو کل ۱۹ وارڈوں میں تقسیم کیا گیا۔ مئی ۱۹۹۸ء میں منعقد ہونے والے ان انتخابات میں آرائیں گروپ نے کامیابی حاصل کی اور چوہدری محمد شفیق چیئرمین جبکہ شیخ تنویر احمد، چوہدری حسن محمد اور ذوالفقار علی شعلہ وائس چیئرمین کے عہدوں پر فائز ہوئے۔ ان میں چوہدری حسن محمد تیسری مرتبہ اس عہدے پر فائز ہوئے اور بلدیہ کی تاریخ میں ایک ریکارڈ قائم کیا۔ دیگر منتخب ہونے والے کونسلرز میں فضل عباس بھٹی، محمد شفیق ٹھیکیدار، محمد نصر اللہ، عمر دین ناصر، مہر محمد امین زاہد، محمد اسلم مسن، تنویر حسین بھٹی اور چوہدری جمیل احمد کے نام نمایاں ہیں۔

علاوہ ازیں بلدیہ جلالپور سے میاں شاہد حسین بھٹی اور سکھیکی سے ناصر علی چیئرمین منتخب ہوئے۔

دلے دی بار کے اہم قصبے

جلالپور بھٹیاں :

جلالپور ایک قدیم قصبہ ہے جس کے کھنڈر آج تک کوٹلہ انند اور موضع بہاؤالدین کے نواح میں کم وبیش پندرہ بیس مربع میل کے رقبہ میں پھیلے ہوئے ہیں- موجودہ جلالپور بھٹیاں، جلالپور کہنہ کی تباہی کے بعد ایک نئی آبادی کے طور پر تقریباً تین صدیاں قبل معرض وجود میں آیا- یہی وجہ ہے کہ محکمہ مال اور محکمہ ڈاک کے ریکارڈ میں اسے جلالپور نو لکھا جاتا رہا- البتہ عام لوگوں میں اسے جلالپور بھٹیاں کہا جانے لگا- اس قصبہ کی تشکیل کے بارے میں کچھ دیگر روایات بھی موجود ہیں- مثلاً یہ کہ اس کی بنیاد مغلوں کے عہد میں یار محمد بھٹی نے رکھی اور ابتدا میں اس کا نام کوٹ یار محمد رکھا- چونکہ اس سے پہلے قصبہ جلالپور کہنہ اس کے قرب میں موجود تھا چنانچہ اس کا نام بھی جلالپور مشہور ہو گیا- ایک اور روایت کے مطابق جلالپور بھٹیاں کو احمد خاں بھٹی نے اپنے بیٹے جلال خاں کے نام پر آباد کیا تھا- جلالپور قصبہ کے نام سے ایک اور دلچسپ لوک داستان بھی سنائی جاتی ہے کہ مغلوں کے عہد میں ایک شخص جلال نامی کو پنڈی بھٹیاں کے علاقہ سے سرکاری کارندے ٹیکس ادا نہ کرنے کی پاداش میں گرفتار کر کے حافظ آباد کی طرف لے جا رہے تھے جہاں اس زمانے میں قاضی کی عدالت ہوتی تھی- اس وقت قصبہ جلالپور موجودہ نہیں تھا البتہ چند کوس آگے رام پور (موجودہ رسول پور) آباد تھا- سرکاری کارندے آرام کی غرض سے یہاں رکے تو گاؤں کے سردار رام نے جلال کو بیڑیوں میں جکڑے دیکھ کر وجہ پوچھی- سپاہیوں نے وجہ بیان کی تو رام کو جلال پر ترس آ گیا اور اس نے سپاہیوں کو کہا کہ اگر وہ اس کی واجب الادا رقم ادا کر دے تو کیا وہ اسے چھوڑ دیں گے- سپاہی اس پر راضی ہو گئے- یہ معاملہ ابھی طے ہو رہا تھا کہ رام کی خوبصورت جوان لڑکی اپنی حویلی کی چھت پر چڑھ کر سارا منظر دیکھنے لگی- اتنے میں رام سپاہیوں کو رقم ادا کرنے کے لیے گھر پہنچ گیا- اسی اثناء میں رام کی بیوی نے اپنی لڑکی کو چھت پر چڑھ کر باہر کی طرف جھانکتے ہوئے دیکھا تو طنزاً کہا کہ تم خسم (خاوند) کو کیا دیکھ رہی ہو نیچے اتر آؤ- یہ الفاظ کہنے تھے کہ رام جلدی سے رقم ادا کر کے جلال کو اپنے گھر لے آیا اور جلال کو اپنی بیٹی سے شادی کرنے کی پیشکش کر دی- اس پر جلال نے معذوری ظاہر کی کہ وہ تو مسلمان ہے اور ایک ہندو لڑکی سے شادی نہیں کر سکتا- رام نے اسی وقت کلمہ پڑھا اور بیٹی کو بھی پڑھایا اور مسلمان ہونے کے بعد اپنی بیٹی کو جلال کے عقد میں دے کر بیوی کے طعنے کی تکمیل

کر دی- کچھ عرصہ بعد رام نے جلال کو موجودہ مقام جلالپور بھٹیاں لا کر آباد کیا اور آہستہ آہستہ یہ آبادی جلالپور کے نام سے موسوم ہوتی گئی- یہ واقعہ حقیقت ہے یا محض افسانہ بہر حال جلالپور ایک قدیم آبادی کا قصبہ ہے-

۱۸۰۱ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ اس پر حملہ آور ہوا اور مقامی آبادی کو نیست و نابود کیا- رنجیت سنگھ نے قصبہ کو خوب لوٹا اور مالکوں سے ملکیت چھین لی- اس دوران مقامی بھٹی قبیلہ نے جھنگ کے سیالوں کے ہاں جا کر پناہ لی- بھٹیوں کے اخراج کے بعد وقتی طور پر آرائیوں اور کھتریوں کا اس پر قبضہ رہا- آخر جب انگریزوں نے سردار چتر سنگھ و شیر سنگھ اٹاری والا کی سرکوبی کے لیے کارروائی کی تو جلالپور کے بھٹیوں نے انگریزوں کے ساتھ مکمل تعاون کیا اور ان کو رسد خانے کی خدمات فراہم کیں- اس کے صلے میں ان کی ملکیت بحال کر دی گئی- اس زمانے میں قصبہ ایک مضبوط شہر پناہ میں گھرا ہوا تھا اور فصیل پر رات کو ایک توپ گشت کرتی تھی- فصیل کے ارد گرد ایک خندق بھی ہوتی تھی- جہاں قصبہ کا زائد پانی جمع ہو کر آگے ملحقہ برساتی نالے میں جا گرتا تھا- اس برساتی نالے پر ایک قدیم پل آج بھی اپنی شکست و ریخت کے ساتھ موجود ہے اور مشرقی و غربی دروازے آمد و رفت کے لیے پختہ ہوتے تھے- بعد ازاں فصیل ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوتی گئی اور بالآخر پہلی جنگ عظیم کے وقت انگریزی سرکار نے فصیل کی جگہ نیلام کر دی اس طرح اس پر مکانات تعمیر ہوتے گئے اور اس کے نشانات قصہ پارینہ بنتے گئے- فصیل کی نیلامی کے بعد اس کی چھوٹی اینٹیں لوگوں نے اپنے گھروں کی تعمیر میں استعمال کیں یہی وجہ ہے کہ یہاں کے بہت سارے مکانات آج بھی چھوٹی نانک شاہی اینٹوں سے تعمیر شدہ نظر آتے ہیں- ماضی میں یہاں کے مسلمان کھوجے چمڑے اور ہڈیوں کی تجارت میں بڑے مشہور تھے وہ ان اشیاء کو یورپ برآمد کے لیے ارسال کرتے تھے- یہاں کے ہندو کھتری بھی بڑے متمول تھے- تجارت پر زیادہ تر غلبہ انہی کا تھا- مسلمانوں کے پاس چند گنتی کی دکانیں تھیں- یہی وجہ ہے کہ ان کی اکثریت مفلوک الحال تھی- تقسیم ملک کے بعد بازار کی اکثر دکانیں مہاجر مسلمانوں کی ملکیت میں آ گئیں- یہاں ایک خانقاہ نعمت علی شاہ کی ہے جہاں ہر سال میلہ ہوتا ہے- یہ بزرگ بڑے خدا رسیدہ بزرگ تھے اور ان کے مزار کی تعمیر میں میاں چنن نے بنیادی حصہ لیا تھا- ۱۹۳۱ء کی مردم شماری کے مطابق جلالپور بھٹیاں کی آبادی ۲۱۴۲ نفوس پر مشتمل تھی- ۱۸۸۴ء سے پہلے یہاں میونسپلٹی قائم تھی- بعد ازاں اس کو ختم کر دیا گیا اور دوبارہ ۱۹۷۷ء میں ٹاؤن کمیٹی قائم کی گئی- ۱۹۴۱ء کی مردم شماری کے مطابق قصبہ میں ایک ہزار ایک سو ستاسی گھر اور ایک سو تین دکانیں اور دو ہزار پانچ سو تراسی آبادی تھی- آج کل اس کی آبادی بیس ہزار کے لگ بھگ ہے- یہاں ایک تھانہ، ٹاؤن کمیٹی، لڑکوں اور لڑکیوں کے متعدد سکول اور چاول چھڑنے کے کئی

کارخانے ہیں- یہ قصبہ اب پنجاب میں چاول کی بڑی منڈی کے طور پر مشہور ہے-

جلالپور (کہنہ):

زمانہ قدیم میں ایک قصبہ جلالپور کے نام کا آباد تھا- اس کا قصبہ ویران پڑا ہوا تھا- پھر ۴۶۰ برس کے بعد مسمیان ناصر و کھوکھر زمینداراں قوم چدھڑ نے اس کو آباد کر کے قدیم نام پر موسوم کیا- احمد شاہ ابدالی کے حملے کے دوران پھر دوبارہ برباد ہو گیا- پھر عرصہ تک ویران رہا اور اس کے بعد کچھ آبادی ہو گئی جو جلالپور کہنہ کہلایا- خیال ہے کہ یہ قصبہ جلال الدین خلجی کے زمانے میں آباد ہوا تھا- اس وقت یہ ایک معروف شاہراہ کے سنگم پر واقع تھا جو ملتان سے کشمیر کی طرف جاتی تھی- ایک انتہائی قدیم مسجد جسے شاہی مسجد کے نام سے پکارا جاتا ہے یہاں اب بھی قصبے کی قدامت کی شہادت دیتی ہے- ایک قیاس یہ بھی ہے کہ جلالپور کہنہ کے قرب میں جلال الدین نامی جو بزرگ مدفون ہیں ان کے نام سے یہ قصبہ موسوم ہوا- راجہ رنجیت سنگھ نے جب اس قصبہ پر قبضہ کرنا چاہا تو تھوڑے سے مقابلہ کے بعد یہاں کے لوگوں نے اطاعت قبول کر لی- یہاں ایک خانقاہ خضر سلطان فقیر کے نام سے مشہور ہے- ہر سال پھاگن کے مہینے میں وہاں میلہ لگتا ہے- ۱۸۷۰ء میں مطابق تاریخ مخزن پنجاب اس قصبہ میں ۲۱۷ دکانیں اور ۱۹۳۰ افراد آباد تھے- (۸۹) اس کے قرب میں جلالپور بھٹیاں آباد ہو جانے کی وجہ سے اس کی ترقی میں زیادہ اضافہ نہیں ہو سکا ہے اور اس کی آبادی اور پھیلاؤ محدود ہو کر رہ گیا اور یہ جلالپور بھٹیاں کا ہی ایک حصہ بن گیا-

رسولپور تارڑ:

پنڈی بھٹیاں سے حافظ آباد کے عین وسط میں واقع رسولپور تارڑ کا قدیم نام رام پور تھا- یہاں زیادہ آبادی ہندوؤں کی تھی- قیام پاکستان سے قبل مسلمانوں نے اس کا نام تبدیل کرنے کا مطالبہ کیا تو یہاں کے مسلمانوں اور ہندوؤں میں جھگڑا پیدا ہو گیا- یہاں کے مسلمان تارڑ زمیندار با اثر تھے چنانچہ مسلمانوں نے ہندوؤں کو یہاں سے نکال باہر کیا- تمام ہندو گاؤں چھوڑ کر رسولپور سے تین میل دور جا بسے اور رام پور نو کے نام سے گاؤں بسایا جو آج کل نوروز پور کہلاتا ہے- ہندوؤں نے دہلی بمبئی اور مدراس کے ہندوؤں کے پاس جا کر اپنی مظلومی کی جھوٹی سچی داستانیں سنائیں- اس پر وہاں کے رئیس ہندوؤں کی مدد سے یہاں خالص ہندو آبادی کا شہر آباد کرنے کا منصوبہ بنایا گیا- مگر ان کا منصوبہ تحریک قیام پاکستان کی وجہ سے پایہ تکمیل تک نہ پہنچ سکا- یہاں کے تارڑ زمیندار سیاسی اثر و رسوخ کے مالک ہیں- یہ یہاں ڈیڑھ صدی قبل دریائے چناب کے کنارے آباد موضع مظفر سے اٹھ

کر آباد ہوئے- یہاں لڑکوں کا ایک ہائی اور لڑکیوں کا مڈل سکول ہے- ۱۹۴۶ء کے الیکشن میں یہاں کے راج محمد تارڑ مسلم لیگ کے ممبر صوبائی اسمبلی منتخب ہوئے تھے- علاوہ ازیں یہاں کے چوہدری ارشاد اللہ تارڑ بھی قومی اسمبلی کے رکن رہے- مگر یہاں کی پسماندگی جاگیرداروں کے روایتی رویوں کی پوری طرح عکاسی کرتی ہے-

سکھیکی منڈی :

دلابھٹی کے مرکز پنڈی بھٹیاں سے مشرق کی طرف بیس کلومیٹر کے فاصلے پر لاہور روڈ پر واقع قصبہ سکھیکی منڈی دو صدیاں قبل محض ایک چھوٹا سا گاؤں تھا- ۱۸۷۷ء کی مردم شماری کے مطابق یہاں کی آبادی ایک ہزار سے بھی کم تھی- اس کے چند سال بعد وزیر آباد ریلوے لائن بچھائی گئی تو یہاں ریلوے اسٹیشن قائم ہو گیا- اس کے ساتھ ہی سکھیکی کی ترقی کو بھی فروغ ہوا- چنانچہ اب اس کی آبادی پندرہ ہزار سے زیادہ ہے- یہاں ایک ٹاؤن کمیٹی، تھانہ، ہسپتال، لڑکوں کے لیے دو اور لڑکیوں کے لیے ایک ہائی سکول بھی ہے- اجناس کا یہاں کاروبار معقول ہوتا ہے- سکھیکی کی وجہ تسمیہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ یہ گاؤں ایک سکھ نامی شخص نے آباد کیا تھا اور اسی کے نام کی مناسبت سے سکھیکی مشہور ہوا-

کالیکے :

کالیکی منڈی جو پہلے اس کے بانی کالو کی نسبت سے "کالو کے" کے نام سے پکارا جاتا تھا بھی سکھیکی کی طرح ماضی قدیم میں کوئی قابل ذکر مقام نہیں تھا اور اس کی ترقی و فروغ بھی یہاں تقریباً سو سال قبل ریلوے لائن بچھنے اور اسٹیشن قائم ہونے کے نتیجے میں ہوا- یہاں تھانہ، لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے ہائی سکول اور اجناس کی منڈی قائم ہے-

کولو تارڑ :

آج سے تقریباً چار سو سال بیشتر مسمی کولو تارڑ نے موضع سیدو ضلع گجرات سے اٹھ کر نالہ وگھ کے کنارے خانہ بدوشوں کی حیثیت سے اپنے قیام کی جگہ مقرر کی اور قریبی مواضعات سے کچھ زمین مستعار لے کر کاشت کاری شروع کی- اس کے قیام کے سبب اور بھی کئی زمیندار یہاں مقیم ہونے لگے- ایک دفعہ کولو کی لڑائی احمد پور کے زمینداروں کے ساتھ ہو گئی- دو تین آدمی مارے گئے جس کے بدلے میں کولو کے چھ بیٹوں اور خود کو پھانسی ملی اور یہ بستی ویران ہو گئی- صرف کولو

کی بیوی رامدئی جو حاملہ تھی جان بچا کر جنگل میں نکل گئی- وہاں اس کو ایک فقیر خدا پرست ملا- جس نے اس کے حال زار پر رحم کھا کر کہا کہ تیرے شکم میں جو لڑکا ہے وہ صاحب اقبال ہو گا مگر جب پیدا ہو تو اس کو مسلمان بنا کر اسلامی نام سے پکارنا- عورت نے فقیر کی بات مان لی- لڑکا پیدا ہوا تو اس کا نام مرزا رکھا اور ختنہ کرا کر مسلمان بنایا- جب یہ لڑکا بڑا ہوا تو صاحب حوصلہ نکلا اور بادشاہ کے دربار میں اس کی رسائی ہو گئی- بادشاہ نے اس کو قوم تارڑ کے چالیس دیہات کا نگران اور سردار بنا دیا- اس نے پھر اجڑا ہوا گاؤں آباد کر کے اس کا نام کولو تارڑ رکھا اس دن سے یہ گاؤں مسلسل آباد ہے-

سکھوں کی شورش کے وقت سردار مہان سنگھ نے اس پر قبضہ کرنا چاہا مگر یہاں کے لوگوں نے مقابلہ کیا اور اطاعت قبول نہ کی- راجہ رنجیت سنگھ نے ان کو مطیع کیا- اس گاؤں سے آدھ کوس کے فاصلے پر ایک پرانا تھیہ ہے- اس کے متعلق مشہور ہے کہ راجہ اسکنب نے جو راجہ سالباہن والئی سیالکوٹ کا رشتہ دار تھا یہاں شہر آباد کیا جو انقلابات زمانہ کے سبب اجڑ گیا- نالہ وگھ بھی اس زمانہ سے جاری ہے- اس نالہ کے کنارے پر ایک قطعہ زمین نہایت سفید رنگ کا ہے- اسے گاؤں والے بہت متبرک جانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ پیر عبدالقادر یہاں بیٹھا کرتے تھے- تاریخ مخزن پنجاب ۱۸۷۰ء کے مطابق یہاں ۵۶۷ گھر، ۳۸ دکانیں اور ۸۷۱ آبادی تھی- اب اس کی آبادی میں کئی گنا اضافہ ہو چکا ہے- ایک طویل بازار اور اجناس کا کاروبار یہاں معقول ہوتا ہے-(۹۰)

دیگر مقامات :

دلے کی بار کے دیگر اہم مقامات میں ایک قدیم گاؤں چک بھٹی ہے- یہ گاؤں عالم خاں بھٹی نے آباد کیا تھا اور اس کا نام چک بھٹی رکھا- ۱۸۷۰ء میں یہاں ۴۹۶ گھر تھے اور ۵۷۶ دکانیں جبکہ آبادی ۲۴۷۳ تھی- اب یہاں لڑکوں اور لڑکیوں کے سکول قائم ہیں تعلیم کی شرح عام علاقوں سے زیادہ ہے- اس کے علاوہ کوٹ نکہ جس کے قریب سے نہر جھنگ برانچ گزرتی ہے بھی قابل ذکر مقام ہے یہاں لڑکوں کا ایک ہائی اور لڑکیوں کا مڈل سکول بھی ہے- کوٹ نکہ کے ساتھ ساتھ ٹھٹھہ خیر و مٹمل، ہندوانہ، بدر علی، مرزا بھٹیاں اور خرم چوبزیرہ کے مواضعات اپنی اپنی یونین کونسلوں کے مرکز کی حیثیت رکھتے ہیں- مجموعی طور پر ان تمام کونسلوں میں ۸۷ مواضعات شامل ہیں اور ان کا مجموعی رقبہ ۱۲۵۰۴۵ ایکڑ اور آبادی ایک لاکھ سے زیادہ ہے- اس تمام علاقے میں ۳ ہائی سکول، دو مڈل سکول ۷۷ بوائز پرائمری سکول اور ۴۴ گرلز پرائمری سکول اور ۵ ہیلتھ سنٹر قائم ہیں- ان مقامات میں مچھونکہ، گھبرکہ، قلعہ مراد بخش اور ٹاہلی گورایہ بھی قابل ذکر ہیں-

☆☆☆

دلے دی بار کی گذرگاہیں، دریا، نہریں، نالے

قدیم گذرگاہیں:

دلے دی بار کی قدیم شاہراہوں کو تلاش کیا جائے تو ایک مشہور شاہراہ وہ تھی جو شیر شاہ سوری (۱۵۴۰ء - ۱۵۴۵ء) کے زمانے میں جموں ملتان روڈ کہلاتی تھی- یہ قدیم گزرگاہ شیر شاہ سوری کے زمانے سے پہلے بھی موجود تھی لیکن اس نے اسے ایک عظیم شاہراہ کی شکل دے کر جی ٹی روڈ سے ملا دیا- یہ شاہراہ ملتان سے شروع ہو کر شور کوٹ، چنیوٹ سے گزر کر پنڈی بھٹیاں اور جلالپور پہنچتی اور رسولنگر، علی پور سے ہو کر سیالکوٹ کے علاقوں کو جاملتی ہے اور وہاں سے سیدھی جموں کشمیر کو چلی جاتی ہے- اس شاہراہ پر پڑاؤ کی جگہ پر چوکی، سرائے اور کنویں تعمیر کئے گئے- ایک سرائے پنڈی بھٹیاں (بمقام موجودہ عمارت ٹاؤن کمیٹی) اور جلالپور (موجودہ عمارت تھانہ) میں بھی قائم کی گئی-

تاریخ کی کتاب سیر المتاخرین میں اس قدیم شاہراہ اور قصبہ جلالپور کا ذکر بھی موجود ہے کہ شہنشاہ اکبر کے دور میں جب اس کے چچازاد بھائی حکیم محمد مرزا نے بغاوت کا علم بلند کیا اور اس نے لاہور پر حملہ کر دیا تو اکبر نے راجہ مان سنگھ کو بغاوت فرو کرنے کا حکم دیا- راجہ مان سنگھ کے ہاتھوں شکست کھا کر حکیم محمد مرزا نے لاہور سے کابل کا رخ کیا- سیر المتاخرین کا مصنف اس موقع پر لکھتا ہے-

> "حکیم محمد مرزا براہ جلالپور کے سمولہ حافظ آباد اسب دریائے عبور کردہ
> در بھیرہ رسید و آں شہر را تاخت و تاراج ساخت-"

سکھوں کے عہد میں اس شاہراہ کو مزید ترقی ہوئی کیونکہ دیوان مولراج کا تعلق اکال گڑھ (علی پور چٹھہ) سے تھا اور صوبہ کے گورنر کی حیثیت سے اس کا صدر مقام ملتان تھا اور وہ اسی راستہ سے گزرا کرتا تھا-

دوسری قدیم شاہراہ جو پنڈی بھٹیاں سے گزرتی تھی- وہ لاہور سرگودھا روڈ ہے- آج سے تین سو سال قبل بھی یہ شاہراہوں تک جاتی تھی جس پر افغانوں کے قافلے بذریعہ طالب والا پتن آتے جاتے تھے اور پنڈی بھٹیاں کے بھٹی ان سے جزیہ (ٹکے وصول کرتے تھے- یہی شاہراہ دلا بھٹی کی گزرگاہ بھی رہی ہے- گزرنے والے قافلوں کا کئی مرتبہ بکسیں بھٹی رہائشی سکھیکی سے مقابلہ ہوتا تھا اور بعض اوقات وہ لوٹ مار کا شکار بھی ہو جاتے تھے- بعد میں اس قدیم راستے کو انگریزوں نے ترقی

دی اور انیسویں صدی کے آخر میں اسے پختہ بنادیا گیا-اب طالب والا دریائے چناب پر پل کی تعمیر سے اسے اور جدید بنادیا گیا ہے-

ایک اور قدیم گزر گاہ پنڈی بھٹیاں جھنگ روڈ تھی جو چنیوٹ سے ہو کر جاتی تھی-اس شاہراہ کو ۳۴-۱۹۳۳ء میں پختہ کیا گیا-پنڈی بھٹیاں حافظ آباد روڈ بھی قدیم گزر گاہ ہے اور مغلوں کے عہد میں دلا بھٹی اس گزر گاہ سے گزر کر حافظ آباد پر حملہ آور ہوا تھا-اس قدیم سڑک کو ۱۹۵۱ء میں پختہ کیا گیا-۱۹۵۲ء میں پنڈی بھٹیاں، جلالپور اور وینکی تارڑ تک سیلابی بند تعمیر کیا گیا تھا-اس پر اب ایک پختہ سڑک تعمیر کر کے جلالپور بھٹیاں کو براستہ علی پور چٹھہ وزیر آباد سے ملادیا گیا ہے-ایک سڑک پنڈی بھٹیاں سے حافظ آباد تک براستہ کسیسے، شاہ جمال تعمیر کی گئی ہے-دو سڑکوں کے ذریعے پنڈی بھٹیاں کو سانگلہ ہل سے ملادیا گیا ہے-ایک سڑک براستہ ہندوانہ پنڈوریاں اور دوسری سڑک براستہ کوٹ نکہ جاتی ہے-سانگلہ ہل کی طرف سے قدیم راستہ سکھیکی سے مڑھ بلوچاں کے راستے جاتا ہے-یہیں سے دو اور ذیلی شاہراہیں سکھیکی کو جلالپور اور حافظ آباد سے ملاتی ہیں-

موٹروے :

لیکن ان تمام قدیم اور جدید شاہراہوں سے قطع نظر پنڈی بھٹیاں کو ایک ایسی جدید ترین عظیم شاہراہ کا سنگم دیا گیا ہے جو لاہور اسلام آباد موٹروے ۲ کے نام سے موسوم کی گئی ہے-۱۹۹۰ء میں اس کی تعمیر کا آغاز نواز شریف دور حکومت میں ہوا تھا اور حال ہی میں یہ مکمل کی گئی ہے-یہ پاکستان میں اپنی نوعیت کی پہلی جدید ترین شاہراہ ہے جس کے ذریعے سے لاہور کو اسلام آباد تک ایک متبادل راستے کے ذریعے سے ملایا گیا ہے-لاہور سے شروع ہو کر شیخوپورہ کے بعد پنڈی بھٹیاں دوسرا ایسا مقام ہے جہاں اس شاہراہ کا انٹر چینج بنایا گیا ہے-یہاں سے یہ سڑک طالب والا پل سے ہوتی ہوئی براستہ بھیرہ، کلر کہار اسلام آباد چلی جاتی ہے-اس طرح اس کے ذریعے سے پنڈی بھٹیاں کو پاکستان کے دارالحکومت اسلام آباد سے براہ راستہ ملا دیا گیا ہے-اسی نوعیت کی ایک اور شاہراہ کا منصوبہ بھی زیر تکمیل ہے جو پنڈی بھٹیاں فیصل آباد موٹروے ۳ کہلائے گی اور بعد ازاں اسے ملتان اور ڈیرہ غازی خاں اور پھر گوادر تک ملا دیا جائے گا-ان شاہراہوں کے بعد پنڈی بھٹیاں ان گزر گاہوں کے بالکل مرکز اور سنگم پر آجائے گا-

دریائے چناب :

پنجاب کا رومان پرور دریا چناب دلے دی بار کے مرکزی علاقوں سے گزرتا ہے-قدیم زمانہ

میں یونانیوں نے اس کا نام الیس سیسی نس رکھا ہوا تھا-بعد ازاں اہل ہند نے اس کو چندر بھاگا مشہور کیا-اب تیسرا نام اس کا چناب ہے-جو چین اور آب کے الفاظ سے مرکب ہے-کیونکہ اس کے منابع کوہ سرحد چینی تاتار میں ہیں-دلے دی بار کے علاقوں میں اسے چھناؤ بھی کہا جاتا ہے-ستلج و بیاس،راوی و جہلم چاروں دریاؤں سے یہ دریا اپنے پر آبی و عمیق و پہناوول و تیزروی میں فی الحقیقت زیادہ ہے-اس کا چشمہ کوہ لاہول کے مقام پر لداخ سے جنوب اور تبت کے وسط میں ہے جو کہ بہت بلند واقع ہے-وہاں ایک درہ کوہ رنگ کے دوران سے جس کی بلندی ۱۴ہزار فٹ نیچے کی سطح سے واقع ہے-اس درہ کے نیچے کی طرف ایک بڑی جھیل ہے جسے چندر بھاگ کا نام دیا گیا ہے-اس سے نکل کر یہ دریا چندر نام سے موسوم ہوتا ہے اور پہاڑوں کے اندر سے جب چالیس میل کا راستہ طے کر لیتا ہے تو مقام ٹانڈے ایک اور دریا سراج بھاگا نام پر آبی و تیزروی میں اس کے برابر شمال کی طرف بہتا ہوا اس میں آکر شامل ہو جاتا ہے-اخراج راج بھاگا کا بھی اسی جھیل چندر بھاگا سے ہوتا ہے-جس سے چندر نکلتا ہے اور یہ دونوں دریا چالیس میل کا راستہ اپنے ایک مخرج سے مختلف راستوں میں طے کرتے ہوئے ٹانڈے کے پاس باہم مل جاتے ہیں-وہاں سے یہ دونوں ملے ہوئے دریا چندر بھاگا نام پا کر سٹر سٹھ گز کے پہناؤ اور سخت تیزروی کے ساتھ ایک سو بیس میل کا راستہ طے کر کے کشتوار کے ملک میں پہنچ جاتے ہیں-اس مقام پر ایک بڑی ندی جس کو سہ ندا اور موروردن بھی کہتے ہیں-شمال کی طرف سے آکر اس میں مل جاتی ہے-اس کے ملنے سے یہ دریا بڑا ہو جاتا ہے-پھر جموں سے بالا اکھنور کے قریب سے گزرتا ہوا یہ دریا بستی خیری ریحال ضلع سیالکوٹ میں داخل ہو کر کشادہ میدانوں سے روشناس ہوتا ہے-یہیں پر اس دریا کو چناب کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے-وہاں سے یہ دریا سفر کرتا ہوا سوہدرہ،وزیر آباد،رسولنگر اور پھر دلے دی بار کے علاقوں جلالپور بھٹیاں اور پنڈی بھٹیاں میں داخل ہو جاتا ہے-یہاں سے یہ چنیوٹ کے پاس سے گزرتا ہوتا جھنگ کے قریب موضع علیانہ (تریموں) کے مقام پر دریائے جہلم کے ساتھ شامل ہو جاتا ہے-اکھنور سے ۵۰ میل نیچے وزیر آباد تک دریائے چناب جنوب مغرب کے سمت بہت عمیق و پر آبی و گرداہی کے ساتھ چلتا ہے اور سردی کے موسم میں یہ نصف میل اور برسات میں اڑھائی میل تک پھیل جاتا ہے-اور اس میں جہاز رانی بھی ہو سکتی ہے-ماضی میں اکھنور کے مقام سے تاجر لوگ جو لکڑی خرید کر پنجاب لانا چاہتے تھے-اس دریا میں چھوڑ دیتے تھے اور وہ کشتیوں کی طرح پانی پر دوڑتی ہوئی آتی تھیں-سوہنی کے انجام کے حوالے سے چناب کی موجوں کو ظالم اور طوفانی بھی کہہ کر پکارا جاتا ہے-

نہریں :

انگریزی دور حکومت میں چناب سے کئی نہریں بھی نکالی گئیں-اس کام کا آغاز ۱۸۸۷ء میں ہوااور ۱۸۹۲ء میں مکمل ہوا- چناب نہر پر ۲۶۵۱۵۱۹۶۶ روپے خرچ ہوئے اور ہزاروں ایکڑ بنجر اراضی کو سیراب کر کے زمین سے سبز سونا اگلوایا گیا- یہ نہر گڑھ گولا (خانکی ہیڈ) کے مقام سے دریائے چناب کے بائیں کنارے سے نکالی گئی اور آگے چل کر اسے گوگیرہ اپر، گوگیرہ لوئر، برالہ، جھنگ اپر، جھنگ لوئر، بھوانہ، رکھ، میاں علی اور کوٹ نکہ برانچیں نکالی گئیں- جھنگ برانچ پنڈی بھٹیاں اور رکھ برانچ سکھیکی سے گزرتی ہے-ان نہروں کا پانی دور دراز کی زمینوں تک پہنچانے کے لیے ان سے کئی ڈسٹری بیوٹری یا موگھے نکالے گئے ہیں-جوں جوں ان نہروں کا پانی غریب کسانوں کی بنجر اور خشک زمینوں کو سیراب کرتا گیا ان کی غربت اور کسمپرسی میں بھی کمی ہوتی گئی اور دلے دی بار کے علاقوں میں سرسبز و شادابی بھی نظر آنے لگی-(۹۲)

نالہ وگھ :

دلے دی بار کے علاوہ ایک نالہ وگھ کے نام سے نکلتا ہے-اس کا آغاز قصبہ رسولنگر کے شمال میں چھ میل کے فاصلے پر موضع راکی سے برسات میں ہوتا ہے-وہاں سے چل کر مڑھ، باشی، ساون پورہ، جھانبے، مہدی آباد اور جلالپور سے ہوتا ہوا چک بھٹی سے متصل دریائے چناب میں شامل ہو جاتا ہے-اس کے پانی سے بذریعہ وجھلار آبپاشی بھی ہوتی ہے-

☆☆☆

قدیم مساجد اور مندر

جلالی مسجد (جلالپور کہنہ)

بار کے علاقے کی سب سے قدیم مسجد جلالپور کہنہ میں سات سو سال گزرنے کے باوجود آج بھی پوری عظمت کے ساتھ کھڑی ہے۔ مسجد کے طرز تعمیر سے یہی اندازہ لگایا جاتا ہے کہ یہ مغلیہ دور سے قبل کی تعمیر شدہ ہے۔ چنانچہ روایت ہے کہ یہ جلال الدین خلجی کے دور میں تعمیر ہوئی۔ اسی نسبت سے اسے جلالی مسجد کا نام دیا گیا ہے۔ اس وقت یہ قصبہ دریائے چناب کے بالکل کنارے اور ملتان کشمیر کی قدیم شاہراہ پر واقع تھا۔ چھوٹی اور باریک اینٹوں سے تعمیر شدہ اس مسجد کا ایک بڑا ہال کمرہ اور صحن ہے۔ مسجد کے اندر داخل ہونے کے لیے صحن میں تین محرابی دروازے ہیں جن کی دیواریں تقریباً ۵ فٹ چوڑی ہیں۔ چھت پر ڈھلوانی سطح کے تین گنبد تعمیر کئے گئے ہیں۔ یہی گنبد دراصل اس کی قدامت کی عکاسی کر رہے ہیں۔ سات صدیوں کی ٹوٹ پھوٹ کے باوجود اس کی حالت جوں کی توں برقرار ہے۔ قیام پاکستان سے قبل یہاں کے قاضی خاندان نے اس کی مرمت وغیرہ کروائی۔ اب یہ مسجد ایک تاریخی ورثے کی حیثیت سے محکمہ آثار قدیمہ کی نظر التفات کی منتظر ہے۔

شاہی مسجد (پنڈی بھٹیاں):

دلے کی بار کی دوسری قدیم مسجد پنڈی بھٹیاں کی شاہی جامع مسجد ہے جو شہر کے عین وسط میں واقع ہے جو کہ عہد شاہ جہاں کی تعمیر شدہ ہے۔ سکھوں کے عہد میں مسجد کو اصطبل بنا دیا گیا تھا اور اس کے صحن کے اندر غیر مسلموں نے تجاوزات کر کے دوکانات تعمیر کر لی تھیں۔ مسجد کے ساتھ ملحقہ مکانات جو مسجد کی ملکیت تھے ان پر بھی امتداد زمانہ کے ہاتھوں مکینوں نے قبضہ جما لیا تھا۔ ۱۹۳۲ء میں مقامی مسلمانوں کی نمائندہ تنظیم انجمن اصلاح المسلمین قائم ہوئی تو اس نے اس مسجد کا انتظام اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور ابتدائی مرمت کے ساتھ ساتھ ملحقہ مکانات بھی خرید کر اس میں شامل کر لیے۔ مسجد سے ملحقہ ایک مکان یہاں کی طوائف مائی عمر جان کی ملکیت تھا۔ اس نے جسم فروشی کی مکروہ زندگی سے تائب ہو کر درویشی کی زندگی اختیار کر لی تھی اور مرنے سے پہلے اپنا مکان مسجد کے نام کر دیا تھا۔ قیام پاکستان کے بعد مسجد کے صحن کو بھی واگذار کرا لیا گیا اور ۱۹۵۷ء میں مسجد کی توسیع اور اس کی از سر نو تعمیر کا منصوبہ شروع ہو گیا۔ اس تعمیر نو کا نقشہ مستری محمد عبداللہ نے تیار

لیا اور ایک بڑا صحن اور تینوں اطراف بر آمدے تعمیر کئے گئے اور خوبصورت منقش چھتوں کی زیب و آرائش کی گئی- پھر ۷۰ کی دہائی میں مسجد کا ایک سو دس فٹ اونچا مینار تعمیر ہوا جو مسجد اور شہر کے جاہ و جلال اور حسن کی عکاسی کرتا ہے- سرخ رنگ کے پتھر سے آراستہ یہ مسجد آج شہر کی سب سے بڑی، خوبصورت اور قدیم مسجد ہے-(۹۳)

دیگر قدیم مساجد :

مدینہ مسجد جو میاں نوازش علی بھٹی کے مکان سے ملحق ہے اس کے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ یہ پنڈی بھٹیاں کی قدیم ترین مسجد ہے- چونکہ اسی مقام سے یہاں کی آبادی کی ابتداء ہوئی تھی اس لیے قیاس ہے کہ یہ شہر کی پہلی مسجد تعمیر کی گئی تھی- اسی طرح محلہ لودھراں میں واقع مسجد متوالا کا شمار بھی شہر کی پرانی مسجدوں میں ہوتا ہے- اسے متوالا نامی ایک مسلمان نے تقریباً تین سو سال قبل تعمیر کرایا تھا- بعد ازاں اس کی تعمیر نو میں کرم الٰہی ڈھیرہ (ایڈووکیٹ) نے مرکزی حصہ لیا- حال ہی میں لودھرا خاندان کی ایک نیک دل خاتون صغراں بیگم مقیم (امریکہ) نے مسجد سے ملحقہ مکان خرید کر مسجد کے احاطے میں شامل کرایا- مسجد کے صحن میں واقع کنواں آج بھی اس کی قدامت کا منہ بولتا ثبوت ہے-

مسجد میاں خیر محمد، خانقاہ حضرت میاں خیر محمد نون کے ساتھ منسلک ہے اور اسے محمد یار بھٹی نے مزار کے ساتھ ہی ۱۷۶۵ء میں تعمیر کرایا تھا- دس پندرہ سال پہلے تک اس کی حالت انتہائی خستہ ہو چکی تھی- پھر اہل محلہ نے اس میں دلچسپی لے کر اس کی تعمیر نو کرائی- اب یہ مسجد خوبصورتی کا نمونہ ہے- اسی محلے میں ایک اور قدیم مسجد واقع ہے جسے مسجد قاضیاں یا مسجد میاں احمد یار کہا جاتا ہے- اسے یہاں کے شیخ ودہاون خاندان نے تقریباً تین سو سال قبل تعمیر کرایا تھا- اب یہ طویل عرصے سے قاضی خاندان کے زیر انتظام ہے- حافظ آباد روڈ پر واقع مسجد بوہڑ والی سکھ عہد سے قبل کی تعمیر شدہ ہے- اس کے صحن میں بڑ کا ایک بہت بڑا درخت تھا جس وجہ سے یہ اس نام سے مشہور ہوئی- قیام پاکستان سے قبل اس مسجد میں شرومنی گردوارہ پربندھک کمیٹی نے دعوی کیا کہ اصل زمین گردوارہ کی اور چاہ گونگیانوالی کی معافی میں شامل ہے- مسلمانوں کی تنظیم انجمن اصلاح المسلمین نے مہاراجہ رنجیت سنگھ کے فرامین اور ۱۸۶۰ء کے بندوبست کی نقول عدالت میں پیش کیں اور فیصلہ مسلمانوں کے حق میں ہوا- مقامی سکھ لیڈروں کے ساتھ باقاعدہ معاہدہ ہوا- سکھوں کی طرف سے سردار ہرنام سنگھ منوچہ اور مسلمانوں کی طرف سے بابو علی محمد لودھرا صدر انجمن اصلاح المسلمین کے دستخط ثبت ہوئے- انجمن نے اس ویران مسجد کو دوبارہ آباد کیا اور اس میں اس کے

اراکین شیخ محمد حسین ودہاون، مرزا اللہ بخش، مستری محمد عبداللہ، مستری فضل الٰہی، مستری حاجی محمد، محمد اسماعیل کشمیری اور رائے سادے خاں نے خاص طور پر حصہ لیا۔ آج کل یہ مسجد یوسف زئی پٹھان خاندان کے انتظام میں ہے۔

شہر کی قدیم مساجد میں ایک مسجد عاقل والی بھی ہے۔ جو لاہور روڈ پر بر لب سڑک محمد عاقل بھٹی کی سوا دو سو سال قبل کی تعمیر شدہ ہے۔ ۱۹۳۲ء میں لاہور سرگودھا روڈ کی تعمیر کے دوران محکمہ پی ڈبلیو ڈی نے مسجد کے کچھ حصہ پر جس میں مسجد کا حجرہ بھی شامل تھا ملکیت کا دعویٰ کر دیا اور مسجد کے اس حصے کو گرانے کی کوشش کی۔ لیکن مسلمان نمائندوں نے شدید مزاحمت کی۔ بالآخر متنازعہ زمین کی قیمت انجمن اصلاح المسلمین کے ادا کرنے کے نتیجے میں یہ قضیہ ختم ہو گیا۔ ۱۹۴۴ء میں سید علی حسین شاہ، میاں مولا بخش، میاں احمد دین، بابو علی احمد اور مستری عبداللہ نے اس کی توسیع و مرمت میں اہم حصہ لیا۔ چوک سراجاں میں واقع جامع مسجد جعفریہ تقریباً اڑھائی سو سال قدیم ہے۔ سکھوں کے یہاں قبضہ کرنے کے بعد اسے بھی اصطبل میں تبدیل کر دیا گیا۔ طویل عرصے تک یہاں شیعہ سنی مسلمان اکٹھے نماز پڑھتے رہے۔ اب یہ خالص شیعہ مسلک کی مسجد ہے۔ اس کی تعمیر نو ۱۹۵۰ء میں ہوئی اور اس میں پیر محمد ساراج، محمد اسماعیل ساراج اور نوکر حسین ساراج نے خاص طور پر حصہ لیا۔

جامع مسجد جعفریہ مزار مروان شاہ کے قریب واقع ہے۔ ۱۷۵۰ء کے قریب اس کی تعمیر ہوئی۔ یہاں اس زمانے میں ایک سرائے تھی جہاں مسافر آکر آرام کرتے تھے۔ انہیں کی سہولت کے لیے یہ مسجد محمد یار بھٹی نے تعمیر کرائی تھی۔ بعد ازاں اس جگہ ملتان سے ایک گیلانی سید خاندان آکر آباد ہوا تو یہ مسجد اہل تشیع سے منسوب ہو گئی۔ اس کے ساتھ امام بارہ بھی تعمیر کیا گیا ہے۔

شہر کی جدید مساجد میں جامع مسجد غوثیہ ۱۹۶۴ء میں انجمن غوثیہ نے مندر رگوناتھ کے گرد مکانات خرید کر تعمیر کرائی۔ بریلوی مکتبہ فکر کے مسلمانوں نے اس کی تعمیر میں حصہ لیا۔ بعد میں اس کی توسیع ہوئی اور اس سے ملحق مدرسہ بھی قائم ہے۔ جامع مسجد رضویہ ۱۹۵۲ء میں تعمیر ہوئی۔ اس جگہ پہلے ہندوؤں کی عبادت گاہ دیوی کا مندر تھا۔ قیام پاکستان کے بعد مسلمان مہاجرین کی اکثریت اسی محلے میں آکر مقیم ہوئی۔ انہی کی کوششوں سے یہ مسجد تعمیر ہوئی۔ مین بازار میں واقع مسجد اہلحدیث بھی اسی عرصے میں تعمیر ہوئی اور اس مقام پر بھی غیر مسلموں کی عبادت گاہ تھی۔ چٹن روڈ پر واقع جدید عیدگاہ ۱۹۵۰ء میں تعمیر کی گئی۔ اس جگہ قیام پاکستان سے قبل ہندو باوا اکیسری کا میلہ لگتا تھا۔ اس سے ملحقہ کچھ زمین میاں محمد حسین بھٹی کی ملکیت تھی۔ انہوں نے یہ زمین عیدگاہ کی تعمیر کے لیے انجمن اصلاح المسلمین کو عطیہ کے طور پر دے دی۔ سنگ بنیاد رکھتے وقت پہلی اینٹ

کے نیچے پاکستان کا سکہ رکھا گیا-اس کی تعمیر میں شیخ محمد حیات پھپھرہ، ڈاکٹر محمد عبداللہ، غلام محمد محسن، شیخ دوست محمد اور چوہدری محمد اسلم نے اہم کردار ادا کیا-اس کے دائیں طرف قدیم عیدگاہ بھی ہے جو بہت پہلے کی تعمیر شدہ ہے-حال میں تعمیر ہونے والی مسجد قباجدت اور خوبصورتی کا بہترین نمونہ ہے-اس کی تعمیر میں چوہدری محمد رفیق آرائیں نے مرکزی کردار ادا کیا ہے-(۹۴)

رگوناتھ مندر:

ہندوؤں کی عبادت گاہ پنڈی بھٹیاں کے مین بازار کے عین وسط میں رگوناتھ مندر کے نام سے موجود تھی-اس مندر کی تعمیر ۱۹۰۰ء میں شنکر داس اور دولا مل تیجبہ نے کرائی-بعد میں وقتاً فوقتاً مندر کی عمارت میں تبدیلی و توسیع ہوتی رہی-مندر کا صدر دروازہ لالہ سوبھارام کالڑہ رئیس پنڈی بھٹیاں نے تعمیر کرایا جبکہ پنڈت منی رام جھنگن (جلالپور) نے مندر کی توسیع کرائی-علاوہ ازیں لالہ ٹیک چند سندر داس پاہوا نے بھی اس کام میں شرکت کی-ہندوؤں کے یہاں سے چلے جانے کے بعد مندر کو اوقاف نے اپنے قبضے میں لے لیا پھر آہستہ آہستہ بازار والے حصے پر دکانیں تعمیر ہوتی گئیں اور اندرونی حصہ بری طرح ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گیا-رہی سہی کسر بابری مسجد کے تنازعہ کے دوران پوری ہو گئی-۱۹۹۱ء میں جب بھارت میں انتہاپسند ہندوؤں نے بابری مسجد کو شہید کر دیا تو اس کے رد عمل میں یہاں کے جذباتی مسلمانوں نے اس بے آباد مندر کے اوپر والے حصے کو گرادیا جو میلوں دور سے بھی نظر آتا تھا-مندر کی دوسری منزل پر ایک بڑا ہال کمرہ اب بھی موجود ہے-جہاں ہندو چبوترے پر دیوتاؤں اور دیویوں کی پوجا کرتے تھے-اس ہال کمرے کے ارد گرد ایک گیلری بھی ہے-دیواروں کے نچلے حصوں کو خوبصورت ٹائلوں سے آراستہ کیا گیا تھا-بیشتر ٹائلیں لوگوں کی نظروں اور ہاتھوں سے محفوظ نہ رہ سکیں-البتہ کہیں کہیں یہ دلکش ٹائلیں اب بھی موجود ہیں جو مندر کی اندرونی خوبصورتی اور زیب و آرائش کا پتہ دیتی ہیں-رگوناتھ مندر کے علاوہ سناتم دھرم ہندوؤں کا ایک مندر مزار میاں خیر محمد کے سامنے واقع تھا اب اس جگہ لڑکیوں کا سکول تعمیر ہو چکا ہے-اسی طرح بازار کے شروع میں آریہ سماجیوں کا مندر بھی ۱۹۰۴ء میں تعمیر کرایا گیا تھا-اب یہاں بھی لڑکیوں کا سکول قائم ہو چکا ہے-

☆☆☆

مذہبی، سماجی وادبی ادارے

انجمن اصلاح المسلمین ۱۹۳۲ء :

انیسویں صدی کے وسط میں پنجاب پر انگریزوں کا تسلط قائم ہونے کے بعد جس نئے سیاسی و سماجی نظام نے جنم لیا تھا وہ یہاں کے عام مسلمانوں کی معاشی و سماجی پسماندگی کا پیش خیمہ ثابت ہوا تھا۔ چنانچہ اگلی آٹھ دہائیوں تک یہاں کے سادہ لوح مسلمانوں کو اپنے اس مقدر کو بدلنے کی ہمت نہ ہو سکی۔ مگر بالآخر غیر مسلموں کے تجارتی غلبے اور اپنے ہم مذہب جاگیر داروں کے ستائے ہوئے مسلمان ایک ایسی تنظیم قائم کرنے میں کامیاب ہوئے کہ جس نے یہاں کے مسلمانوں کی بدترین سماجی اور تعلیمی حالت کو بدلنے کی نہ صرف کامیاب کوشش کی بلکہ ان کی سیاسی نمائندگی کا پورا پورا حق بھی ادا کیا۔ یہ تنظیم انجمن اصلاح المسلمین کے نام سے شیخ دوست محمد ودہاون، شیخ محمد حیات پھپھرہ، غلام محمد مسن، چوہدری فضل الٰہی، بابو علی محمد لودھرا، بابا نبی بخش، سائیں اسماعیل ڈھیرا، باوا ملا نیل گر، چوہدری محمد حسین لودھرا (ایڈووکیٹ) محمد حسین صوفی، غلام محمد زرگر اور بابا جیون کی کوششوں سے قائم ہوئی۔ اور اس کا مقصد علاقے کے مسلمانوں کی تعلیمی و سماجی حالت کو بہتر بنانا اور ان کے حقوق کا تحفظ کرنا ٹھہرا۔ چوہدری فضل الٰہی اس کے پہلے صدر اور شیخ دوست محمد پھپھرہ جنرل سیکرٹری مقرر ہوئے۔ نامساعد حالات اور سخت مالی مشکلات کے باوجود انجمن نے اپنے مقاصد کے حصول کی کوششوں کو جاری رکھا اور سکول، مدرسہ اور لائبریری قائم کی۔ نیز مقامی مساجد کی ابتر حالت کو بہتر بنایا۔ آریہ سماجیوں اور ہندو مبلغوں کی ریشہ دوانیوں کا انجمن حمایت اسلام لاہور سے مبلغ منگوا کر جواب دیا۔ علاوہ ازیں مقامی جاگیر داروں کے شکنجے میں پھنسے ہوئے غریبوں کو اپنے حقوق کا شعور دلوانے میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ چنانچہ تحریک پاکستان کا آغاز ہوا تو ان یونینسٹ جاگیر داروں کا ڈٹ کا مقابلہ کیا اور اس کے کارکنوں نے جگہ جگہ جا کر مسلم لیگ اور پاکستان کا پیغام پہنچایا۔

قیام پاکستان کے بعد انجمن اصلاح المسلمین کی ترقی و ترویج میں شیخ محمد حسین ودہاون جو طویل عرصے تک اس کے صدر رہے، میاں غلام رسول مرحوم (سیکرٹری)، قاضی نور احمد، شیخ محمد حیات پھپھرہ، صوفی اللہ بخش مرحوم، صوفی محمد اکرم، شیخ محمد احمد سہگل، صوفی عنایت میراں زرگر، ڈاکٹر محمد عبداللہ مرحوم، شیخ محمد لطیف پھپھرہ، شیخ برکت اللہ، بابو علی محمد لودھرا، چوہدری محمد حسین ایڈووکیٹ، ایم ایچ صوفی، میاں غلام محمد مسن اور میاں ظہور مسن اہم کردار ادا کرتے رہے۔ پچاس

سال تک انجمن کا سالانہ جلسہ جوش و خروش سے منعقد ہوتا رہا۔ ان جلسوں میں ملک کی نامور شخصیات تشریف لاتی رہیں۔ جن میں مولانا ظفر علی خاں، سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا حسین احمد مدنی، قاضی احسان احمد شجاع آبادی، مفتی زین العابدین، علامہ علاؤالدین صدیقی، بشیر احمد اخگر، مولانا کوثر نیازی، مولانا احتشام الحق تھانوی، صوفی غلام مصطفے تبسم، چوہدری محمد علی (سابق وزیر اعظم پاکستان) نواب مظفر خاں قزلباش، نواب صادق حسین قریشی، قدرت اللہ شہاب اور جسٹس عطاء اللہ سجاد خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

انجمن کے موجودہ صدر شیخ منیر حسین ودہاون اور سیکرٹری جنرل محمد غوث فاروقی ہیں جبکہ دیگر سرگرداراکین میں بابو محمد اسحاق، شیخ تنویر احمد، شیخ زاہد حسین، محمد نصر اللہ، محمد اسلم مسن، بشیر بٹ، قاضی منیر احمد رضوان الہی اور شیخ انجم سہگل وغیرہ انجمن کی سرگرمیوں کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔ جو شاہی جامع مسجد کے انتظام، رفاہی ہسپتال، سکول اور لائبریری کی صورت میں جاری ہیں۔ انجمن کی لائبریری میں بعض قیمتی نوادرات بھی محفوظ ہیں جن میں قرآن مجید کے کچھ قلمی نسخے اور شاہی فرامین بھی شامل ہیں۔ علاوہ ازیں انجمن کے شعبہ تصنیف و تالیف کے تحت تین کتب (۱) مسلمانوں کے علمی وادبی کارنامے (۲) اسلامی حدود (۳) الشفاء بھی شائع کی گئی ہیں۔

انجمن اشاعت اسلام جلالپور ۱۹۱۰ء :

مسلمانوں کی بیچارگی، دین حق سے عدم واقفیت، اقتصادی پسماندگی اور ہندو ساہوکاروں اور جاگیرداروں کے استبداد کو جلالپور بھٹیاں کے چند دردمند مسلمانوں نے بہت پہلے ہی محسوس کر لیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے ۱۹۱۰ء میں ہی یہاں انجمن اشاعت اسلام کی داغ بیل ڈالی جس کا مقصد مسلمانوں کی دینی معاشرتی اور اقتصادی حالت کو بلند کرنا تھا۔ ۱۹۳۳ء میں اس کے نئے دور کا آغاز ہوا اور علاقے میں یہ ایک فعال تحریک کی صورت اختیار کر گئی۔ اس کے روح رواں قاضی غلام نبی صاحب، قاضی غلام فرید، میاں نبی بخش ایمن آبادی، حاجی میاں کریم بخش، خلیفہ سراجدین سیٹھ، میاں اللہ دتہ، سید فتح دریا، مستری غلام علی، سید ارشاد حسین، میاں مولا بخش چوہدری غلام نبی حیرت، شیخ ہادی حسین، شیخ حیات محمد وہرہ، شیخ جلال دین، شیخ نور محمد، سیٹھ فضل الہی اور میاں اسلم حیات تھے۔ اس انجمن نے اصلاح معاشرہ کے لیے گرانقدر خدمات انجام دیں اور قیام پاکستان سے قبل ہندو سکول کے مقابلے میں اردو گرلز سکول قائم کیا۔ غیر مسلم چوہڑوں کو مرتد ہونے سے بھی بچایا اور مسلمانوں کو عدالتی مقدمہ بازی کے اخراجات سے بچانے کے لیے مسلمانوں کے فیصلوں کے لیے ایک پنچائیت قائم کی۔ انجمن اشاعت اسلام نے جلالپور بھٹیاں کے علاقے کے مسلمانوں کی

نمائندگی کا بھی پورا پورا حق ادا کیا- آج یہ انجمن عوام کی فلاح وبہبود کے لیے کوشاں ہے-(۹۵)

مجلس شوریٰ اسلامیہ ۱۹۳۸ء :

۱۹۳۸ء میں تحصیل حافظ آباد کی تمام اہم مسلم انجمنوں نے باہم متحد ہو کر مجلس شوری اسلامیہ قائم کی تھی-اس میں انجمن اشاعت اسلام جلالپور، انجمن اشاعت اسلام حافظ آباد، انجمن اصلاح المسلمین پنڈی بھٹیاں اور انجمن انصار المسلمین سکھیکی منڈی شامل تھیں اور شیخ عبدالغنی (سکھیکی) صدر، میاں غلام محمد جنجوعہ (پنڈی بھٹیاں) سیکرٹری شیخ ہادی جوائنٹ سیکرٹری اور میاں نبی بخش (جلالپور) خزانچی منتخب ہوئے تھے-اس مجلس کے قائم کرنے کا اصل مقصد پورے علاقے میں اصلاح معاشرہ کا قیام، ہندو مبلغوں کا توڑ اور سماجی سرگرمیوں کو اجتماعی طور پر چلانا تھا-

آریہ سماج :

آریہ سماجیوں کی تنظیم یہاں انیسویں صدی کے آخر میں قائم ہو گئی تھی-اس تنظیم نے ۱۹۰۴ء میں یہاں ایک مندر بھی قائم کیا اور اس کے مبلغ بھی اکثر یہاں تبلیغ کے لیے آتے-یہ یہاں کے ہندوؤں کی ایک منظم جماعت تھی اور اس کے سرکردہ افراد میں رائے بہادر حکومت رائے، برکت مہاشہ لالہ جوندہ مل اور جیون پرکاش وغیرہ شامل تھے-(۹۶)

سناتم دھرم :

آریہ سماجی ہندوؤں کے مقابلے میں قدامت پسند ہندوؤں کی مذہبی تنظیم سناتم دھرم تھی- ان دونوں میں فرق بت پرستی اور برہمن کے کردار پر تھا- یہاں پنڈی بھٹیاں میں سناتم دھرم ہندوؤں کا الگ مندر (میاں خیر محمد نون کے مزار کے سامنے) واقع تھا- جہاں آج کل گرلز سکول ہے-اس کے علاوہ یہاں سکھوں کی بھی ایک تنظیم پربندھک کمیٹی کے نام سے موجود تھی-

پتا توڑ سبھا :

۱۹۴۴ء میں پنڈی بھٹیاں کے مسلمانوں اور ہندوؤں نے ایک مشترکہ تنظیم پتا توڑ سبھا کے نام سے مقامی مسائل کو حل کرنے کے غرض سے قائم کی تھی-اشیاء صرف کی قلت، صفائی، روشنی، پہرہ وغیرہ کے معاملات کو درست کرنے کے لیے یہ تنظیم قیام پاکستان تک قائم رہی- مسلمانوں کی طرف سے اس میں شیخ محمد حسین ودہاون، پیر علی حسین شاہ، شیخ چراغ دین پھپھڑہ،

میاں غلام محمد محسن، بابا رحمت اور بابو علی محمد شامل تھے۔ جبکہ ہندوؤں کی طرف سے رائے صاحب حکومت رائے، لالہ رلیارام، لالہ نرائن داس دوڑہ، لالہ جوندہ مل کالڑہ اور لالہ بوڑامل وغیرہ شامل تھے۔

دیگر تنظیمیں:

پنڈی بھٹیاں میں مختلف اوقات میں تشکیل پانے والی دیگر سماجی تنظیموں میں انجمن فدایان اسلام ۱۹۳۵ء میں اور انجمن اتحاد المسلمین ۱۹۴۳ء میں قائم ہوئی۔ بنیادی طور پر یہ دونوں مذہبی تنظیمیں تھیں اور زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکیں تھیں۔ قیام پاکستان کے بعد تشکیل پانے والی اولین تنظیم جنرل مزدور یونین تھی جو ۱۹۵۰ء کے لگ بھگ سیلابی بند کی تعمیر میں کام کرنے والے مزدوروں کے حقوق کے تحفظ کے لیے بنائی گئی تھی۔ اس کے سرکردہ کارکنوں میں رانا محمد طفیل، شیخ مقبول احمد پھپھرہ، لطافت حسین وغیرہ شامل تھے۔ اس کے فوری بعد یہاں پہلی مقامی سٹوڈنٹس یونین قائم ہوئی اور اس کے پہلے صدر غلام سرور اور سیکرٹری مطاہر حسین شیخ تھے۔ پھر ۱۹۶۰ء کی دہائی میں قصبہ میں ادبی سرگرمیوں کو فروغ دینے کے لیے ایک تنظیم بزم ادب کے نام سے قائم ہوئی۔ اس کے صدر شیخ محمد اصغر منشا اور سیکرٹری شیخ رشید تھے۔ اس تنظیم کے تحت متعدد ادبی مجالس منعقد کی گئیں مگر یہ زیادہ تر قائم نہ رہ سکی۔ پھر ۱۹۶۳ء میں بریلوی مکتبہ فکر کے چند افراد نے انجمن اصلاح المسلمین سے علیحدہ ہو کر انجمن غوثیہ کی بنیاد رکھی۔ اس کا مقصد اتحاد بین المسلمین کا قیام اور مسلمانوں میں مذہبی سوچ کا شعور پیدا کرنا رکھا گیا۔ اس کے بانیوں میں شیخ کمال الدین مرحوم، عبدالقیوم قادری، سید علی حسین، عبدالحمید ٹھیکیدار، دلاور حسین، محمد شفیع زرگر، منشی عبدالشکور، بابا فقیر محمد اور شیخ حفیظ الدین شامل تھے۔ آج کل اس کے ذمہ داروں میں عبدالقیوم قادری، محمد یونس اور عبدالخالق قادری ہیں۔ مسجد اور مدرسہ کے انتظام کے علاوہ یہاں کی سماجی زندگی میں بھی انجمن غوثیہ کا اہم کردار رہا ہے۔ ۱۹۸۰ء کی دہائی میں ایک مرتبہ پھر یہاں دو ادبی تنظیمیں قائم ہوئیں ایک ینگ فیلو سوسائٹی اور دوسری ادارہ تہذیب و ثقافت، پہلی تنظیم کے کرتا دھرتا افراد میں راقم الحروف کے علاوہ مسعود احمد سالک، مقبول احمد خاور، محمد اکرم انجم، اختر حسین بھٹی، امتیاز احمد شیخ، محمد اویس، طالب حسین اور شیخ امجد منیر شامل تھے۔ جبکہ دوسری تنظیم کے اہم ممبران میں غلام حسین چیمہ، محمد شریف شہزاد، اختر حسین بھٹی، زاہد حسین شیخ۔ حمید رضا شاہ، شیخ محمد ادریس، شیخ وحید احمد اور بابو محمد غضنفر شامل تھے۔ یہ بھی کچھ عرصہ تک ادبی سرگرمیوں کو فروغ دینے کے بعد ختم ہو گئیں۔

قیام پاکستان سے قبل پنڈی بھٹیاں میں صحافیوں کی باقاعدہ تنظیم تو نہ تھی البتہ مسٹر غلام رسول کامریڈ اور غلام محمد مسن روزنامہ زمیندار، احسان اور تسنیم جیسے اخباروں کو اپنے طور پر خبروں کی ترسیل کرتے رہے۔ قیام پاکستان کے بعد غلام رسول کامریڈ روزنامہ امروز اور شیخ شفیع جاوید روزنامہ نوائے وقت کے نمائندے بنے۔ بعد ازاں عبدالقیوم قادری، قاضی اعجاز احمد ایڈووکیٹ مرحوم اور ریاض احمد شاہین مقامی صحافتی میدان میں آگے بڑھے۔ پھر شیخ تنویر احمد، بابو محمد اسحاق، شفقت بشیر طاہر، نثار احمد خاں بھی اس صف میں شامل ہو گئے۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا ان کی انجمنیں بھی وجود میں آتی گئیں۔ اور نئے نئے صحافی بھی داخل ہوتے گئے۔ ان میں محمد نصر اللہ، عبدالخالق قادری، محمد اکرم انجم، محمد اعجاز مسن، محمد اسلم مسن شامل ہیں۔ پھر ان صحافیوں نے یہاں پریس کلب قائم کر لیا جو صحافتی سرگرمیوں میں بڑا فعال کردار ادا کر رہا ہے۔ اسی طرح جلالپور بھٹیاں میں بھی صحافیوں کی تنظیم موجود ہے جس میں محمد انور جاوید، چوہدری محمد علی اور حافظ اعجاز احمد فعال ہیں۔ تاجروں کی تنظیموں میں سب سے زیادہ فعال ادارہ تجارت ہے جس کے صدر شیخ ظفر احمد پھپھرہ ہیں۔ مذکورہ سماجی، مذہبی رفاہی ادبی اور صحافتی تنظیموں کے علاوہ بھی یہاں کئی چھوٹی موٹی تنظیمیں وجود میں آتی رہیں اور وقت کے ساتھ ساتھ اپنا وجود کھوتی رہیں۔ جیسے ادارہ تعمیر معاشرہ جس میں ڈاکٹر محمد صفدر لودھرا، ریاض شاہین اور عبدالقیوم قادری پیش پیش تھے۔ انجمن تحفظ حقوق شہریاں جس میں رانا محمد طفیل شامل تھے۔ یوتھ لیگ جس کے عہدیداران میں اسد سلیم شیخ اکرم انجم، مسعود سالک اور سید حمید رضا تھے۔ اس طرح انجمن شہریاں جو بابو محمد اسحاق کی زیر نگرانی کام کرتی رہی۔ یہ سب تنظیمیں اپنا وجود کھو چکی ہیں البتہ ایک تنظیم جو اللہ اکبر کے نام سے ایک نوجوان عبدالحق مجاہد کی زیر نگرانی قائم ہے انسانیت کی فلاح کے لیے خاموش کردار ادا کر رہی ہے، ضرور قابل ذکر ہے۔

☆☆☆

بلدیاتی، انتظامی و تعلیمی ادارے

ٹاؤن کمیٹی پنڈی بھٹیاں :

انگریزی دور حکومت کے دوران شہریوں کے مقامی مسائل کو حل کرنے اور نچلی سطح پر نمائندگی دینے کی غرض سے حکومت خود اختیاری کے ادارے تشکیل دیئے گئے تو پنڈی بھٹیاں اور جلالپور بھٹیاں میں لارڈ رپن کے زمانے میں ۱۸۸۱ء میں میونسپل کمیٹیاں قائم کی گئیں- لیکن دو سال بعد ان میونسپل کمیٹیوں کو ختم کر کے ان کو ڈسٹرکٹ بورڈ میں شامل کر دیا گیا- بعد ازاں اس صدی کے آغاز میں پنڈی بھٹیاں سمال ٹاؤن کمیٹی قائم کر کے اس ادارے کو دوبارہ بحال کر دیا گیا- ۱۹۲۵ء میں اس کا درجہ بڑھا کر ٹاؤن کمیٹی بنا دیا گیا- پھر ۱۹۷۵ء میں اسے میونسپل کمیٹی کا درجہ مل گیا مگر ۱۹۷۹ء میں ایک بار پھر ٹاؤن کمیٹی بنا دیا گیا-

۱۹۱۲ء میں قصبہ پنڈی بھٹیاں کو پانچ وارڈوں میں تقسیم کیا گیا تھا اور اس لحاظ سے ٹاؤن کمیٹی کے ممبران کی تعداد بھی پانچ تھی- ۱۹۲۵ء میں اس کے ارکان کی تعداد کم ہو کر چار رہ گئی- سرکاری ڈاکٹر بلحاظ عہدہ اس کا ممبر ہوتا تھا- قیام پاکستان کے بعد ۱۹۵۴ء میں ٹاؤن کمیٹی کے وارڈوں میں اضافہ ہو گیا اور یہ تعداد بڑھ کر ۹ تک جا پہنچی- آج کل یہ ۱۹ وارڈوں پر مشتمل ہے جبکہ خواتین اور مزدوروں کو الگ طور پر نمائندگی حاصل ہے- قیام پاکستان سے قبل جو اصحاب ٹاؤن کمیٹی پنڈی بھٹیاں کے صدر کے عہدے پر فائز رہے ان میں ۱۹۱۲ء میں دیوان موتی رام، ۱۹۱۶ء میں میاں محمد یار خاں بھٹی ذیلدار، ۱۹۲۸ء میں تلسی داس کالڑہ اور ۱۹۳۲ء میں میاں دوست محمد بھٹی شامل تھے- جبکہ قیام پاکستان کے بعد میاں دوست محمد بھٹی کے علاوہ میاں نذر حسین بھٹی، شیخ محمد حیات پھپھرہ، میاں حق نواز بھٹی، چوہدری محمد رفیق آرائیں، میاں فضل عباس بھٹی، اور چوہدری محمد شفیق چیئرمین کے عہدوں پر فائز رہے- جبکہ میاں محمد حسین بھٹی، شیخ محمد حیات، ڈاکٹر محمد عبداللہ، نصیر حسین بھٹی، چوہدری حسن محمد، حاجی نذر محمد شیخ تنویر احمد اور ذوالفقار احمد شعلہ وائس چیئرمین کے عہدوں پر فائز رہے-

ٹاؤن کمیٹی کا اصل مقصد صحت و صفائی، تعلیم اور دیگر شہری سہولتوں کو فراہم کرنا ہے- اس غرض سے وہ اپنے وسائل خود پیدا کرتی ہے اور آمدنی و خرچ کی خود ذمہ دار ہوتی ہے- ماضی میں ٹاؤن کمیٹی کی آمدن و خرچ کی نوعیت کیا تھی اس کا اندازہ درج ذیل گوشوارہ سے لگایا جا سکتا ہے-

سال	آمدن وخرچ سالانہ
۱۶-۱۹۱۵ء	۲۶۵۰روپے
۱۸-۱۹۱۷ء	۳۸۴۷روپے
۱۹-۱۹۱۸ء	۴۱۲۰روپے
۲۱-۱۹۲۰ء	۴۶۱۱روپے
۲۲-۱۹۲۱ء	۵۷۳۸روپے
۲۹-۱۹۲۸ء	۵۵۴۳روپے
۳۰-۱۹۲۹ء	۷۵۰۰روپے
۳۸-۱۹۳۷ء	۵۷۷۸روپے
۴۲-۱۹۴۱ء	۷۶۱۵روپے
۴۹-۱۹۴۸ء	۱۸۵۴۵روپے
۵۵-۱۹۵۴ء	۴۵۶۰۰روپے
۵۶-۱۹۵۵ء	۵۹۶۰۰روپے
۵۷-۱۹۵۶ء	۵۲۰۰۰روپے
۸۱-۱۹۸۰ء	۱۰۶۷۵۰۰روپے
۹۰-۱۹۸۸ء	۲۲۳۶۶۰۰روپے
۹۱-۱۹۹۰ء	۲۴۰۲۰۰۰روپے
۹۸-۱۹۹۷ء	۵۸۰۰۵۰۰روپے(۹۷)

ٹاؤن کمیٹی پنڈی بھٹیاں کی عمارت انتہائی قدیم اور دلکش تھی-شیر شاہ سوری کے زمانے میں یہ ایک سرائے تھی- جسے انگریزی دور میں سرکاری افسران کے قیام کے لیے بھی استعمال کیا جاتا رہا- بعد ازاں وقتاً فوقتاً اس میں تبدیلی اور اضافہ ہوتا رہا، حال ہی میں اس کی تعمیر نو کی گئی ہے-اس عمارت کے ساتھ ہی ایک پبلک پارک بھی موجود ہے جو قصبے کے لوگوں کے لیے واحد تفریح اور سیر گاہ ہے-اس پارک کے احاطے میں بلدیہ کی تحقیقی لائبریری اور پریس کلب قائم ہیں- ۱۹۷۳ء کے سیلاب سے پہلے تک اس لائبریری میں کتب اور ان کو پڑھنے والوں کی خاصی تعداد تھی- مگر آج ان دونوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے-

ٹاؤن کمیٹی کی حدود کو اگرچہ ۱۹ وارڈوں میں تقسیم کیا گیا ہے-لیکن ان کی شناخت نمبروں کی بجائے محلوں کے ناموں سے کی جاتی ہے-ان محلوں کے نام معروف شخصیات، قوموں اور جغرافیائی

سمت کی نسبت سے رکھے گئے ہیں- محلّہ کمر کوٹہ اور محلّہ غربی جغرافیائی سمت کی عکاسی کرتے ہیں- کمر کوٹہ کے معنی ہیں فصیل یا قلعہ سے منسلک یعنی جب پنڈی بھٹیاں کے چاروں طرف فصیل موجود تھی تو یہ محلّہ فصیل کے شمالی دروازے کے بالکل ملحق تھا- محلّہ غربی قصبہ کے مغرب کی طرف آباد ہے- جبکہ محلّہ عالی (محلّہ لودھراں) معنویت کے اعتبار سے اونچی جگہ پر آباد ہونے کی وجہ سے معروف ہوا- یہاں کا ایک معروف محلّہ قتل گڑھا بھی ہے-اس کے متعلق روایت ہے کہ یہاں بلوچ قوم کے ایک شخص کو اس کے اونٹ نے رات کو سوتے وقت مار دیا تھا- اسی وقت سے اسے قتل گڑھا کہا جانے لگا- دیگر محلوں میں غریب پورہ، نواب پورہ، سراجاں، محلّہ شیخاں، محلّہ مروان شاہ، محلّہ میاں خیر محمد نون، جہانگیر پورہ، مبارک پورہ اور حسن پورہ قابل ذکر ہیں- قیام پاکستان سے قبل قصبہ کی کچھ گلیاں ہندوؤں کے ناموں سے منسوب تھیں جیسے گلی سچدیواں، گلی گنداں، گلی کالڑیاں، گلی پاہویاں، گلی گیان چند، گلی حویلی رام سچدیو، گلی مہنت ہرچرن داس، گلی حکیم جے دیال اور گلی خوشی رام وغیرہ، لیکن اس طرح کے تقریباً تمام نام اب متروک ہو چکے ہیں اور گلیوں کی شناخت نئے ناموں سے کی جانے لگی ہے- جیسے گلی میاں خیر محمد نون، گلی پھمریاں، گلی تھانے والی وغیرہ-

ٹاؤن کمیٹی جلالپور :

ٹاؤن کمیٹی جلالپور بھی پنڈی بھٹیاں کی طرح ۱۸۸۱ء میں قائم کی گئی تھی لیکن ۱۸۹۱ء میں اسے ختم کر دیا گیا تھا- ۱۹۵۹ء میں اسے یونین کونسل اور ۱۹۷۹ء میں ٹاؤن کمیٹی کا درجہ حاصل ہو گیا- ٹاؤن کمیٹی جلالپور بھٹیاں کے اب تک میاں بشیر عالم بھٹی، میاں اختر علی، میاں اسلم حیات اور میاں شاہد حسین چیئرمین رہ چکے ہیں-

ٹاؤن کمیٹی سکھیکی :

سکھیکی ٹاؤن کمیٹی کا قیام ۱۹۷۹ء میں عمل میں آیا تھا-اس سے پہلے تک یہ یونین کونسل کے درجے کا ادارہ تھا- اب تک چوہدری ارشاد احمد، چوہدری ولی محمد سندھو، چوہدری نصر اللہ خان بھٹی اور مرزا شاہد پرویز ٹاؤن کمیٹی سکھیکی کے چیئرمین کے عہدوں پر فائز رہے-

یونین کونسلیں :

جلالپور اور پنڈی بھٹیاں مرکز کے دیہاتوں کو ۱۰ یونین کونسلوں میں تقسیم کیا گیا ہے- جلالپور مرکز کی چار یونین کونسلیں ڈھوراکلاں، پنڈی ڈھڈال، چک بھٹی، اور رسول پور تارڑ ہیں جبکہ

پنڈی بھٹیاں مرکز کی چھ یونین کونسلیں کوٹ نکہ، بدر علی، ٹھٹھہ خیر و مٹمل، مرزا بھٹیاں، خرم چوہر یڑہ اور ہندوانہ ہیں- کوٹ نکہ یونین کونسل میں ۶ ، ٹھٹھہ خیر و مٹمل یونین کونسل میں ۱۲، ہندوانہ کونسل میں ۶ ، بدر علی کونسل میں ۴، مرزا بھٹیاں یونین کونسل میں ۲۰ اور خرم چوہر یڑہ یونین کونسل میں ۳۶ دیہات شامل ہیں-ان کونسلوں میں ممبران کی تعداد ۱۲ سے لے کر ۱۶ تک ہے-ان یونین کونسلوں کی اپنی آمدنی کے ذرائع نہیں ہیں بلکہ یہ محکمہ بلدیات اور ڈسٹرکٹ کونسل سے وسائل حاصل کر کے دیہاتوں کی حالت کو سنوارنے کا کام کرتی ہیں- لیکن ابھی تک یہ یونین کونسلیں دیہاتی زندگی کو بہتر بنانے سے زیادہ سیاسی رسہ کشی اور دشمنیوں کا باعث رہی ہیں-

انتظامی ادارے و تھانے :

پنڈی بھٹیاں کو یکم جولائی ۱۹۹۳ء سے سب ڈویژن کا درجہ حاصل ہوا اور تقریباً ۸۵ مربع کلو میٹر کا رقبہ اس میں شامل کیا گیا-اس کے ساتھ ہی یہاں اسسٹنٹ کمشنر، تحصیلدار، سول عدالت اور پولیس سب ڈویژن آفیسر کے دفاتر قائم ہوئے-اب تک یہاں چوہدری محمد جمیل، ارشاد اختر قریشی، شوکت جاوید فاروقی، ظفر حسین چوہدری، ڈاکٹر جمال یوسف، سید محمد ممتاز اور چوہدری محمد فاروق اسسٹنٹ کمشنر کے عہدے پر فائز رہے-

یہ تحصیل پنڈی بھٹیاں، جلالپور اور سکھیکی کے تین تھانوں اور کالیکی منڈی کی ایک پولیس چوکی پر مشتمل ہے- تھانہ پنڈی بھٹیاں انگریزی دور حکومت میں ۱۸۸۰ء کے لگ بھگ قائم ہوا تھا- جبکہ اس کی موجودہ عمارت ۱۸۹۲ء میں تعمیر ہوئی-اس وقت یہاں ایک انسپکٹر، ۳ سب انسپکٹر، ۶ اسسٹنٹ انسپکٹر، ۲ ہیڈ کانسٹیبل اور ۳۰ کانسٹیبل تعینات ہیں- تھانہ جلالپور جو پہلے پہل چوکی تھی بعد ازاں اسے تھانہ کا درجہ دیا گیا-اس وقت یہاں کی نفری میں ایک انسپکٹر، ۳ سب انسپکٹر، ۲ ہیڈ کانسٹیبل اور ۲۶ کانسٹیبل شامل ہیں-اس وقت یہاں سول عدالت اور بار بھی قائم ہے جو عارضی طور پر بائی وے ریسٹ ہاؤس میں کام کر رہی ہے-

قدیم و جدید تعلیمی ادارے :

دلے دی بار کے مرکزی علاقے مخصوص جاگیردارانہ ماحول کی وجہ سے تعلیمی میدان میں کسی قابل فخر کردار کے حامل نہیں رہے یہی وجہ ہے کہ یہاں کے عوام کی ذہنی و فکری بالیدگی اس معیار پر نہیں پہنچ پائی ہے کہ جو انسانی ترقی کے لیے لازمی سمجھی جاتی ہے-اس ناموافق ماحول کے باوجود سرکاری و غیر سرکاری سطح پر قائم ہونے والے تعلیمی ادارے شعور و آگہی اور علمی اقدار کے

چراغ کو روشن رکھنے میں اہم کردار کرتے آئے ہیں- ان قدیم اور جدید تعلیمی اداروں کی تاریخ تلاش کی جائے تو یہاں انگریزی مدرسوں کے قیام سے قبل جو دیسی مدرسے کام کر رہے تھے ان میں زیادہ تر گورمکھی، سنسکرت، فارسی، عربی اور قرآن پاک کی تعلیم دی جاتی تھی- تقریباً ہر مذہب کے اپنے اپنے سکول تھے- گورنمنٹ کالج لاہور کے پہلے پرنسپل مسٹر لائٹز کی ۱۸۸۳ء میں مرتب رپورٹ کے مطابق ۱۸۸۰ء کی دہائی میں پنڈی بھٹیاں اور جلالپور بھٹیاں میں ۲ مہاجنی سکول قائم تھے- جبکہ پنڈی بھٹیاں، قلعہ مراد بخش، چک بھٹی اور بھٹی آسائش میں چار گورمکھی سکول بھی تھے جو یہاں کے دھرم شالاؤں میں قائم تھے اور ان میں گنگا داس، گھنیشا سنگھ، ایشر داس، اور دس مل گورمکھی کی تعلیم دیتے تھے- ان مدرسوں کے علاوہ جلالپور بھٹیاں اور چک بھٹی میں عربی فارسی کے دو مکتب بھی تھے جہاں مولانا محمد حسن اور احمد الدین معلم تھے- علاقے کے دیگر دیہاتوں سوئیاں والا، رام کے چٹھہ، نقی چٹھہ، چک غازی، شوری، ٹھٹھہ نانک نانو آنہ، کسیسے، متے کی اور مذھوراو غیرہ میں بھی فارسی اور قرآن پاک کی تعلیم کے مدرسے قائم تھے- جبکہ کالیکی اور سکھیکی کے علاقوں میں اس عرصے کے دوران عالم مصطفےٰ، محمد عمر، محمد دین اول، سلطان احمد، محمد دین ثانی، پنڈت گنڈا، بھائی گوردت سنگھ، تیجا سنگھ اور حکیم غلام اللہ کی معلمی میں عربی فارسی اور گورمکھی کے مدرسے کام کر رہے تھے- اس دور کی تعلیمی حالت کا جائزہ لیا جائے تو اس وقت علاقے کے مسلمان جاگیرداروں کے دیہات میں مدرسوں اور سکولوں کا بالکل ذکر نہ تھا مثلاً رسولپور تارڑ، وینیے تارڑ اور کولو تارڑ- کیونکہ وہاں علم و دانش کا کوئی چراغ روشن نظر نہیں آتا- خانقاہ ڈوگراں اور اجنیانوالہ کا شمار بھی ایسی ہی بستیوں میں تھا جہاں اس دور میں کسی مکتب کی کوئی اطلاع نہیں ملتی اور نہ ہی کسی عالم دین کا تذکرہ-

انیسویں صدی کی آخری دہائیوں میں انگریزی مدرسے قائم ہونا شروع ہوئے تو دو عملی نظام تعلیم نے فروغ پانا شروع کر دیا- پنڈی بھٹیاں میں انگریزی حکومت کا پہلا سرکاری مدرسہ ۱۸۷۰ء کے لگ بھگ قائم ہوا اور اس کے پہلے مدرس میاں عمر دین مقرر ہوئے جو قبل ازیں الہ آباد کی کچہری میں منشی رہ چکے تھے اور بعد ازاں جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے واقعات کے نتیجے میں یہاں آبسے تھے- پھر آریہ سماجی ہندوؤں نے بھی اپنے سکول کھولنے شروع کر دیئے- اس طرز کے تعلیمی اداروں کے قیام کے بعد مسلمان معاشی لحاظ سے دوسری قوموں کے مقابلے میں تو پیچھے تھے ہی اب تعلیمی میدان میں بھی پسماندہ ہوتے چلے گئے- مسلمانوں کی معاشرت پر اس کے اثرات جب شدت کے ساتھ نمایاں ہونے لگے تو مسلمان سماجی تنظیموں نے خالص مسلم مدرسوں کے قیام کی طرف توجہ کی- اس ضمن میں جلالپور بھٹیاں میں قیام پاکستان سے قبل انجمن اشاعت اسلام نے ہندوؤں کے ہندی سکول کے مقابلے میں اردو اور انجمن اصلاح المسلمین نے پنڈی بھٹیاں میں مسلم مدرسہ

قائم کیا۔ یہ دونوں مدرسے قیام پاکستان کے بعد بھٹو دور حکومت تک انہی انجمنوں کے تحت کام کرتے رہے۔ پھر انہیں قومی تحویل میں لے کر سرکاری مدرسوں کے ساتھ منسلک کر دیا گیا۔ اس وقت تحصیل پنڈی بھٹیاں میں ایک ڈگری کالج، لڑکیوں کے لیے ہائر سیکنڈری سکول، لڑکوں کے لیے ۱۵ اور لڑکیوں کے لیے ۳ ہائی سکول، لڑکوں کے ۳ اور لڑکیوں کے ۴ مڈل اور ۱۶۱ ۳ پرائمری سکول علم کی روشنی پھیلانے میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ ان میں کچھ اہم اداروں کے مختصر احوال یہ ہیں۔

گورنمنٹ ڈگری کالج (پنڈی بھٹیاں)

یہ ادارہ یکم ستمبر ۱۹۹۶ء کو قائم ہوا اور پروفیسر محمد اویس نے اولین پرنسپل کے عہدے کی ذمہ داریاں سنبھالیں۔ کل ٹیچنگ سٹاف ۲۲ اور طلبہ کی تعداد چار سو کے لگ بھگ ہے۔ عارضی طور پر ہائی سکول نمبر ا کے ایک حصے میں قائم ہے جبکہ کالج کی اپنی عمارت زیر تعمیر ہے۔

گورنمنٹ ہائی سکول نمبر ا:

اس ادارے کا آغاز پرائمری سکول کی حیثیت سے ۱۸۷۰ء کے قریب ہوا اور میاں عمر دین پہلے ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے۔ ان کے عہد میں سکول کی عمارت (اس وقت یہ سکول موجودہ گرلز ہائر سیکنڈری سکول کی عمارت میں تھا) ایک کمرہ اور ایک برآمدہ پر مشتمل تھی۔ ۱۹۰۴ء میں یہ سکول مڈل بنا اور ۱۹۱۲ء میں میاں معظم خاں بھٹی نے سکول کا ہال کمرہ تعمیر کروایا۔ ۱۹۲۴ء میں لالہ دینا ناتھ ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے اور سکول کو اینگلوورنیکلر مڈل کا درجہ دیا گیا۔ ۱۹۱۱ء میں مڈل کا امتحان دینے والے ۷ طالب علموں میں ۶ ہندو اور صرف ایک مسلمان تھا۔ ان میں سے ۶ فیل ہوئے ایک پاس ہوا تھا۔ جبکہ ۱۹۱۱ء میں ۱۱ طالب علموں میں سے ۸ فیل ہوئے تھے۔ ان گیارہ میں ۶ مسلمان اور ۵ ہندو تھے۔ یکم مئی ۱۹۲۶ء میں سکول کو ہائی درجہ دے دیا گیا اور وشنو دتہ مل ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے۔ ۱۹۴۰ء میں سکول کی موجودہ عمارت کی تعمیر مکمل ہوئی اور یہ پرانی عمارت سے یہاں منتقل ہو گیا۔ اس وقت پنڈت دوار کا ناتھ ہیڈ ماسٹر تھے۔ ۱۹۴۲ء میں مہتہ دیارام موہن ہیڈ ماسٹر نے کھیل کے میدان ہموار کروائے۔ قیام پاکستان سے پہلے مسلمان ہیڈ ماسٹروں میں میر خورشید حسن، شیخ محمد اکرام، سید عجائب علی شاہ اور خان ثناء اللہ کے نام نمایاں ہیں۔ سکول کا زیادہ تر تدریسی عملہ ہندو ٹیچروں پر مشتمل تھا۔ ۱۹۲۶ء میں ۱۰ ہندو، ۴ مسلمان اور ایک سکھ ٹیچر تھا۔ ۱۹۴۷ء میں جب پاکستان معرض وجود میں آیا تو سید مصطفےٰ علی شاہ نقوی صاحب کو ہیڈ ماسٹر مقرر کیا گیا۔ انہوں نے سکول کے تعلیمی معیار

کو بلند کرنے میں انتہائی اہم کردار ادا کیا- اس کے بعد سکول کی ترقی و کشادگی میں وقتاً فوقتاً اضافہ ہوتا گیا- ۱۹۶۲ء میں سکول کی مسجد کی تعمیر ہوئی- ۱۹۸۷ء میں سکول کو ہائر سیکنڈری کا درجہ حاصل ہو گیا اور ۱۳ کمروں پر مشتمل ایک علیحدہ بلاک تعمیر ہوا- بعد ازاں ۲۵ کمروں پر مشتمل ایک اور بلاک اور ۶۰ طلباء کے لیے ایک ہوسٹل تعمیر ہوا- ڈگری کالج کے قیام کی وجہ سے ۱۹۹۸ء میں ہائر حصے کو ختم کر کے اسے دوبارہ ہائی سکول بنا دیا گیا- سکول کے قابل ذکر ہیڈ ماسٹروں میں غلام نبی مسلم اور شیخ محمد امین صاحب کے نام نمایاں ہیں- سکول کی عمارت ڈویژن گوجرانوالہ کی خوبصورت عمارتوں میں ایک ہے- اس کا کل رقبہ ۷۶ کنال ۱۰ مرلے ہے، ٹیچنگ سٹاف ۶۰ اور طالب علموں کی تعداد ۸۵۰ کے قریب ہے-(۹۸)

گرلز ہائی سیکنڈری سکول :

اس تعلیمی ادارے کا اجراء پرائمری سکول کی حیثیت سے ۱۹۳۰ء میں ہوا- ۱۹۳۲ء میں اسے مڈل کا درجہ حاصل ہو گیا اور قیام پاکستان کے بعد ۱۹۶۰ء میں یہ ہائی سکول بن گیا- ۱۹۸۷ء میں اس کا درجہ بڑھا کر سیکنڈری کر دیا گیا اور یہاں لڑکیوں کو انٹر تک کی تعلیم کی سہولت بھی حاصل ہو گئی- مسز ظفر مسعود پہلی پرنسپل مقرر ہوئیں- سکول کی عمارت اور تدریسی عملے کی کمی کے باعث سکول میں تعلیمی ماحول کی فراہمی میں مشکلات درپیش ہیں- سکول میں ۳۵ اساتذہ ہیں جبکہ ۶۳۲ طالبات زیر تعلیم ہیں-

دیگر ادارے :

ان اداروں کے علاوہ قصبہ پنڈی بھٹیاں میں لڑکوں کا ایک ہائی اور لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے متعدد مڈل و پرائمری سکول بھی ہیں- ہائی سکول نمبر ۲ میں اس وقت چھ سو سے زائد طلباء زیر تعلیم ہیں- سرکاری مدرسوں کے علاوہ انگریزی اور اردو تعلیم کے چند پرائیویٹ سکول بھی قائم ہیں- یہ سب ادارے تعلیمی ترقی کے فروغ کے لیے کوشاں ہیں-

جلالپور کے تعلیمی ادارے :

قصبہ جلالپور میں اس وقت لڑکوں اور لڑکیوں کے ہائی اور لڑکوں کا ایک مڈل سکول بھی قائم ہیں- بوائز ہائی سکول ۱۹۶۴ء میں یہاں کی سماجی تنظیم انجمن اشاعت اسلام نے قائم کیا تھا- ۱۹۷۲ء میں اسے قومیا لیا گیا- اس سکول کا تعلیمی معیار بہت بلند ہے- گرلز ہائی سکول شروع میں

پرائمری تھااور یہ انجمن اشاعت اسلام کی کوششوں سے تعمیر ہوا۔بعد ازاں اسے مڈل اور ۱۹۷۷ء میں ہائی سکول کادرجہ حاصل ہو گیا۔یوائز مڈل سکول ۱۹۲۷ء میں ڈسٹرکٹ کونسل کی مدد سے قائم ہوااور سید اختر احسن اس کے پہلے ہیڈماسٹر مقرر ہوئے تھے۔

سکھیکی کے تعلیمی ادارے :

یہاں لڑکوں کے لیے ایک ہائر سیکنڈری، ایک ہائی سکول اور لڑکیوں کا ایک ہائی سکول قائم ہیں۔ہائی سکول ریلوے روڈ ابتدا پرائمری سکول تھا۔۱۹۴۶ء میں اسے مڈل کا درجہ ملا اور ۱۹۹۰ء میں ہائی سکول بن گیا۔سکول میں طلباء کی موجودہ تعداد ۱۵۰۰ کے لگ بھگ ہے۔یہاں راشد منہاس ہائر سیکنڈری سکول کے نام سے دوسرا اسکول بھی قائم ہے۔

☆☆☆
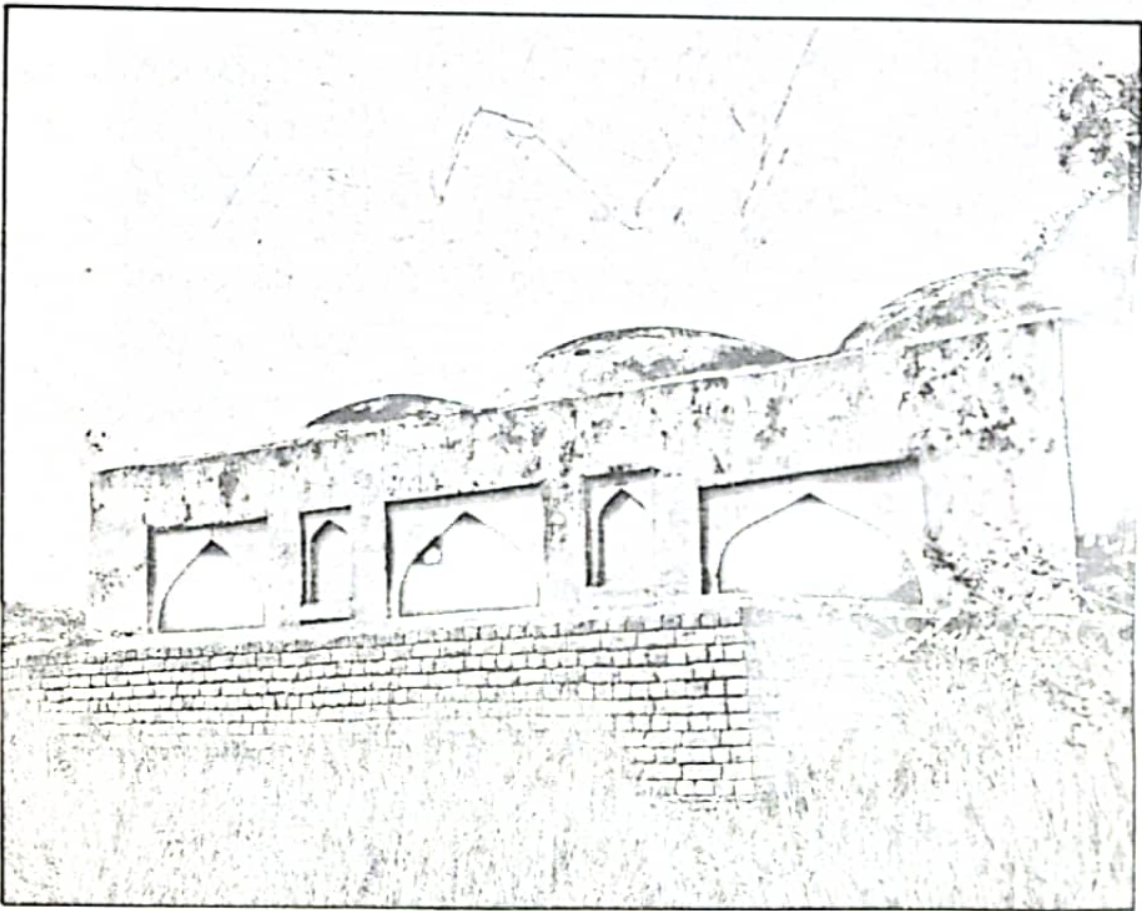
800 سو سال پرانی جلالی مسجد (جلالپور کہنہ)

سیاسی تنظیمیں

کانگریس (۱۹۳۶ء):

پنڈی بھٹیاں میں یوں تو انیسویں صدی کی آخری دہائی میں ہی ہندوؤں کی نیم سیاسی جماعت آریہ سماج کی شاخ قائم ہو گئی تھی لیکن کانگریس ہی پہلی خالص سیاسی جماعت تھی جس کی شاخ پنڈی بھٹیاں میں ۱۹۳۶ء میں قائم ہوئی۔اس کا پہلا اجلاس سرائے گیان چند، واقع لاہور روڈ میں ہوا اور لالہ حویلی رام جی سچدیو صدر، جیون پرکاش جیون نائب صدر، ہر کشن لال جی سچدیو جنرل سیکرٹری، غلام رسول کامریڈ جوائنٹ سیکرٹری اور بھگوان داس کھرانہ خزانچی کے عہدوں پر فائز ہوئے۔دیگر اہم ممبران میں کرشن لال جی سچدیو، رام کشن، گوپال داس بھارتی، پنڈی داس گاندھی، امرناتھ پاہوہ، سندر لال کالڑہ، فقیر چند گابا، مہاشہ برکت رام، رلیارام، مہاشہ تلسی داس کالڑہ، حکیم جے دیال، بوٹا رام، گیان چند، بھگوان داس اور رائے حکومت رائے شامل تھے۔مقامی کانگریس کی زیادہ تر میٹنگز بوٹا رام کی بیٹھک میں منعقد ہوتیں۔البتہ اس کے عام جلسے اندرون غلہ منڈی میں منعقد ہوتے تھے جن سے وقتاً فوقتاً ڈاکٹر سیتہ پال، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، ڈاکٹر گوپی چند بھارگون، ڈاکٹر عالم اور جگت نارائن جیسے کانگریسی لیڈر خطاب کے لیے آتے رہے۔کانگریسی کارکنوں نے ستیہ گرہ اور ہندوستان چھوڑ دو تحریکوں میں بھرپور طریقے سے حصہ لیا اور یہاں سے اس کے پانچ کارکنوں نے گرفتاری پیش کی تھی۔وطن کی آزادی کے لیے یہ کارکن اہم سیاسی کردار ادا کرتے رہے۔(۹۹)

مسلم لیگ کی مقامی شاخ:

کانگریس کے مقابلے میں یہاں مسلم لیگ کی شاخ قدرے دیر سے وجود میں آئی۔یہ شاخ ۱۹۴۲ء میں قائم ہوئی تھی۔البتہ جلالپور بھٹیاں میں ۱۹۳۷ء میں ہی مسلم لیگ کی تنظیم قائم ہو گئی تھی اور وہاں اس کے روح رواں میاں اسلم حیات بھٹی تھے۔لیکن پنڈی بھٹیاں میں اس کے قیام کا سہرا انجمن اصلاح المسلمین کے سر جاتا ہے۔ان کارکنوں میں سب سے پیش پیش شیخ دوست محمد ودہاون، چوہدری محمد حسین ایڈووکیٹ، شیخ چراغ دین، چوہدری الٰہی بخش لودھرا، سید علی احمد، سائیں محمد اسماعیل ڈھیرہ اور غلام محمد مسن تھے۔ابتدا شیخ چراغ دین مقامی شاخ کے صدر اور غلام محمد مسن سیکرٹری جنرل رہے۔بعد ازاں تحریک پاکستان کے دنوں میں میاں محمد حسین بھٹی اس کے

صدر مقرر ہوئے۔ان کارکنوں نے تحریک قیام پاکستان کے لیے کسی بھی قربانی سے دریغ نہ کیا۔ قیام پاکستان کے بعد ۱۹۵۱ء میں پنجاب اسمبلی کے انتخابات کے موقع پر یونینسٹ دوست محمد بھٹی کو مسلم لیگ کا صوبائی ٹکٹ دے دیا گیا۔اس سے مخلص لیگی کارکن بد دل ہو گئے اور مقامی لیگ کی قیادت بھی سابق یونینسٹوں کے ہاتھ میں چلی گئی جس کی وجہ سے یہ آہستہ آہستہ غیر موثر ہوتی گئی۔ بعد ازاں مختلف اوقات میں اس کی تنظیم سازی ہوتی رہی اور حکیم غلام محمد ودیار تھی، عبدالقیوم قادری، جہانگیر خاں بھٹی، شیخ کمال الدین اور شیخ برکت اللہ اپنے اپنے وقتوں میں مقامی شاخ کے صدر مقرر ہوتے رہے۔ آج کل مسلم لیگ (ن) کے عہدیداروں میں چوہدری احسان احمد اور چوہدری محمد شفیق وغیرہ شامل ہیں۔

راشٹریہ سیوک سنگھ :

قیام پاکستان سے قبل پنڈی بھٹیاں میں ہندوؤں کی ایک نیم سیاسی و عسکری تنظیم راشٹریہ سیوک سنگھ بھی قائم تھی۔مقامی طور پر کیسری، بھگوان داس، گوری برہمن اس کے رکن تھے۔یہ انتہا پسند اور انقلابی ذہن کے مالک تھے اور علاقائی جاگیرداروں کی ریشہ دوانیوں کے سخت خلاف تھے۔ان کے کارکن باقاعدہ عسکری تربیت حاصل کرتے تھے۔

دیگر جماعتیں :

قیام پاکستان کے بعد جماعت اسلامی کی شاخ یہاں مہاجرین کی آمد کے ساتھ قائم ہوئی تھی کیونکہ ان مہاجرین میں جماعت کے رکن چوہدری محمد اسلم اور راؤ محی الاسلام بھی شامل تھے۔جو پہلے ہی جماعت سے وابستہ تھے۔چوہدری محمد اسلم ۱۹۵۱ء کے صوبائی اسمبلی کے انتخابات میں اس حلقے سے جماعت اسلامی کے امیدوار بھی تھے۔بعد ازاں وہ گوجرانوالہ منتقل ہو گئے اور ضلع کے امیر بن گئے۔جس کی وجہ سے مقامی شاخ زیادہ فعال نہ رہی۔اس کے کارکنوں میں چوہدری علی احمد، مستری اللہ رکھا، دل محمد، محمد شفیع انصاری، مولوی ارشاد حسین، حاجی نور احمد، حنیف ڈاہر ایڈووکیٹ وغیرہ فعال رہے۔آج کل مقامی شاخ کے امیر ایک نوجوان عرفان قادر ہیں۔ ملکی سیاسی سرگرمیوں میں اپنا حصہ ڈالنے کے ساتھ ساتھ قصبہ کی سماجی سرگرمیوں میں بھی یہ کارکن فعال رہے ہیں۔(۱۰۰)

ایوبی دور کے اختتام پر ذوالفقار علی بھٹو نے پاکستان پیپلز پارٹی کی بنیاد رکھی تو اس کے ایک سال بعد اس کی شاخ یہاں قائم ہو گئی۔مقامی طور پر اس کے بانیوں میں شیخ محمد اکرام، شیخ محمد رمضان، سعید بھٹہ، شیخ مظاہر حسین (مرحوم) مختار ریحان (مرحوم)، بابو نسیم احمد، فضل احمد لودھرا اور سلیم

بھائی جیسے سیاسی ورکر شامل تھے- شیخ عبدالرؤف مقامی شاخ کے پہلے صدر اور شیخ مطاہر حسین جنرل سیکرٹری منتخب ہوئے-ان کارکنوں نے جاگیرداروں کے شکنجے میں پسے طبقے میں شعور کی بیداری کے لیے بے حد کام کیا- بعد ازاں چوہدری احسان احمد، چوہدری محمد اشرف طاہر، مرید حسین قاضی مرحوم، صفدر حسین، عبود شاہ اور شیخ عاشق حسین مقامی شاخ کے عہدیدار رہے-

۱۹۶۸ء میں یہاں پیپلزپارٹی کے قیام سے بہت پہلے ۱۹۵۰ء میں پنڈی بھٹیاں میں آزاد پاکستان پارٹی کی شاخ بھی قائم ہوئی تھی اور اس میں یہاں کے زیادہ تر ترقی پسند پیش پیش تھے-اس کے پہلے صدر رانا محمد طفیل اور سیکرٹری اکبر شاہ تھے- میاں افتخار الدین، سی آر اسلم، شیخ محمد رفیق اس کے جلسوں سے خطاب کے لیے یہاں آتے رہے-

اس کے علاوہ جاگیرداری نظام کے خاتمے اور زرعی زمین کی ۱۲۵ ایکٹر حد ملکیت کا منشور رکھنے والی جماعت کی مقامی تنظیم قائم کرنے کا سہرا ۱۹۷۰ء میں یہاں کے سینکڑوں ایکڑ اراضی کے مالک بڑے زمیندار میاں نوازش علی بھٹی کے سر ہے-وہ تحریک استقلال کی ضلعی شاخ اور پنجاب کونسل کے رکن بھی رہے اور ۱۹۷۷ء کے انتخابات میں اس کے کوٹے سے انہیں قومی اتحاد کی طرف سے صوبائی ٹکٹ بھی دیا گیا- یہاں تحریک استقلال انہی کی ذات تک وابستہ اور محدود رہی-ان ملکی سیاسی جماعتوں کے علاوہ جمعیت علماء اسلام، جمعیت علماء پاکستان، سپاہ صحابہ، مجلس احرار، تحریک جعفریہ اور مجلس ختم نبوت جیسی جماعتوں کی شاخیں بھی قائم ہوئیں ان جماعتوں میں زیادہ تر یہاں کے مذہبی فرقہ وارانہ خیالات کے کارکن پیش پیش رہے-

☆☆☆

زراعت، صنعت و حرفت

زراعت :

دلے دی بار کی معیشت کا انحصار صدیوں کی طرح آج بھی زراعت پر ہے لیکن ایک وقت تھا کہ یہ علاقہ ویران پڑا تھا اور گھرے گھنے جنگل ہر سو پھیلے ہوئے تھے۔انیسویں صدی کے آخر میں اس خطے کے جغرافیائی حالات کا یہ عالم تھا کہ ہر سو خشک زمین اور زرعی لحاظ سے بے منفعت زمین پھیلی ہوئی تھی۔اکادکا کنواں دکھائی دیتا جو کسی ملحقہ چھوٹے سے کھیت کا ضامن ہوتا تھا۔بارش کی شرح ۵ انچ سالانہ تھی۔مگر بارش کے چھینٹے پڑتے ہی گھاس بڑی تیزی سے پروان چڑھتی۔البتہ بار کے جن جن خطوں سے دریائے چناب کا پانی گزرتا تھا وہاں اس کے سیلابی پانیوں کے سبب سبز کھیتوں کے ٹکڑے دکھائی دیتے تھے۔۱۸۰۲ء میں جب سکھوں نے ان علاقوں پر قبضہ کیا تو ان کو دیوان ساون مل اور ملراج کو ٹھیکوں پر دے دیا گیا۔انہوں نے زراعت اور زمیندار دونوں کی ترقی کے لیے بعض مفید کام کئے۔مقامی بھٹی زمینداروں کو تو سکھوں نے نکال باہر کیا تھا لیکن ان کی عدم موجودگی میں سکھوں نے بکسیں کے بھٹی اور کھرلوں کو آسان شرائط پر زمین دے کر ان کو آباد کرنے کا آغاز کیا۔اس کے بڑے اچھے اثرات نکلے اور جگہ جگہ آبپاشی کے کنویں اور سرسبز کھیت نظر آنے لگے۔لیکن مہاراجہ رنجیت سنگھ نے ان پر جو سنگین قسم کے محصولات عائد کئے تھے ان کے سبب بار کے عام کاشتکاروں کی حالت میں کوئی خاطر خواہ تبدیلی نہ آسکی۔اس دور میں محصول اراضی خام پیداوار کا نصف لیا جاتا تھا اور یہ نقد کی بجائے بہ شکل جنس وصول کیا جاتا تھا۔اس لیے اچھے اور برے دونوں ہنگام میں کھیتوں کی پیداوار کے ساتھ اس کا تناسب یکساں رہتا تھا۔بعد میں انگریزوں نے یہ نظام تبدیل کر دیا اور مالگزاری نقدی کی شکل میں وصول ہونے لگی۔پھر ۱۸۶۸ء، ۱۸۸۷ء، ۱۸۹۱ءاور ۱۹۰۰ء میں بندوبست اراضی اور زرعی اصلاحات کے نتیجے میں کچھ بہتری کے آثار دکھائی دینے لگے اور چھوٹے کاشتکار کی حالت بھی سنورنے لگی۔اس زمانے میں نہری نظام ابھی وجود میں نہیں آیا تھا اور نہ ہی جدید آبپاشی کے وسائل تشکیل پائے تھے۔اس لیے زراعت کا زیادہ تر انحصار چاہ آبپاشی پر تھا۔۶۷-۱۸۶۶ء کی بندوبست اراضی رپورٹ کے مطابق بار کے ۷۵ فیصد قابل کاشت رقبے کے لیے کنوؤں کے ذریعے پانی فراہم کیا جاتا تھا۔اس کے لیے چرکھری استعمال کی جاتی۔ایک اچھا کنواں وہ ہوتا تھا جس کے لیے چھ سے آٹھ بیل موجود ہوتے تھے۔کیونکہ بیک وقت دو بیل کنویں کو چلاتے

اور چار گھنٹے سے زیادہ کام نہیں کر سکتے تھے-ایک کنویں میں عموماً دو دو تین تین حصے دار ہوتے تھے اور وہ واری (باری) جو چھ گھنٹے پر مبنی ہوتی تھی کے ذریعے اپنے حصے کا پانی اپنے کھیتوں کو سیر اب کرنے کے لیے حاصل کرتے تھے-ایک کنویں سے سال میں ۲۰ سے ۲۵ ایکٹر زمین کو کاشت کیا جا سکتا تھا اور اگر بیل دن رات کام کریں تو ۴۰ ایکٹر تک زمین کاشت کی جا سکتی تھی-انیسویں صدی کے آخر میں چناب سے نہریں نکالی گئیں اور بعد ازاں آبپاشی کے جدید طریقے رائج ہوئے تو رفتہ رفتہ ان روایتی کنوؤں کا بھی خاتمہ ہو تا گیا-اب یہ کنویں بار کے علاقے میں اکا دکا ہی نظر آتے ہیں-

دلے دی بار کی زرعی زمین کلراٹھی، میرا، ہلکی میرا، چاہی، غیر چاہی، روہی اور نیائی قسموں کی ہے-نیائی زمین وہ ہوتی ہے جو گاؤں کے بالکل قریب ہوتی ہے اور اس میں قدرتی کھاد کا استعمال زیادہ ہوتا ہے-یہاں کی فصلوں میں زیادہ تر گندم، گنا اور مونجی شامل ہیں- تل، گوارا، توریا، باجرہ اور کپاس کی فصلیں بھی ہوتی ہیں لیکن کم مقدار میں- محکمہ زراعت کے دفتر شماریات کی رپورٹ کے مطابق ۱۹۹۷ء میں پنڈی بھٹیاں کے علاقے میں گندم کی فی ایکٹر پیداوار ۲۰.۴ من، گنے کی ۳۶۳.۷ من، مونجی باسمتی کی ۲۱.۵ اور مونجی اری کی ۳۸.۵ من تھی-مرکز پنڈی بھٹیاں کے ۱۲۵۰۵۴ ایکڑ رقبے میں سے ۸۹۰۵۳ ایکڑ کاشت ہے-اجناس کی خرید و فروخت کے لیے پنڈی بھٹیاں، جلالپور اور سکھیکی میں منڈیاں قائم ہیں-ان قصبوں میں اجناس اور سبزیوں کی قیمتوں کے روزانہ تعین اور کاشتکاروں کو بہتر سہولتیں فراہم کرنے کے لیے مارکیٹ کمیٹیاں بھی موجود ہیں-ان کمیٹیوں کا نظام قیام پاکستان سے قبل سر چھوٹو رام نے ۱۹۳۹ء میں متعارف کرایا تھا اور اسی کے تحت مارکیٹ کمیٹی پنڈی بھٹیاں کا قیام ۱۹۵۲ء میں عمل میں آیا تھا-

ادارہ تحقیقات شور زدہ اراضیات:

زرعی اراضیات کے حوالے سے ہی ۱۹۸۲ء میں پنڈی بھٹیاں میں ایک ایسا ادارہ تشکیل دیا گیا جو پورے پاکستان میں منفرد حیثیت کا حامل ہے-یہ ادارہ شور زدہ اراضیات کو قابل کاشت بنانے کے لیے تحقیقات کی غرض سے قائم ہوا-عارضی طور پر یہ ۵ سال تک ایوب ریسرچ سنٹر فیصل آباد میں کام کرتا رہا- پھر ۱۹۸۷ء میں پنڈی بھٹیاں منتقل ہو گیا-اس کی یہاں منتقلی میں محمد حیات بھٹی نے بھرپور کردار ادا کیا-اس تحقیقاتی مرکز کے ۷ ڈویژن ہیں جن میں مجموعی طور پر ۳۰ ٹیکنیکل گزٹیڈ اور ۷۰ معاون سٹاف ہے-ریسرچ کے لیے ٹھٹھہ خیرو مٹمل میں ۱۶۳ ایکڑ پر مشتمل ریسرچ ایریا قائم کیا گیا ہے-ان لیبارٹریوں میں شور زدہ اراضیات کو قابل کاشت بنانے کے علاوہ بہتر بیجوں کی دریافت پر بھی ریسرچ کی جاتی ہے-اب تک یہاں کے زرعی سائنس دانوں کے ساتھ سے زیادہ

تحقیقی مقالے بین الاقوامی معیار کے جرنلز میں شائع ہو چکے ہیں- تین سائنس دان یہاں سے ڈاکٹریٹ کر چکے ہیں- ان میں ایک سائنس دان ڈاکٹر طارق چٹھہ نے دن رات کی تحقیق کے بعد چاول کی ۲ نئی اقسام شاہین اور پنڈی بھٹیاں ۹۵ ایجاد کی ہیں- وسائل کی کمی کے باوجود اس تحقیقاتی ادارہ کے زرعی سائنس دان زرعی زمین کی بیماریوں پر قابو پانے کے لیے ہمہ تن مصروف کار ہیں-

صنعت و حرفت :

زراعت کے علاوہ بار کے لوگوں کی معیشت کا انحصار صنعت و حرفت پر بھی ہے- تقریباً ایک صدی پہلے تک روئی کی صنعت کی وجہ سے چرخہ اور جولاہا صنعت کے بنیادی عناصر ہوتے تھے- یہاں کی اناث کی تقریباً نصف آبادی اپنی محنت کے منافع سے اپنے آباء اور شوہروں کی آمدنی میں اضافہ کرتی تھی- یہاں کوئی گرنی یا کارخانہ موجود نہ تھا بلکہ ہر عورت گاؤں کی منڈی سے روئی خرید لیتی تھی اور کاتنے کے بعد سوت کو کات کر گاؤں کے جولاہے کے ہاتھ فروخت کر دیتی تھی- جولاہا اس کا کپڑا بن کر بیوپاریوں اور تاجروں کے ہاتھ بیچ دیتا تھا- اس طرح بنے ہوئے پارچے کے تھان کے تھان مارکیٹوں میں جاتے تھے- اس صنعت کو مسلمان جولاہوں نے قائم رکھنے میں بڑی سعی بلیغ کی تھی- لیکن ان کی حالت معاشی ایسی رہی کہ افلاس کے قعر مذلت میں پڑے ہوئے تھے- قحط اور دیگر قدرتی آفات کا سب سے پہلے یہی شکار ہوتے- انیسویں صدی کی آخری دہائیوں میں آبپاشی کے وسائل کی دستیابی کی وجہ سے زراعت کو ترقی ہونا شروع ہوئی تو اس کے نتیجے میں مال مویشیوں کی پرورش بھی آسان ہوتی گئی- چنانچہ دیسی گھی کی دستیابی بھی وافر مقدار میں ہونے لگی اور پنڈی بھٹیاں گھی کی خرید و فروخت کا مرکز بنتا گیا- یہاں سے سینکڑوں من گھی روزانہ لاہور لے جا کر فروخت کیا جاتا- وقت کے ساتھ ساتھ گھی کی دیسی صنعت کو تو زوال آتا گیا لیکن دودھ کی بڑے پیانے پر خرید و فروخت آج تک برقرار رہی- اب پنڈی بھٹیاں اور جا[illegible] بھٹیاں اجناس کی خرید و فروخت کے مراکز بن چکے ہیں اور یہاں کا چاول بیرون ملک بھی فروخت ہوتا ہے- زرعی تجارت کے علاوہ یہاں کاروبار کے لیے متعدد بازار اور مارکیٹیں بھی ہیں جن میں ارد گرد کے سینکڑوں دیہاتوں کے لوگ یہاں آکر خرید و فروخت کرتے ہیں- پنڈی بھٹیاں کے معروف بازاروں میں مین بازار، عاقل والا بازار اور کٹڑہ بازار شامل ہیں- علاوہ ازیں یہاں سوت کے دو کارخانے اور لوہے کے کام کی چند ورکشاپیں بھی ہیں- کاٹھیاں، جوتے، مٹی کے برتن، کھڈیوں کے ذریعے چادریں اور کھیس بنانے کی دستکاری بھی عام ہے- جدید صنعتوں میں یہاں جین کی پتلونیں تیار کرنے والا ایشیاء کا سب سے بڑا کارخانہ بھی قائم ہے- یہ کارخانہ امریکی فرم گرین ووڈ اور پاکستان کے کریسنٹ گروپ کے باہمی اشتراک سے قائم

ہوا-اس میں روزانہ ۲۰ ہزار جین کی پتلونیں تیار ہو کر بیرون ملک فروخت کی جاتی ہیں-جدید ترین کمپیوٹر آلات سے مزین اس مل میں تقریباً ۳ ہزار ملازم کام کرتے ہیں-اب لاہور اسلام آباد موٹروے کی تعمیر کے بعد پنڈی بھٹیاں کے قریب ایک صنعتی زون کے قیام اور نیو سٹی پراجیکٹ کی منظوری بھی دی گئی ہے جس سے بار کے علاقے میں صنعتی خوشحالی اور ترقی کو بے حد فروغ ملے گا-

☆☆☆
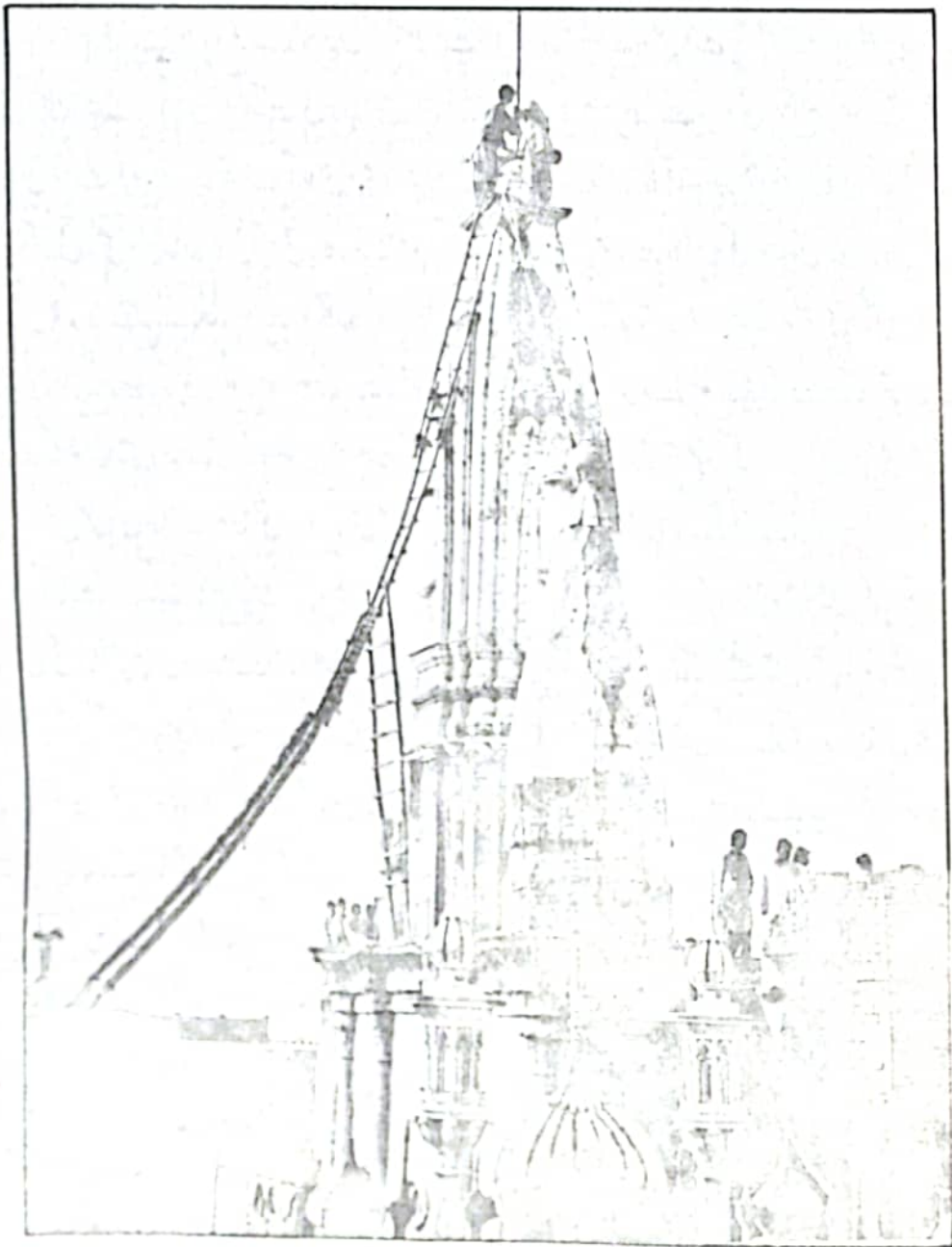
رگوناتھ مندر کا بیرونی حصہ جو اب معدوم ہو چکا ہے

تہذیب و ثقافت

رسم و رواج :

بار کے علاقے میں جو رسم و رواج رائج ہیں ان کے مطابق بچے کی پیدائش پر خاندان کا کوئی خوش قسمت فرد بچے کو شہد چٹاتا ہے۔ کیونکہ لوگوں کا خیال ہے کہ بچے کی زندگی پر اس کو پہلی مرتبہ گھٹی چٹانے والے کا بہت اثر پڑتا ہے۔ اگر لڑکا پیدا ہو تو گھر کے دروازے پر "شریہیں" کے درخت کے پتے باندھے جاتے ہیں اور خوشی کا اظہار کیا جاتا ہے۔ اگر لڑکی ہوتی ہے تو عموماً اکثریت افسوس کرنے آتی ہے۔ عام رواج کے مطابق پہلا بچہ ننہال کے ہاں ہوتا ہے۔ ننہال والے رخصت ہوتے وقت نومولود اور اس کے والدین کے لیے کپڑے وغیرہ بنا کر دیتے ہیں جسے ویام کہا جاتا ہے۔ بچہ ہونے کے چالیسویں دن چلہ ہوتا ہے۔ زچہ عورت نئے کپڑے پہنتی ہے اور بناؤ سنگھار کرتی ہے۔ بعض گھروں میں اس موقع پر میٹھی چیز تقسیم کی جاتی ہے ساتویں یا گیارہویں روز بچے کا سر مونڈ کر جھنڈ اتروائی جاتی ہے اور چھوٹی موٹی تقریب کی جاتی ہے۔ جب بچے کی عمر چار سال اور چار مہینے کی ہوتی ہے تو اس کی رسم بسم اللہ کی جاتی ہے۔ اس موقع پر قریبی رشتہ داروں کی دعوت کی جاتی ہے۔ بچے سے تین مرتبہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم اور الف۔ ب۔ ج۔ کہلایا جاتا ہے۔ بچہ جب قرآن ختم کر لیتا ہے تو آمین کی رسم ہوتی ہے۔

دلے کی بار کے علاقوں میں شادی بیاہ کی رسوم پنجاب کے دیگر علاقوں سے ملتی جلتی ہیں۔ پہلے دونوں خاندانوں کے بزرگوں کے درمیان رشتے کی بات طے کی جاتی ہے پھر منگنی کی رسم ادا کی جاتی ہے۔ دونوں طرف سے تحفے تحائف کے تبادلے کے علاوہ لڑکے اور لڑکی کو انگوٹھی پہنائی جاتی ہے۔ شادی کی تاریخ مقرر ہونے سے دو تین ہفتے قبل شادی کی تقریب کا آغاز ہو جاتا ہے۔ دونوں گھروں میں ڈھولک بجتے ہیں اور رات کو محلے گاؤں کی لڑکیاں شادی کے گیت گاتی ہیں۔ اس موقع پر عورتیں اپنے ساتھ گیہوں لاتی ہیں جس کو ویل کہا جاتا ہے۔ یہ ویل کمیوں میں تقسیم کی جاتی ہے۔ شادی کی دعوت نائیوں کے ذریعے دی جاتی ہے۔ بارات کی تاریخ سے کچھ دن قبل وڑایا سنبھال کے طور پر میٹھے چاول برادری، محلے، گاؤں والوں میں تقسیم کیے جاتے ہیں۔ بارات سے ایک روز قبل دلہا اور دلہن کو مائیاں بٹھایا جاتا ہے۔ اس رسم میں گرہ دار رنگین دھاگہ دلہن اور دولہا کی کلائیوں میں لگایا جاتا ہے۔ پھر ہاتھوں پر مہندی لگائی جاتی ہے پھر ایک کٹوری میں تیل ڈالتے ہیں اور

اس میں انگلی ڈبو کر ان کے سروں میں لگاتے ہیں اس کے بعد دونوں پر رنگ دار پانی پھینکا جاتا ہے کہ اب ان کی شادی بھی جلد ہو جائے گی-بارات کی روانگی سے قبل میل کی رسم ہوتی ہے اور دلہا والے مہمانوں کو پر تکلف کھانا کھلاتے ہیں-بارات کی روانگی کے روز دلہا کے ہاں صبح ڈھول اور شہنائی کی گونج میں کھارا کی رسم ادا کی جاتی ہے-دلہا کی بہنیں اور دوسری عورتیں مٹی کا ایک رنگین گھڑا لے کر خوشی کے گیت گاتی قریبی کنویں سے پانی بھر کر لاتی ہیں اور دلہا جو لنگی باندھے ہوتا ہے اسے نہلاتی ہیں-اس موقع پر دولہا کا ماموں یا ماموں زاد بھائی تحفہ دیتا ہے جو کھارا لہائی کہلاتی ہے-یہی رسم دلہن کے گھر بھی ہوتی ہے-دولہا تیار ہو کر عموماً کسی قریبی بزرگ کے مزار پر حاضری دیتا ہے اور دعا مانگی جاتی ہے- پنڈی بھٹیاں میں عموماً لوگ میاں خیر محمد نون صاحب کے مزار پر حاضر ہوتے ہیں- برات کی روانگی کے وقت دلہا کے گھوڑے کی لگام پکڑ کر نیگ وصول کرتی ہیں-اس طرح دلہن کے گھر پہنچ کر رسم نکاح ہوتی ہے اور بد تقسیم کی جاتی ہے-دلہن کے سسرال آنے پر رشتہ دار اور محلے والے دلہن کو منہ دکھلائی دیتے ہیں-دوسرے روز دلہن والدین کے گھر چلی جاتی ہے اور پھر ایک روز بعد دلہا کے والدین لڑکی کو لینے خود جاتے ہیں جسے مکلاوا کہتے ہیں-

جب کوئی مرتا ہے تو برادری والوں کو اطلاع کی جاتی ہے- عورت مرے تو اس کے کپڑوں کا بہترین جوڑا اس کے کفن پر رکھ دیا جاتا ہے- جنازے پر دوشالہ ڈالنے کا رواج بھی ہے- جب کوئی لڑکی اپنی جوانی میں مرتی ہے اور اس کی منگنی ہوئی ہو تو گوٹوں ستارے والا دوپٹہ اس پر رکھا جاتا ہے- مسلسل تین روز تک سوگ منایا جاتا ہے-اس دوران لواحقین کے عزوا قارب کھانے کا بندوبست کرتے ہیں-سوئم کے موقع پر قل ہوتے ہیں اور چنے وغیرہ تقسیم کئے جاتے ہیں اگر مرنے والا خاندان کا سربراہ ہو تو بڑے لڑکے کو اس کا جانشین بنانے کی رسم ادا کی جاتی ہے جس کو دستار بندی یا پگڑی کی رسم کہتے ہیں- گیارہویں اور سوا مہینے کے بعد چہلم کا فاتحہ ہوتا ہے-اس موقع پر بڑی دعوت کا اہتمام بھی ہوتا ہے اور بعض گھروں میں جوڑے تقسیم کرنے کا رواج بھی ہے اور ان کی باقاعدہ نمائش بھی کی جاتی ہے-اس کے بعد ہر سال برسی منائی جاتی ہے-دیہاتی علاقوں میں کسی بزرگ کے مرنے پر اس کی کامیاب زندگی گزارنے کے اعتراف کے طور پر لدا کی رسم ہوتی ہے-جو مردے کو دفن کرنے کے دسویں یا پنتیسویں دن ہوتی ہے-اس موقع پر رشتہ دار نئے کپڑے پہنتے ہیں اور دعوت ہوتی ہے اور تحفہ بھی لاتے ہیں-اکثر گھروں میں عورتیں ایک دوسرے کے گلے لگ کر اپنے چہروں پر چادر اوڑھ کر باقاعدہ روتی اور بین کرتی ہیں-اس طرح باری باری مرنے والے کے قریبی رشتے دار یہ سلسلہ جاری رکھتے ہیں-

عقائد اور توہمات :

عقائد اور توہمات ایسے اطوار اور واہمے ہیں جن کی جڑیں بہت گہری ہوتی ہیں- دنیا کے ترقی یافتہ علاقوں میں بھی ایسے قبیلے اور جرگے ہیں جو فوق الفطرت طاقتوں میں یقین رکھتے ہیں- ان کا خیال ہے کہ انسان کے تمام اعمال انہی طاقتوں کے اختیار میں ہیں- توہمات اب تک ان کی زندگی میں اہم کردار انجام دیتے ہیں- دلے کی بار کی اکثریت دیہاتی اور ان پڑھ لوگوں کی ہے- صدیوں تک یہ لوگ تعلیم اور ترقی یافتہ فرقوں کی صحبت سے محروم رہنے کے سبب توہمات اور جادو ٹونے کی گرفت میں رہے- اب جبکہ دیہاتوں میں اسکول کھلے ہیں اور خواندگی میں اضافہ ہوا تو لوگ قدرے معقولیت پسند ہو گئے ہیں- پھر بھی بعض توہمات اسی طرح قائم و دائم ہیں جیسے صدیوں پہلے تھے- مثلاً :

1- جب کسی عورت کے بچے پیدا ہوتے ہی مر جائیں تو کسی حاملہ عورت پر اس کا سایہ بھی نہیں پڑنے دیا جاتا اور خیال کیا جاتا ہے کہ ایسا ہونے سے اس کا بچہ بھی زندہ نہیں رہے گا-

2- لڑکے کی پیدائش کے بعد اس کے سرہانے لوہے کی کوئی چیز رکھی جاتی ہے- اس سے یہ یقین کیا جاتا ہے کہ بچہ ڈرے گا نہیں- بچے کو کسی تعویذ والی عورت کی آواز سے بچایا جاتا ہے-

3- سورج گرہن یا چاند گرہن کے موقع پر حاملہ عورت کو کام کی ممانعت ہوتی ہے- عقیدہ یہ ہے کہ گرہن کے وقت حاملہ عورت کی کسی بھی جنبش کا اس بچے پر منفی اثر ہوتا ہے جو ماں کے رحم میں ہے- اگر گرہن کے دوران وہ کوئی لکیر کھینچتی ہے یا چھری سے کوئی چیز کاٹتی ہے تو اس کا نشان اس کے بچے کے جسم پر نمودار ہو جائے گا-

4- بچوں کو بری نظر سے بچانے کے لیے بعض عورتیں ان کی گردن کے گرد نظر بٹو (نظر کا ڈورا یا گنڈا) ڈال دیتی ہیں جس بچے کو نظر لگ گئی ہو اس کے علاج کا طریقہ یہ ہے کہ کچھ سوکھی مرچیں لے کر انہیں پہلے بچے کے سر پر اتارا جاتا ہے اور پھر آگ کی نذر کر دیا جاتا ہے- اگر مرچوں کا دھواں آنکھ میں نہیں لگتا تو یہ یقینی بات سمجھی جاتا ہے کہ بچے کو نظر لگی ہوئی تھی-

5- گرمیوں کے موسم میں جب آندھیاں چلتی ہیں تو بھائی پھیرو کی رضا حاصل کی جاتی ہے- روایت یہ ہے کہ بھائی پھیرو ایک برہمن تھے جو سخی سرور کے جانشین تھے-

6- ماضی میں جب کوئی نیا کنویں کھودا جاتا تھا تو زمین کا ایک تودہ خواجہ خضر کی رضا کے لیے بغیر کھودے علیحدہ چھوڑ دیا جاتا- جب پانی نکلنا شروع ہو جاتا تو اس تودے کو بھی کھود ڈالتے-

7- جب دلے کی بار میں ہندو بھی مقیم تھے تو ان کا عقیدہ تھا کہ اگر ہولی، لوہڑی یا بیساکھی کا تہوار منگل کے دن پڑ جائے تو اس بات کا اندیشہ ہوتا ہے کہ دنیا میں کوئی بہت بڑی آفت آنے والی ہے-
ہولی، لوہڑی، دیوالی منگل وار ہوئی چڑھ کھ چڑھے گی پر تھوی ورلا جیو لا کوئی-

8- عام طور پر منگل کا دن فصل کاٹنے اور بدھ کا دن فصل بونے کے لیے اچھا سمجھا جاتا ہے- منگل واڈی، بدھ بجائی- بدھ کا دن گائے کی خریداری، جمعہ کا دن گھوڑی کے لیے اور ہفتے کا دن بھینس خریدنے کے لیے اچھا سمجھا جاتا ہے- بعض توہم پرست گھرانے منگل اور اتوار کو گوشت نہیں کھاتے- منگل بدھ کو سفر نہیں کرتے اور ان دنوں کو کپڑے کی کٹائی بھی نہیں کرتے- نیا کپڑا پہننا ہو تو بدھ اور ہفتے کو اور نیا زیور پہننا ہو تو اتوار کے دن پہنتے ہیں-

منگل بدھ نہ جاویں پہاڑ
متاں جتی بازی آویں ہار
بدھ سنیچر، کپڑا، گہنا ایتوار

9- الو ویرانی کی علامت ہے اور کسی مکان کی چھت پر گدھ کا بسیرا بد نصیبی کی-

10- اگر کسی کو سانپ ڈس لے تو اس کے کان میں کسی حاملہ عورت کی آواز نہیں پڑنی چاہیے ورنہ اس کا درد شدید ہو جاتا ہے-

11- دائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر خارش ہو تو رقم ملنے اور بائیں پر خارش ہو تو رقم خرچ ہونے کا امکان ہوتا ہے-

12- گھر کی منڈیر پر کوا بولے یا آٹا گوندھتے وقت آٹا برتن سے باہر گر جائے تو سمجھا جاتا ہے کہ اس روز مہمان آئے گا-

13- کالی بلی صبح صبح نظر آجائے تو وہم کیا جاتا ہے کہ دن اچھا نہیں گزرے گا-

14- مرد گھر کے دروازے سے باہر نکل جائے تو پیچھے سے آواز دینے کو برا سمجھا جاتا ہے-

15- شام کے بعد گھر میں جھاڑو دینے، گھر کی چوکھٹ پر بیٹھنے، شادی کے موقع پر کالے رنگ کے کپڑے پہننے، رات کو بلیوں کی زیادہ آوازیں نکالنے اور حیض کے دنوں میں عورتوں کا پانی کو ہاتھ لگانے کو برا خیال کیا جاتا ہے-

16- بیماری ہو تو کسی بزرگ کے مزار پر حاضری، چادر چڑھانے یا دیگ وغیرہ پکانے کی منت کا رواج عام ہے-

17- نئے مکان کی چوکھٹ پر کالے رنگ کا کپڑا یا منڈیر پر کالی ہنڈیا رکھی جاتی ہے تاکہ اسے نظر بد سے بچایا جا سکے- اس طرح آج کل بعض لاریوں اور ٹرکوں کے آگے پرانا جوتا بھی لٹکایا جاتا ہے-

لوک ناچ:

مقبول اور زندگی سے بھرپور ناچ بھنگڑا، دلے دی بار کے گاؤں کے ہر آدمی کا صرف محبوب ناچ ہی نہیں بلکہ یہ اس کی زندہ دلی، خوش باشی، شگفتگی اور مردانگی کا بھی آئینہ دار ہے- رفتار اور قوت

کے اعتبار سے کوئی دوسرا ناچ بھنگڑا کو نہیں پہنچتا۔ بھنگڑا، سکت اور طاقت چاہتا ہے اور بار کے باسیوں کو اس ناچ میں خوب لطف آتا ہے۔ بھنگڑا ڈھول اور پر آہنگ تالیوں پر ناچا جاتا ہے اور بھنگڑا میں دھمن ہی اصل چیز ہے۔ ڈھول بجانے والا بیچ میں کھڑا ہو جاتا ہے اور ناچنے والے اس کے چاروں طرف حلقہ بنا کر کھڑے ہوتے ہیں۔ ڈھول کی چوٹ کے ساتھ ناچ شروع ہوتا ہے۔ شروع میں پیروں کی حرکت سست ہوتی ہے جیسے جیسے ڈھول کی چوٹ ہیجان انگیز ہوتی جاتی ہے ناچ کی رفتار میں بھی اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ جسم کی حرکتوں کے موڑ توڑ سے ناچ اور ڈھول ایک پر کیف نقطہ عروج پر پہنچ جاتے ہیں اور ناچنے والے اور ڈھول بجانے والا دونوں ہی ایک سرمستی کے عالم میں ہوتے ہیں۔ اس طرح کا بھنگڑا یہاں کی دیہاتی زندگی میں تہواروں اور خوشیوں کے موقع پر لازمی خاصا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ جھومر اور لڈی بھی علاقے کے مشہور ناچ ہیں۔ لڈی عام طور پر فتح کے جشن منانے کے لیے ناچا جاتا ہے۔ بھنگڑے کی طرز پر عورتیں گدا ڈالتی ہیں اور عموماً وہ اس کا مظاہرہ تہواروں، تقریبوں خصوصاً شادی وغیرہ کے موقعوں پر کرتی ہیں۔ گدا کے علاوہ سمی بھی بار کی عورتوں کا مقبول ناچ ہے۔ جس میں ناچنے والیاں ایک دائرے کی شکل میں کھڑی ہو کر اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر سینے تک لاتی ہیں اور تالی بجاتی ہیں اور پھر اپنے ایک مخصوص توازن کے ساتھ وہ اپنے ہاتھ نیچے تک لے جاتی ہیں اور پھر تالی بجاتی ہیں اور یہی کرتے ہوئے چکر کاٹتی جاتی ہیں۔ اس ناچ کا نام ایک نوجوان روایتی ہیروئن سمی کے نام پر ہے جو اپنے محبوب سے والہانہ محبت کرتی تھی اور اس کی خاطر اچھے سے اچھا ناچتی اور گاتی تھی۔

فنون :

بار کے بہت سے خاندان قرن ہا قرن سے عوامی آرٹ کی ترویج کے لیے وقف رہے ہیں۔ یہاں کے چھپہ گر ہوں، کمہار یا جولاہے اپنے اپنے طور پر عوامی فن کو پیش کرنے میں نمایاں رہے ہیں۔ کپڑے کی جدید صنعت کی وجہ سے چھپہ گروں کا فن گہنا چکا ہے ورنہ اب تک کپڑوں کو بیل بوٹوں سے سجانے کے لیے ڈیزائننگ ان کی کاریگری اور مہارت کی مرہون منت رہی ہے۔ البتہ یہاں کے جولاہے کھڈیوں پر چادروں اور کھیسوں کی بنائی کے ذریعے اس قدیم فن کو آج بھی زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ البتہ یہاں کی قدیم ثقافت اور معیشت کا ایک اہم ترین عنصر چرخہ تقریباً ناپید ہو چکا ہے۔ ایک وقت تھا جب ہر دوسرے گھر میں چرخہ ہوتا تھا اور عورتیں سوت کات کر اپنے مردوں کی کمائی میں ان کا ہاتھ بٹاتی تھیں۔ لیکن آج ان کی جگہ سوت کے کارخانوں اور جدید صنعتوں نے لے لی ہے۔ بار کے علاقے کا کمہار صدیوں کی طرح صرف مٹی کے برتن ہی نہیں بناتا بلکہ ان برتنوں پر

طرح طرح کے بیل بوٹوں کی نقاشی اور مصوری بھی کرتا ہے-اسی طرح یہاں بڑھئی دروازے اور چارپائیاں بناتے ہوئے لکڑی کو اس طرح تراشتا ہے کہ وہ بہت سے ڈیزائنوں سے بھی مرصع ہو جاتی ہے- سنار بھی لگ بھگ سو طرح کے زیور بناتے ہیں- یہاں کی عورتیں زیورات کی دلدادہ ہیں- دلے کی بار کے مرکز پنڈی بھٹیاں کے جوتے اور کاٹھی ساز اپنی فنکارانہ صلاحیتوں کی بناء پر بڑے مقبول رہے ہیں-ان کی بنائی ہوئی کاٹھیوں کا شہرہ دور دور تک پھیلا ہوا ہے- ساراج قوم کے افراد خاص طور پر اس فن میں دسترس رکھتے ہیں- یہاں کی جنے آلی، پولو سپاٹ، رسالے، دی سپاٹ اور مورنی حنا قسم کی کاٹھیاں، شوقین مزاج لوگ پولو کے کھلاڑیوں اور فوج کے سواروں میں طویل مدت تک رائج رہی ہیں-اس فن میں دوست محمد ساراج، محمد حسین ساراج، غلام محمد ساراج، نور محمد ساراج، راج محمد ساراج اور نذر محمد ساراج نے بڑا نام کمایا ہے- یہ کاٹھیاں مونجی اور گندم کے موسموں میں خوب فروخت ہوتی ہیں- خریداروں میں اب بھی اکثریت زمینداروں کی ہوتی ہے- البتہ اب یہاں کے کاریگروں کی تیار کردہ کاٹھیاں بیرون ملک بھی فروخت ہوتی ہیں- یہ تمام چیزیں دراصل سرچشمہ ہیں فن کارانہ تخلیق کے لیے ان کی فطری جستجو کا، یہاں کا عوامی آرٹ بنیادی طور پر ان گوناگوں روایات کا جلوہ صدرنگ ہے جو بیرونی حملوں اور مختلف نسلی خصوصیات کی دین رہیں-(۱۰۱)

بار کی ثقافت اور فنون میں پھلکاری کا کام بھی سحر انگیز ہے- عورتوں نے اس فن کو اپنے آرام کے قیمتی لمحات نذر کر کے فروغ دیا ہے-وہ ہمیشہ ہی رنگ کی بہت دلدادہ رہی ہیں اور انھوں نے اپنا بیشتر وقت بنائی اور کشیدہ کاری پر صرف کیا ہے- یہاں ہمیشہ یہ رواج رہا ہے کہ ماں باپ اپنی بیٹی کے جہیز میں ہاتھ سے کڑھے ہوئے کپڑے دیتے تھے- یہ رواج اب رفتہ رفتہ ختم ہوتا جارہا ہے-لیکن آج بھی کئی عورتیں ایسی ہیں کہ جب بھی گھریلو ذمہ داریوں سے فرصت ملے اور گرمی کی دوپہر میں یا جاڑے کے رات کے اولین حصے میں ذرا سا بھی سکون کا سانس لینے کا موقع ملتا ہے تو ان کی ماہر انگلیاں گھر کے بنے ہوئے موٹے کپڑے پر مہارت کے ساتھ چلنے لگتی ہیں اور طرح طرح کے نمونے نکلنے شروع ہو جاتے ہیں-جن میں رنگوں اور ڈیزائنوں کی ایک عجیب دنیا تخلیق ہوتی دکھائی دیتی ہے-

دلے کی بار کے علاقے کا ایک عوامی آرٹ وہ ہے جو صدیوں کا سفر کر کے اب زوال پذیر ہے- یہ آرٹ ہے گاؤں میں کچی مٹی سے بنے گھروں پر نقش و نگار بنانے کا- قیام پاکستان سے قبل ہندو عورتیں کچے گھروں کی دیواروں پر ہندو دیوتاؤں کی تصویریں بناتی تھیں-اس کے علاوہ حقوں پر پلاسٹک کی تار سے ڈیزائننگ اور گدھوں خچروں پر ڈالی جانے والی جھلوں (گدیوں) کی خوبصورت بنائی بھی یہاں کی علاقائی ثقافت کی آئینہ دار ہیں-

☆☆☆

تفریح

نقل :

تفریح کی یہ شکل شہریوں کے نقطہ نظر سے سستے اور نچلے درجے کی چیز ہے تاہم پھر بھی بار کے علاقے میں نقل بہت مقبول ہے۔ جہاں تک یہ زندگی کے حقائق کو طنز آمیز انداز میں پیش کرتی ہے اس کے دلچسپ ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ جن لوگوں نے اس فن میں کمال پیدا کیا ہے وہ عام طور پر میراثی، نقال یا بھانڈ ہیں۔ یہ لوگ خوشیوں کے موقع پر مختلف لوک قصے کہانیاں سنانے کے علاوہ اپنے آپ کو مذاقیہ کرداروں میں پیش کرتے ہیں۔ ان میں برجستہ مذاق کی صلاحیت ہوتی ہے اور ان کا فن نسل در نسل سے چلا آرہا ہے۔

مداری وبازی گر :

بار کے علاقے میں تفریح فراہم کرنے والے مداری، بازی گر اور سپیرے بھی ہوتے ہیں۔ مداری اکثر کسی ریچھ یا بندر کو سدھار کر اپنے ساتھ لے کر نکلتا ہے اور مختلف کرتب دکھاتا ہے۔ اسی طرح بازی گر بھی کرتب دکھا کر لوگوں کو تفریح فراہم کرتا ہے اور سپیرے اپنی ٹوکریوں میں سانپ رکھتے ہیں اور اپنی بین پر مست کن دھنیں بجا بجا کر ان سانپوں کو رقص کراتے ہیں۔

لوک کھیل :

بار کے علاقے کے نوجوان کبڈی اور کشتی کے رسیا ہیں تو بچے گلی ڈنڈا، کوکلا چھپاکی، کھدو، لکن میٹی، اندر مندر، شناپو، باندر کلا، پٹھو گرم، ٹلا اور چور سپاہی وغیرہ کھیلتے نظر آتے ہیں۔ اب کرکٹ، ہاکی جیسے جدید کھیل بھی ان میں رواج پا چکے ہیں۔ لڑکیاں کِکلی کھیلتی ہوئی گیت گاتی ہیں۔

کِکلی کلیر دی پگ میرے ویر دی، دوپٹہ میرے بھائی دا، فٹے منہ جوائی دا، سوہنا مکھ بھر جائی دا۔ بوڑھے لوگ اپنے آپ کو چوپڑ اور تاش میں منہمک رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ گھڑ دوڑ، مرغوں کی لڑائی، تیتروں کی آوازیں نکلوانے کے مقابلوں میں بھی یہاں لوگ خاصی دلچسپی رکھتے ہیں۔ ایک زمانے میں یہاں خرگوش کے شکار کا باقاعدہ میلہ لگتا تھا۔ لیکن اب یہ شوق اور کھیل کسی حد تک ختم ہو کر رہ گیا ہے۔ شکاری کتوں کی جگہ اب بندوقوں کے تیز رفتار کارتوسوں نے لے لی ہے۔

☆☆☆

میلہ سخی سرور

دلے کی بار کے زندہ دل اور خوش مزاج لوگ میلوں اور تہواروں کے انتہائی شوقین ہیں- علاقے میں ہر دوسرے تیسرے مہینے کوئی نہ کوئی میلہ یا تہوار ہوتا رہتا ہے- اکثر میلے کسی نہ کسی درویش یا پیر کی یاد میں لگتے ہیں اور گاؤں میں رہنے والے سبھی فرقوں کے لوگ ان میلوں میں شرکت کرتے ہیں- البتہ ان کا یہ شوق ماہ پھاگن ۲۰، ۲۱ تاریخ کو پنڈی بھٹیاں میں ہر سال سخی سرور کے میلے پر عروج پر پہنچ جاتا ہے- یہ میلہ حضرت سخی سرور کی یاد میں لگتا ہے- جو آج سے تقریباً ۸۰۰ سال قبل اپنے تبلیغی سفر کے دوران یہاں آکر ٹھہرے تھے- اس زمانے میں پنڈی بھٹیاں کا قصبہ نیا نیا ہی بنا تھا- جس مقام پر حضرت سخی سرور آکر قیام پذیر ہوئے تھے وہ آج بھی جالا سخی سرور (میاں نوازش علی بھٹی کے مکان کے قریب) کے نام سے منسوب ہے- یہی دراصل پنڈی بھٹیاں کی آبادی کا نقطہ آغاز تھا- اس مقام پر ان کے معتقدین آج بھی چراغ جلا کر ان کی آمد کی یاد کو زندہ رکھے ہوئے ہیں-

حضرت سلطان سخی سرور جن کا اصل نام سید احمد تھا- مضافات ملتان میں ایک موضع کرسی کوٹ میں پیدا ہوئے اور لاہور میں مولوی محمد اسحاق لاہوری سے علوم ظاہری کی تکمیل کی- تصوف میں آپ نے اپنے والد کے علاوہ حضرت غوث اعظم اور شیخ شہاب الدین سہروردی سے بھی فیض حاصل کیا- اس کے بعد وزیر آباد کے پاس موضع سودھرہ میں اقامت اختیار کی اور یاد الٰہی اور ہدایت خلق میں مشغول ہوئے- آپ کو خدا نے قبولیت دی- خلقت کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ حصول مراد کے لیے آپ کے پاس آتے اور کوئی نامراد نہ جاتا- اس لیے آپ سلطان سخی سرور کے لقب سے مشہور ہیں- بعد میں آپ مقام دھونکل میں کئی سال رہے- اس کے بعد وطن کی محبت دامن گیر ہوئی اور ضلع ڈیرہ غازی خاں کے ایک گاؤں میں جسے اب شاہ کوٹ کہتے ہیں- واپس تشریف لے گئے- وہاں بھی آپ کو بڑا فروغ ہوا- حاکم ملتان نے اپنی بیٹی آپ سے بیاہ دی لیکن اس سے حاسدوں کی آتش حسد بھی تیز ہوئی- چنانچہ انہوں نے یکجا ہو کر آپ کو آپ کے بھائی، بیٹے اور اہلیہ محترمہ کو شہید کر دیا- یہ واقعہ ۱۱۸۱ء کا ہے- آپ کا مزار کوٹ سخی سرور میں ہے- مسلمانوں کے ساتھ ساتھ بڑی تعداد میں ہندو بھی آپ کے معتقد تھے- جن کو سلطانی کہا جاتا- آج بھی بھارتی پنجاب کے ضلع لدھیانہ میں حضرت سلطان کے ہندو معتقدین کی تعداد ہزاروں میں ہے- (۱۰۲)

حضرت سلطان سخی سرور کے معتقدین کی سب سے بڑی رسم سلطان سخی سرور کے مزار کی زیارت ہے جو ماہ فروری کے وسط میں شروع ہوتی ہے اور بھرائی ڈھونکل سے قافلہ لے کر ڈیرہ غازی خان کا رخ کرتے ہیں- پاکستان بننے سے قبل ان قافلوں میں ہندو بھی برابر کے شریک ہوتے تھے- اس قافلے کو سنگ کا نام دیا جاتا ہے اور یہ سنگ جہاں جہاں سے گزرتے ہیں وہاں وہاں میلہ لگتا جاتا ہے- ہر سال ۲۰ پھاگن کی شام یہ سنگ جب اپنی منزل کو طے کرتے ہوئے پنڈی بھٹیاں کی حدود میں داخل ہوتے ہیں تو یہاں کی مقامی ثقافت کا ایک دیدنی نظارہ سامنے آجاتا ہے- بچے، بوڑھے، جوان، عورتیں مل کر اس سنگ کا استقبال کرتے ہیں- پھر شہر کی ہر گلی محلے میں ڈھولک اور چمٹے کی دلکش آوازیں گونجنے لگتی ہیں اور سنگی بچوں کو لوریاں دیتے ہوئے نظر آتے ہیں- یہ سنگ یہاں ایک رات قیام کرنے کے بعد اگلی صبح اپنی اگلی منزل کے لیے چنیوٹ کی طرف رواں ہو جاتا ہے- لیکن اپنے پیچھے ایک بہت بڑے میلے کی شروعات چھوڑ جاتا ہے- پورے شہر کی دکانیں خوب سجائی جاتی ہیں- دیہاتی بہترین قسم کے نئے رنگین اور سجیلے کپڑے پہن کر ٹولیوں کی شکل میں نکلتے ہیں- ڈھول اور چمٹے والا ان کے ساتھ ہوتا ہے اور جگہ جگہ یہ دیہاتی علاقائی ناچ بھنگڑا کے ذریعے اپنی خوشیوں کا اظہار کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں- یہ منظر اتنا دلکش ہوتا ہے کہ دیکھنے والوں کے ہاتھ پاؤں بھی چمٹے اور ڈھول کی تھاپ پر خود بخود ناچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں-

اس موقع پر لاری اڈے کے ارد گرد ایک پر رونق بازار بھی لگتا ہے- جس میں کھانے پینے کی اشیاء کے علاوہ ہاتھ کی بنی ہوئی اشیاء کی بھی نمائش ہوتی ہے- جن میں کھلونے، کانچ کی چوڑیاں اور گھریلو استعمال کی ہر طرح کا سامان ہوتا ہے- لیکن سب سے زیادہ زور کھلونوں کی دکانوں پر ہی ہوتا ہے- ان کے علاوہ پنگوڑھے (جھولے) چڑیا گھر، تھیٹر، موت کے کنویں اور سرکس بھی لگتے ہیں- یہ لوگ اپنی کمائی کی خاطر ہیجڑوں کو بہترین میک اپ کرا کے پھٹوں پر خوب نچواتے ہیں- آج کل میلے کی اصل رونق یہی ہیجڑے بن کر رہ گئے ہیں- چند سال پہلے تک یہاں کی مقامی اور دور دراز کی طوائفیں بھی میلے میں ناچ کر اپنے جسموں کی نمائش کرتی تھیں- اب یہ کام پردے میں ہونے لگا ہے- بعض جگہوں پر شرطیں اور جوا بھی ہوتا ہے- گھڑ دوڑ، کشتی اور دیگر روایتی کھیل بھی اس موقع پر کھیلے جاتے ہیں- گویا پورے تین دن کا یہ میلہ سات صدیوں سے یہاں کی ثقافتی و تہذیبی زندگی کی خوب عکاسی کرتا چلا آرہا ہے-

بار کے لوک محاورے :

1- کچی سونے دی چچھی — نم زمین سونے کی ٹوکری ہے-

2- گھر دی ادھی باہر دی ساری	گھر کی آدھی پردیس سے اچھی
3- جو گجے سو وسدا نا ہیں-	جو گرجتے ہیں وہ برستے نہیں-
4- چڑیاں کھمب کھلارے واساں مینہ بہترے	چڑیوں نے اپنے پر کھول دیے ہیں اب خوب بارش ہو گی-
5- بھلی پھرے گنوار، جے اسو منگے مینہ لا	اسوج کے مہینے میں بارش کی دعا کرے وہ پگلی ہے-
۶- وسے چیتر، نہ گھر میوے نہ کھیتر-	چیت کی برسات نہ گھر میں اناج چھوڑے نہ کھیت میں-
۷- جیٹھ تتے ہاڑو سائے، اوس ملک دے کال کیوں نیڑھے جائے-	جہاں جیٹھ میں گرمی اور ہاڑ میں برسات ہو اس ملک میں کال کا بھلا کیا کام-
۸- واہی، بادشاہی-	کھیتی باڑی بادشاہی-
۹- کھیتی کھسم سیتی-	کھیتی وہ جو خود کرے-
۱۰- جس کھیتی وچ کھسم نہ جائے، او کھیتی کھسم نو کھائے-	جس کھیت پر مالک نہ جاوے وہ کھیت مالک کو کھا جائے-
۱۱- دب کے واہ تے رج کے کھا-	دبا کے کھیتی کر اور جم کے کھا-
۱۲- جنے کپڑے اونا پالا- جناں ٹبر اونا منہ کالا-	جتنے کپڑے پہنو اتنی ہی سردی لگے- جتنا بڑا کنبہ اتنی زیادہ رسوائی-
۱۳- دھی نی توں گل سن، نوہن نی تو کن دھر-	بیٹی سے پیار اور بہو سے بیر-
۱۴- زنانی دی مت کھری وچ-	عورت کی عقل پاؤں کے نیچے ہوتی ہے-
۱۵- رب ملائی جوڑی، اک انا تے اک کوڑھی-	رب نے ملائی جوڑی ایک اندھا ایک کوڑھی-
۱۶- جوں ساوے تاں کوئی نہ آوے- جو پکے تاں ملن سکے-	جب فصل کچی ہو تو کوئی نہ آوے جب پک جاوے تو ہر کوئی ملنے آتا-
۱۷- جٹ بھو تیریا، اللہ نگہبان-	جٹ کے غصے سے خدا بچائے-
۱۸- واہی جٹ دی، بازی نٹ دی-	کھیتی میں جاٹ اور بازی میں نٹ کا کیا مقابلہ-
۱۹- کھیتی جٹ نہ چھیڑیا، ہٹی وچ کراڑھ، بیڑی ملاح نہ چھیڑیا، متاں بھن سٹے بھاڑھ-	کھیتی پر جاٹ کو، دکان پر بنئے کو، کشتی پر ملاح کو، مت چھیڑو نہیں تو تمہارا سر پھوڑ دے گا-
۲۰- موچی دی گل کدے نہیں اوندی-	موچی کی کل کبھی نہیں آتی-

۲۱- کھووچ مجھ، پنڈوچ سود-	دریامیں مگر مچھ گاؤں میں بیاج-
۲۲- آندراں بھوکیاں، تے مچھ تے چاول-	منہ چکنا پیٹ خالی-
۲۳- ہتھاں وچ کڑے، ڈھڈ بھکھ نال سڑے-	ہاتھوں میں کڑے پیٹ بھوک بھوک کرے-
۲۴- ڈھڈ بھک نال مرے تے عشق ٹیں ٹیں کرے-	کمانے کو کچھ نہیں- سر پر عشق سوار ہو
۲۵- مچھی رہی دریا تے رن مرچاں کوٹے-	مچھلی ابھی دریامیں ہی ہے عورت مرچیں کوٹے-
۲۶- گھر دانے نہیں اماں پی ہن گئی-	جھولی میں نہیں دانے اماں چلیں پسانے-
۲۷- اگ لین آئی، تے گھر دی مالک بن بیٹھی-	آگ لینے آئی تھی گھر کی مالکن بن بیٹھی-
۲۸- ذات دی کوڑھ کرلی، شہتیراں نوجپھے-	اپنی حیثیت سے زیادہ ظاہر کرنا-
۲۹- اکھوں انی، ناں نور بھری-	آنکھوں سے اندھی نام نور بھری-
۳۰- انے اگے رونا، ڈورے اگے گل، گنگے ہتھ سنہیا، گھل بھاویں نہ گھل	اندھے کے آگے رونا، بہرے کے آگے بولنا، گونگے ہاتھ پیغام بھیجنا سب بے سود ہے-
۳۱- سارا جاندا ویکھے تے ادھا دیئے ونڈ-	سارا دھن جاتا دیکھئے تو آدھا بانٹ دیں-
۳۲- جس دند دیتے اوہ چنے وی دیسی-	جس نے دانت دیے وہ چنے بھی دے گا-
۳۳- گل پیا ڈھول وجانا ہی پیندا اے-	مصیبت آجائے تو اسے برداشت کرنا ہی پڑتا ہے-
۳۴- جو بیجو سو وڈو-	جو بوؤ گے وہ کاٹو گے-
۳۵- رسی سڑ گئی ول نہ گیا-	رسی جل گئی مگر بل نہیں گیا-
۳۶- دور دے ڈھول سہانے-	دور کے ڈھول سہانے-
۳۷- ڈھکی رجے کوئی بجے-	ڈھکی ہنڈیامیں کیا پکے کس کو پتہ چلے-
۳۸- اگ نال اگ نہیں بجدی-	آگ سے آگ نہیں بجھتی-
۳۹- پانہ پڑھی تے وختاں نوں پھڑی-	ابھی پوری طرح تاک نہ ہوئی تھی کہ ذمہ داریوں نے آلیا-
۴۰- جٹ جانے بجو جانے-	اپنی لگی خود بجھاتے رہیں گے ہمیں فکر کی کیا ضرورت
۴۱- کی سنڈے دا ووہنا، کی سانڈو دا ساک، کی شارک دا شوربا تے کی کمیاں دا ساتھ-	بھینے کا ہل جوتنا اور سالی کے خاوند کو رشتہ دار سمجھنا حماقت ہے اور اس طرح شارک کا شوربا اور کمیوں کا ساتھ بے فائدہ ہے-
۴۲- اکھڑ یت نہ جے، دھی انی چنگی-	نالائق بیٹے سے بہتر خدا لڑکی دے دے بے شک

	اندھی ہی ہو۔
۴۳-امدی نوں دوہادہاڑا، مریندی نوں تریہادہاڑا۔	آنے سے پہلے ہی ظلم شروع کر دیا۔
۴۴-کراڑ دندلی خوجہ ھاوڑا۔	ہندو لوگ کم منافع لیتے ہیں۔ شیخ خوجے گاہک کو لوٹ لیتے ہیں۔
۴۵-پانی پیئے پن کے تے پچ پائے چن کے۔	ہر کام سوچ سمجھ کر کرنا چاہیے۔
۴۶-گنا، مچھی تے ہندوانا، اسوں پکے تے کتیں کھانا۔	گنا مچھلی اور تربوز کتک ماہ میں کھانا چاہیے۔
۴۷-بدل چڑھیا ٹلیوں تے مجھ کھولن نئیں دیندا اکلیوں۔	اونچائی سے نچان کی طرف بادل بہت جلد آتا ہے۔
۴۸-راہ رہن تے گاہ گہن۔	جو کام ہو رہے ہیں وہ ہوتے رہیں گے۔
۴۹-سب گلاں تے بیٹھ ہلاں۔	کھیتی باڑی سے بڑھ کر کوئی کام منافع بخش نہیں۔
۵۰-اک کوڑی تے دوجا ستی اٹھی۔	ایک بد صورت اور دوسرا سوکے اٹھی۔

شعری ادب :

دلے دی بار کے شاعروں اور ادیبوں کے شعری شہ پارے بہت زیادہ قدر و قیمت کے حامل ہیں او کوئی بھی تذکرہ ان کی شعری و ادبی کاوشوں کا ذکر کئے بغیر مکمل اور جامع نہیں کہلا سکتا ہے۔اس خطے کی ادبی تاریخ میں ان شعراء کے اسمائے گرامی اور ان کے شہ پارے ہمیشہ جگمگاتے رہیں گے۔ان شعراء میں کئی نام ایسے ہیں جو تاریخ سے او جھل ہو چکے ہیں۔لیکن اپنے وقتوں کے وہ بہترین ادیب اور دانشور تھے اور ان کے شہ پارے ان کے ناموں کے ساتھ زندہ و جاوید رہیں گے۔ان قدیم ناموں میں حکیم میاں عمر الدین (پنڈی بھٹیاں) حکیم جوالا سہائے، محمد حسین (جلالپور) اور حکیم غلام حسن (چک بھٹی) شام ہیں۔یہ سب انیسویں صدی کے وسطی دور کے فارسی اور پنجابی کے شاعر تھے۔ان کے بعد ۱۹۰۰ء کے لگ بھگ سندر داس، چندر رام اور حکیم مولوی محمد دین نے پنجابی زبان کی شاعری میں بڑا نام کمایا۔ان میں سندر داس کیسری کا انداز کچھ یوں تھا۔

اوہ اپنے آپ وچ آپ ہا
اوتھے غیر ناں کوئی سماوندا سی

شیشے نور وچوں سندر داس جیاں
عکس اپنے نوں جھاتی پاوندا سی

جبکہ چندر رام نے مسلمان ہو کر صوفیانہ انداز کی شاعری کو اپنایا

وساکھ نہ وسرے اک پل میتھوں
حیدر پیر کرارا سخی دلارا
جو در آیا کدی نہ مڑیا
اوہ رتی نال لاندا لارا

مولوی محمد دین نے مرزا صاحباں کے علاوہ قرآن کی سورۃ مزمل کی پنجابی زبان میں منظوم تفسیر بھی لکھی اور اسے نور مکمل کے نام دیا۔ اس ایمان افروز تفسیر کے چند اشعار یہ ہیں۔

اوہ نبی محمد ﷺ بن عبداللہ رب دا دوست پیارا
جس دی خاطر دو جگ سندا کینا رب پسارا
جس نوں شفاعت والا آپ خدا پہنایا
تے قاب قوسین او ادنی والا جس نوں قرب وکھایا
تے جس دے نال کیتا رب وعدہ راضی کرساں تینوں
روز قیامت دیساں تینوں جو کچھ کہیں مینوں

اسی نمونے کی شاعری کی جھلک حکیم قاضی محمد عالم نظامی (۱۸۸۷ء-۱۹۸۰ء) جلالپور کے کلام میں بھی نظر آتی ہے۔

چین آرام خوشی سکھ ہن کھیڈن موج بہاراں
جنہوں لایا تے گئیاں سبھے لییاں یار نہ ساراں
عشق فراق تے سوز جدائی آہین الفت زاری
انہاں ستاں درداں قاضی کر چھڈیا آزاری

قیام پاکستان سے قبل پنڈی بھٹیاں کے چند ایسے ہندو شعرا کے نام بھی ملتے ہیں جو اردو اور پنجابی زبان میں انقلابی خیالات سے لبریز شاعری کرتے تھے۔ ان میں میلا رام (کوٹ نکہ) برکت رام مہاشہ، ہر کشن لال سچدیو اور جیون پرکاش جیون کے نام نمایاں ہیں۔ جیون پرکاش جیون آج بھی دہلی بھارت میں اپنے شعری شہ پاروں کی تخلیق میں مصروف کار ہیں۔ ان کے کلام کا ایک نمونہ جو انہوں نے مصنف کو خاص طور پر دہلی سے ارسال کیا تھا وہ یہ ہے۔

جستجوئے یار

بن گیا جو آپ اپنا ہم نشیں
اس کے زیر پا ہے فردوس بریں
عالم بالا سے بھی بالا ہے وہ
شورش عالم میں گوشہ نشیں
گل بدن، غنچہ دہن، شیریں کلام
تجھ سا دیکھا ہی نہیں میں نے کہیں
اس پر طاری غیر فانی محویت
پس پردہ دیکھ لو پردہ نشیں
جستجوئے یار جیون ختم اب
وہ ہے مجھ میں اور میں اس میں مکیں

قیام پاکستان کے بعد شعر و ادب کا یہ سفر رکا نہیں بلکہ مقامی طور پر ذکی سرور کوٹی، محمد اصغر منشا، قاضی عبدالرشید ارشد، حیرت جلالپوری، حکیم غلام رسول (موضع ساکھی) حکیم دوست محمد عاصی اور خلیفہ سراج الدین (جلالپور) جیسے شعراء یہاں کی شعر و ادب کی محفلوں کو رونق بخشتے رہے۔ان شعراء میں اصغر منشا کی محرومیوں کا اظہار ان کے اپنے کلام میں یوں ہوتا ہے۔

شب کیسے کٹی درد کے ماروں سے پوچھئے
کیسے ہوئی سحر یہ ستاروں سے پوچھئے
جنوں چیز کیا ہے ذوق محبت ہے کیا بلا
یہ میرے گریباں کے تاروں سے پوچھئے
دیکھا ہے شب غم میں ستاروں نے میرا حال
میرے غم کی داستان ستاروں سے پوچھئے
کیوں زندگی سے پیار ہے انسان کو اس قدر
یہ راز زندگی کی بہاروں سے پوچھئے
کیا لطف مے ہے حضرت واعظ کو کیا خبر
یا پی کے دیکھئے یا مے خواروں سے پوچھئے

ابو سعید حیرت جلالپوری کی شاعری میں مقصدیت نظر آتی ہے۔

جہالت کے مقابل ہم صف آرائی اگر کر لیں
عجب کیا ہے نظام دہر کو زیر و زبر کر لیں
حکیم دوست محمد عاصی کی رزمیہ شاعری کا نمونہ یہ ہے۔

چھوڑی کسر نہ صدقہ و خیرات میں کوئی
اب کوستا ہوں ہر دعائے بے اثر کو میں
مجبور ہوں اے جان من قید حیات سے
آتا وگرنہ ایک دن تیری خبر کو میں

موجودہ دور کے مقامی شعراء میں باؤ غضنفر احمد، محمد بشیر دیوانہ، محمد صفدر ساقی، شیخ محمد وحید اور رفیق شاکر کے نام نمایاں ہیں۔باؤ غضنفر کا تعلق ظفر وال سے ہے لیکن ان کا زیادہ تر عرصہ پنڈی بھٹیاں میں گزرا اور بیس پچیس سال تک یہاں کی ادبی و شعری محفلوں کے روح رواں رہے۔وہ معروف شاعر صابر ظفر کے بھائی ہیں اور ان کے کلام میں جدت، جذبہ اور قدرتی حسن کی عکاسی نمایاں ہے۔

محمد بشیر دیوانہ معلّمی کے پیشے سے وابستہ ہیں اور بیک وقت اردو اور پنجابی زبان میں شعر کہتے ہیں۔ان کے کلام میں معاشرتی محرومیوں کا جس کمال انداز سے اظہار ہوتا ہے وہ بلاشبہ مزاحمتی ادب کے نمائندے کہلانے کے حقدار ہیں۔ان کے پنجابی کلام کا نمونہ یہ ہے۔

ویلے میرے دیس دے

میرے سب وڈیاں دے ویلے
میتھوں کھوہ لئے اج دے ویلے
ناں اوہ رہیاں نوریاں مجھیں
ناں اوہ ریہہ گئے داند مریلے
کتھے دن دا سگھنا ہوٹا
کتھے اج کری دے ڈیلے
ہولی ہولی مکدے جاندے
میرے سارے جنگل بیلے

ناں کوڈی ناں نیزہ بازی
کوجھے کوجھے ہو گئے میلے
ناں کھوہے دی گادھی اتے
ڈھولے آکھن چھیل چھبیلے
سبزی وچوں کوڑاں مکیاں
مٹھے ہو گئے اج کریلے
آنہ، ٹکہ دوانی ٹر گئی
ناں پیسے ناں رہہ گئے دھیلے
اپنی اپنی ماری جاون
ناں گرو ناں رہہ گئے چیلے
نویں تہذیب نیں کھوہ لئے میتھوں
میرے دیس دے چنگے ویلے

صفدر ساقی علمی و ادبی گھرانے کے چشم و چراغ ہیں اور اپنے بزرگوں کے ادبی ورثے کو سنبھالے ہوئے شعری صنف میں منفرد مقام رکھتے ہیں۔ان کی شاعری کا انداز کچھ یوں۔

دل سے اٹھتا یہ دھواں سا نہیں دیکھا جاتا
مجھ سے خود اپنا تماشا نہیں دیکھا جاتا
بانٹ دوں بس میں اگر ہو تو میں خوشیاں اپنی
مجھ سے ہر شخص سلگتا نہیں دیکھا جاتا
نہ سہی مجھ سے وہ پہلے سے مراسم لیکن
یوں تیرا حد سے گزرنا نہیں دیکھا جاتا
میں تجھے دل میں بلا لوں گا سر راہ خیال
گھر یہ جلتا ہوا تنہا نہیں دیکھا جاتا
اس سے بہتر تھی شب غم کی سیاہی ساقی
یہ لہو رنگ سویرا نہیں دیکھا جاتا

وحید شیخ کسی ستائش کی تمنا یا صلے کی پرواہ کئے بغیر، گمنامی میں ایسا فن تخلیق کرنے میں مصروف ہیں جس کے متعلق مشہور ادیب و دانشور احمد ندیم قاسمی نے کہا تھا کہ وحید کا کلام ان کی عمر کے بعض معروف شاعروں کے کلام سے بلند ہے اور ان کی ہر غزل میں ایسا ایک نہ ایک شعر ضرور

وارد ہوا جو چونکا دیتا ہے اور جو جذبہ واحساس کے اظہار کے آفاق کو مزید پھیلا دیتا ہے۔

میں نے کیا جو غور تو قصہ عجیب تھا
جو بھی میرے قریب تھا میرا رقیب تھا
میں دشمنوں کی چال سے ہارا ہوں کب وحید
جس نے مجھے شکست دی میرا حبیب تھا

شکار:

دلے کی بار کا مرکزی علاقہ دریائے چناب کے قریب واقع ہے اور اس کے ارد گرد سیم نالے اور نہریں بھی رواں ہیں۔ پھر پانی کی سطح اونچی ہونے کے سبب علاقے کی زمین سیم زدہ ہے۔ اس لیے علاقہ آبی پرندوں کے شکار کے لیے پرکشش رہا ہے۔ ماضی میں پنڈی بھٹیاں کے نواحی علاقے ٹھٹھہ رائے کا، دولووالہ، قلع مراد بخش اور ناہوراڑہ شکاریوں کے لیے بڑی پرکشش شکار گاہیں رہی ہیں۔ یہاں عموماً تین قسم کے آبی پرندوں کا شکار ہوتا ہے۔ ایک قسم کے پرندے وہ ہیں جو مقامی علاقے کے باسی ہیں اور یہیں ان کا بسیرا ہوتا ہے۔ ان میں تیتر، بٹیر، کبوتر، فاختہ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ دوسری قسم ان پرندوں کی ہی جو دوسرے علاقوں سے ہجرت کر کے مخصوص موسم میں یہاں آتے ہیں اور شکاریوں کی "قاتل نگاہوں" کا نشانہ بنتے ہیں۔ ایک قسم کے پرندے "ہمالین برڈ" کہلاتے ہیں جو سردیوں کے آغاز یعنی اکتوبر کے شروع میں اس علاقے کی طرف آنا شروع ہو جاتے ہیں۔ یہ کوہ ہمالیہ کی طرف سے ادھر کا رخ کرتے ہیں اور مارچ اپریل میں واپسی کا سفر شروع کر دیتے ہیں۔ ہجرت کرنے والے دوسرے پرندے "سائبیرین برڈ" کہلاتے ہیں جو سائبیریا کے سرد ترین علاقوں سے جب کہ وہاں کے آبی وسائل برف کی چادر اوڑھ کر چھپ جاتے ہیں تو یہ پرندے پھر ادھر کا رخ اختیار کر لیتے ہیں۔ ان پرندوں میں مرغابی نمایاں ہوتی ہے۔ سائبیریا سے آنے والے پرندے دسمبر میں یہاں آنا شروع کرتے ہیں اور فروری میں واپس لوٹنا شروع کر دیتے ہیں۔ اس عرصے میں بار کا علاقہ مرغابی کے شکار کے لیے بڑا سازگار ہوتا ہے۔ ہمالین برڈ میں شاولر، چائنہ ٹین مشہور پرندے ہیں جبکہ رشین سنپ، سرخاب، پن ٹیل، پوچرڈ، ریڈ ہیڈ مرغابی پنڈی بھٹیاں اور اس کے ارد گرد علاقے ہیں مخصوص موسم میں زیادہ پائی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ کونج، ہریل، کالا تیتر، تین رنگی تلیئر کا شکار بھی ہوتا ہے۔ یہاں کے شکاری مارچ کے بعد مرغابی اور دیگر آبی پرندوں کا شکار عموماً نہیں کرتے کیونکہ یہ پرندوں کی افزائش کے دن ہوتے ہیں اور ان کے پیٹ میں انڈے موجود ہوتے ہیں۔ ان پرندوں کا کراس یہاں ہوتا ہے مگر وہ بچوں کی پیدائش اپنے علاقے میں جا کر کرتے

ہیں-یہاں ایک شکاری نے کچھ برس قبل ایسی چڑیا کو پکڑا تھا جو ماسکو (روس) ہسٹاریکل سوسائٹی نے ماسکو سے چھوڑی تھی-آبی پرندوں کے علاوہ یہاں خرگوش کا شکار بھی عام رہا ہے-کبھی یہاں اس کے شکار کا ہر سال بڑا میلہ لگتا تھا جس میں ملک بھر کے نامور شکاری اپنے پالتو شکاری کتے لاتے اور ان کے ذریعے خرگوش کا شکار کرتے-یہ میلہ تین دن تک جاری رہتا تھا-

مجموعی طور پر بار کے علاقے میں آبی پرندوں کی آمد میں کمی واقع ہوتی جا رہی ہے اس کی وجہ آلودگی، درختوں کی کمی، آبادی میں اضافہ، جوہڑوں کی کمی اور فصلوں پر زہریلی زرعی ادویات کا چھڑکاؤ ہے-خاص طور پر زرعی ادویات کے استعمال کے باعث ان آبی جانوروں کی تعداد میں بڑی حد تک کمی واقع ہوئی ہے-(۱۰۳)

جرائم :

دلے کی بار کے علاقے میں عرصہ قدیم سے رسہ گیری یا مویشی چوری جرائم پیشہ لوگوں کا محبوب مشغلہ رہا ہے-ماضی قدیم میں بار کے بہت سارے قبائل کی آمدنی کا صرف یہی ایک ذریعہ ہوتا تھا-اسی لیے کہاوت مشہور تھی

بچہ چوری نہ کرسو----تے بھکھ نال مرسو

ماضی میں یہ روایت بھی تھی کہ جب تک کوئی جوان ہو کر مویشی چوری نہ کر لیتا اس وقت تک اس کے سر پر پگڑی نہ باندھی جاتی تھی-جو جتنا بڑا مویشی چور ہوتا اتنا بڑا معتبر ہوتا-اس لیے اسے راٹھ کا معتبر لقب بھی دیا جاتا-ایک انگریز مصنف کی رائے کے مطابق بار کے علاقے کے تقریباً تمام ذیلدار رسہ گیر تھے-جو جتنا بڑا رسہ گیر ہوتا اتنا ہی اس کا اثر و رسوخ زیادہ ہوتا-ایک رسہ گیر کا کام یہ ہوتا ہے کہ مویشی چوروں سے جانور لے کر محفوظ طریقے سے اپنے ہی طرح کے کسی دوسرے رسہ گیر کے ہاں فروخت کر دیتا اور اس کے بدلے وہ نقد رقم یا اس طرح کا متبادل جانور حاصل کرتا ہے-پنڈی بھٹیاں اور اس کے گردونواح کے علاقے میں آج بھی سب سے معروف جرم مویشی چوری ہے-اس کام میں دریائے چناب کے بیلوں میں اور اردگرد مقیم گلوترا اور سرگانہ قوم کے افراد بڑے ماہر ہیں-ایسے لوگوں کی پشت پناہی میں بھٹی قوم کے بعض افراد بھی پیش پیش رہے ہیں-یہ لوگ مسروقہ جانوروں کو دریائے چناب کے دوسرے کنارے آباد پھالیہ کے بوسالوں اور دیگر ہم پیشہ افراد کے ہاں ارسال کرتے رہے ہیں اس پیشہ کے لوگ بڑے شاطر اور نڈر ہوتے ہیں اس لیے ان کے متعلق کہا جاتا ہے-

مجھی سنڈے پنگرے جمدے ترنڈ، اور بچہ دریاوڑیا ایں تے پھڑکن دا کی ڈرہائی

اس کے باوجود ایک مویشی چور کی زندگی کے بارے میں خیر خواہی موجود نہیں ہوتی-اسی لیے کہا جاتا ہے کہ (۱) چور نہ کفن نہ گور (۲) چور دی مال نہ دھپ نہ چھاں-

مسروقہ مال کی تلاش میں کھوجی کا کردار بھی صدیوں سے اہم رہا ہے- آج بھی اس کی خدمات کے بغیر چوری شدہ جانور کو بر آمد کرنا تقریباً ناممکن ہوتا ہے- کھوجی جانور اور چور کے پاؤں کے نشانات کی نشاندہی کر کے ان کے پیچھے پیچھے چلتا ہے-اس طرح اس کا سراغ لگانے کی کوشش کی جاتی ہے-اگر یہ نشانات دریا کے کنارے پہنچ کر غائب ہو جائیں تو بس یہ سمجھا جاتا ہے کہ جانور دریا پار لگا دیا گیا ہے اور اس کے ملنے کے امکانات تقریباً ختم ہو جاتے ہیں-بار کے علاقوں میں مویشی چوری کے علاوہ عورتوں کو ان کی مرضی یا مرضی کے بغیر بھگا کر لے جانا، منشیات، ڈاکہ زنی، لڑائی جھگڑے جیسے جرائم بھی ہوتے ہیں-یہ لڑائی جھگڑے عموماً فصلوں کی کٹائی کے موقع پر ہوتے ہیں- جبکہ سردیوں میں ڈاکہ زنی اور گرمیوں میں چوری کی وارداتیں زیادہ ہوتی ہیں-لیکن مویشی چوری کے مقابلے میں ان جرائم کی شرح بہت کم ہے یہی وجہ ہے کہ بار کا غریب کسان آج بھی صبح کو اگر کھیتوں میں محنت کرتا ہے تو راتوں کو جاگ کر جانوروں کا پہرہ دیتا ہے-(۱۰۴)

محرم :

دلے دی بار کے مرکزی علاقوں میں شیعت کا آغاز عرصہ دراز سے جاری ہے لیکن تقریباً تین صدیاں قبل کشمیر سے اٹھ کر پنڈی بھٹیاں میں آباد ہونے والی سراج قوم کے افراد نے اس کو منظم کیا اور محرم کی باقاعدہ رسومات شروع ہوئیں- مخلوط معاشرہ ہونے کی وجہ سے قیام پاکستان سے پہلے تک تمام فرقوں میں اتحاد و یگانگت کا جذبہ موجود تھا اور رواداری بھی مثالی تھی-اس لیے دیگر فرقوں کے مسلمان بھی شیعہ مسلمانوں کے ساتھ مل کر اہل بیت کی شہادت کے ایام منایا کرتے تھے-چنانچہ یہاں کی تمام معروف قوموں کی طرف سے بلا تمیز شیعہ و سنی اپنے اپنے الگ تعزیے کے جلوس نکال کر عقیدت کا اظہار کرتے-البتہ قیام پاکستان کے بعد عقیدت کے اظہار کا یہ طریقہ بدلتا گیا اور اس طرح کی رسومات عملی طور پر شیعہ مسلمانوں کی حد تک محدود ہو کر رہ گئیں- پنڈی بھٹیاں میں محرم کی رسومات میں علم نکالے جانے کی تاریخ قدیم ہے-لیکن تعزیہ کی رسم ڈیڑھ دو سو سال پرانی ہے-ابتداء میں کاغذ گتوں سے ہر سال عارضی تعزیہ بنا کر جلوس ہوتا-بعد میں بھٹی قبیلہ کے پہلے فرد معظم خاں بھٹی نے ایک تحصیلدار کے ہاتھوں شیعہ مسلک اختیار کیا تو یہاں شیعت کو بھی تقویت ملتی چلی گئی اور تعزیہ کی ساخت میں بھی تبدیلی واقع ہو گئی- چنانچہ مختلف مراحل کے بعد موجود تعزیہ چنیوٹ کے کاریگروں سے لکڑی کا بنوایا گیا جو ان کے بہترین فن کا ایک نمونہ بھی ہے-

اس سے قبل کا تعزیہ ٹھٹھیاں والوں کو دے دیا گیا- موجودہ تعزیہ چوک سراجاں سے بر آمد ہوتا ہے-اس کی ۵ منزلیں اور اونچائی ۳۵ فٹ ہے- ۸ فٹ چوڑائی چوکھٹا کی ہے- دوسرا تعزیہ محلہ مروان شاہ سے ذیلدار بھٹیوں کی سرپرستی میں بر آمد ہوتا ہے- یہاں محرم کی رسومات کا آغاز ہر سال یکم محرم سے مجالس سے ہو جاتا ہے-اس دن سے تقریباً تمام شیعہ اپنی چارپائیاں الٹی کر دیتے ہیں اور مٹی کے برتنوں میں نذر نیاز تقسیم کرنا شروع ہو جاتی ہے- ۶ محرم کو چوک سراجاں سے علم کا جلوس بر آمد ہوتا ہے جو آل عمران چوک مروان شاہ پہنچ کر اختتام کو پہنچ جاتا ہے-اگلے روز یعنی ۷ محرم کو قصر آل عمران مروان شاہ سے چوک سراجاں تک علم کا جلوس ہوتا ہے-اسی روز حضرت علی اصغر کی یاد میں محلہ قتل گڑھاتر کھانوں کے گھر سے جھولے کا جلوس بھی نکالا جاتا ہے جس میں زیادہ تر بچے اور خواتین شریک ہوتے ہیں- ۸ محرم کی رات تیج کا جلوس چوک سراجاں سے عاقل والا بازار تک ہوتا ہے- ۹ محرم کو گھڑولی کا جلوس چوک مروان سے نکالا جاتا ہے-اس جگہ کنویں سے گھڑوں میں پانی بھرا جاتا ہے اور عزادار نوحے پڑھتے ہیں- یہ رسم حضرت قاسم کی شادی کے منظر کی نسبت سے ہوتی ہے- محرم کی رسوم کی انتہا دسویں محرم کو تعزیے کے جلوسوں کی صورت میں ہوتی ہے-

اس روز نماز فجر کے فوراً بعد قصر آل عمران محلہ مروان شاہ سے گھڑولی بھری جاتی ہے اور عزادار نوحے پڑھتے ہیں- جبکہ چوک سراجاں سے تعزیہ گیارہ بجے دن اور مروان شاہ سے تعزیہ دوپہر کو اڑھائی بجے اٹھایا جاتا ہے-چوک سراجاں سے تعزیہ گیارہ بجے دن اور مروان شاہ سے تعزیہ دوپہر کو اڑھائی بجے اٹھایا جاتا ہے- سراجاں کے تعزیہ اور ذوالجناح کا جلوس مین بازار سے اور مروان شاہ کا تعزیہ حافظ آباد روڈ سے ہوتا ہوا گول چوک لاری اڈے پر آکر مل جاتے ہیں اور شام کے وقت اختتام پذیر ہو جاتے ہیں-اس دوران عزادار مختلف مقامات پر زنجیر زنی کا مظاہرہ کرتے ہیں- کئی عقیدت مند جن میں سنی حضرات بھی شامل ہوتے ہیں عزاداروں کے لیے سبیلیں بھی لگاتے ہیں-اگلے روز یعنی گیارہویں محرم والے دن چوک سراجاں کے شیعہ افراد قل اور افسوس کرنے کی رسم کے طور پر قصر آل عمران کے شیعوں کے ہاں آتے ہیں-ان کے آگے آگے ایک آدمی ڈھول بھی بجاتا ہے- جواباً مروان شاہ کے شیعہ چوک سراجاں جاتے ہیں-ان تمام رسومات کے دوران یہاں کے تمام مسلک کے مسلمانوں کے مابین مجموعی طور پر اتحاد و یگانگت کا مظاہر کیا جاتا ہے-(۱۰۵)

☆☆☆

لوک داستانیں

دلا بھٹی اور سندر مندر یے :

مغل بادشاہ اکبر حافظ آباد اور جنڈیالہ شیر خاں کے درمیانی علاقے میں اکثر شکار کے لیے آتا تھا۔اس معمول میں ایک مرتبہ وہ شکار کے لیے آیا تو اس کی نظر ایک پندرہ سالہ خوبصورت ہندو لڑکی پر پڑی۔اکبر اس پر فریفتہ ہو گیا اور لڑکی کے باپ مول چند عرف مولہ سے اس کا رشتہ مانگا۔مول چند اپنی لڑکی کو اکبر کے عقد میں دینے کے لیے کسی طرح بھی راضی نہ تھا۔مگر بادشاہ کے رعب و دبدبہ اور اس کے اقتدار کی طاقت سے خوفزدہ تھا۔چنانچہ اس نے یہ بہانہ کیا کہ وہ اپنی برادری سے پوچھ کر اس کا جواب دے گا۔اسی رات مول چند عرف مولہ اپنی لڑکی کو گھوڑے پر سوار کر کے پنڈی بھٹیاں کی طرف نکل آیا اور یہاں آکر دلا بھٹی کو سارا قصہ سنایا اور اس سے پناہ لے لی۔دلا بھٹی پہلے ہی اکبر بادشاہ کے خلاف برسرپیکار تھا۔اس نے اسی وقت پنڈی بھٹیاں کے نواحی گاؤں باغ کنہ میں اپنے ایک ہندو دوست سندر داس کو اس کے بیٹے کے لیے شادی کا پیغام بھیج دیا۔سندر داس نے مول چند کی لڑکی کا رشتہ اپنے بیٹے کے لیے قبول کر لیا۔جب اس کی اطلاع اکبر کو پہنچی تو وہ بڑا سیخ پا ہو گیا اور حافظ نامی جرنیل کو دلا بھٹی کی گرفتاری کا حکم دیا۔لیکن دوسری طرف دلا بھٹی نے ہندو لڑکی کو اس کے ہم مذہب کے عقد میں دے دیا۔دلے دی بار کی ثقافتی تاریخ میں یہ دن رقم ہو گیا اور ہر برس اس موسم میں ہندو دلا بھٹی کی جوانمردی، بہادری اور ہندو لڑکی کی عزت بچانے پر اسے خراج عقیدت پیش کرتے اور گیت گانے لگے۔یہ گیت آج بھی لوہڑی کے گیت کے طور پر مشہور ہے۔

سندر مندر یے کی لوک کہانی کو ایک ہندو شاعر جیون پرکاش جیون نے کسی اور انداز سے روایت کیا ہے۔جیون کے مطابق پنڈی بھٹیاں سے کچھ دور موضع کوٹ نکہ میں ایک ہندو پریوار تھا جو دکان کا کام کرتا تھا اور وہ ہی اکیلا سارے گاؤں کو ضروری اشیاء فراہم کرتا تھا۔اس گاؤں کا جو نمبر دار تھا وہ بڑا نفس پرست تھا۔وہاں اس کا بڑا دبدبہ تھا وہ جس کی چاہتا عزت لوٹ لیتا۔سب گاؤں والے اس سے ڈرتے تھے۔کوئی اس کے سامنے بولنے کی جرات نہیں کر سکتا تھا۔ڈر کے مارے سب تھر تھر کانپتے تھے۔اس نمبردار نے ہندو دکاندار کو بلا کر کہا کہ وہ اپنی لڑکی کی شادی اس کے ساتھ کر دے اور اگر انکار کرے گا تو میں زبردستی اس سے نکاح کر لوں گا۔ہندو اپنی بیٹی کی شادی ایک مسلمان زمیندار سے نہیں کر سکتا تھا۔چنانچہ اس نے سوچ کر جواب دیا کہ آپ جیسے کہتے ہو ویسا ہی کروں گا

مگر ایک بار مجھے اپنے رشتے داروں سے صلاح مشورہ کر لینے دیں- وہ تھا عقلمند- اس نے من میں سوچ لیا تھا کہ کس طرح اس سے چھٹکارا حاصل کیا جائے- نمبر دار مان گیا اور کہا کہ کچھ دنوں میں اس کا فیصلہ ہو جانا چاہیے- نہیں تو مجھ سے برا کوئی نہ ہو گا اور تم کو اپنے کیے کی سزا خود بھگتنی ہو گی- اس نے بڑی عاجزی سے اقرار کر دیا اور اپنے رشتہ داروں سے ملنے کے بہانے وہ سیدھا دلا بھٹی کے پاس چلا گیا- اسے پہلے ہی علم تھا کہ دلا بھٹی بڑا غریب نواز ہے اور وہ سرکاری خزانے لوٹ کر بھی غریبوں، مسکینوں اور ضرورت مندوں کی ضرورتیں پوری کرتا ہے- کسی بھی غریب چاہے وہ ہندو ہو، مسلمان ہو، سب کو ایک نظر سے دیکھتا ہے- ہندو دکاندار نے ساری داستان دلا بھٹی کو سنائی- دلا بھٹی نے اسے تسلی دی اور کہا کہ یہ تماری نہیں میری لڑکی ہے اور مجھے ہی اس کا حقیقی والد سمجھو اور میں خود ہی کسی ہندو لڑکے سے شادی کروں گا- تم واپس گاؤں چلے جاؤ اور اس نمبر دار سے کہہ دو کہ فلاں دن بارات لے کر آ جائے- باقی انتظام میں خود کروں گا- تم بے فکر ہو کر اپنا کام کرو- دلا بھٹی نے اس کو پوری تسلی دے کر الوداع کر دیا-

ہندو کو بڑی عزت نصیب ہوئی اور خوشی خوشی واپس گاؤں آ گیا- جب نمبر دار ملا تو جیسا دلا بھٹی نے کہا تھا اس کو کہہ دیا کہ اگر آپ نہیں مانتے تو آپ کا حکم سر ماتھے پر- آپ فلاں دن اپنی بارات لے کر آ جائیں اور میری لڑکی کو ویاہ کر لے جائیں- نمبر دار یہ سن کر مسرت سے ناچ اٹھا اور شادی کی تیاری کرنے لگا-

ادھر دلا بھٹی لڑکی کا رشتہ کسی ہندو لڑکے سے طے کرنے کے لیے سانگلہ چلا گیا اور ایک اچھے امیر گھرانے کے بیوپاری کے لڑکے سے یہ رشتہ طے کر آیا اور وہاں ان کو بارات لانے کی وہی تاریخ دے آیا جو تاریخ ادھر نمبر دار کو دی گئی تھی- بے شک دلا بھٹی کا اس سارے علاقے میں بڑا دبدبہ تھا لوگ اس کے نام سے تھر تھر کانپتے تھے لیکن غریب اس کی فراخدلی اور غریب پروری کے بڑے دلدادہ تھے- وقت مقررہ پر جب نمبر دار بارات لے کر پہنچا تو دلا بھٹی نے اپنے کچھ ساتھی بھیس بدل کر بھجوا دیے تھے جو اس ہندو کی حفاظت کرتے رہے- نمبر دار دلہا کے روپ میں مونچھوں پر تاؤ دیتا ہوا گھوڑی پر چڑھ کر بڑی سج دھج کے ساتھ اپنے ہمراہ کچھ باراتیوں کو بھی لایا ہوا تھا- جب بارات دروازے کے پاس پہنچی ہی تھی تو دلا بھٹی کے شیر جوانوں نے اس کو بڑی مضبوطی سے پکڑ کر نیچے گرا لیا اور زمین پر لٹا کر اوپر سے پولے (جوتے) برسانے شروع کر دیے اور پولے بھی ایسے پڑتے جیسے بادلوں میں بجلی کڑکتی ہے- پھر کہتے کہ تو شادی کرنا چاہتا ہے- خدا کو حاضر ناظر جان کر کہہ دے کہ یہ میری لڑکی ہے- تبھی معاف کریں گے- یا پھر تمہاری چمڑی ادھیڑ دیں گے- نمبر دار اتنا خوفزدہ ہو گیا کہ زمین پر ناک سے لکیریں نکال کر گڑگڑا کر معافی مانگتے ہوئے کہنے لگا کہ مجھے معاف

کر دو میں اس کو اپنی لڑکی ہی سمجھوں گا-ابھی نمبر دار یہ رہا تھا کہ اتنے میں سانگلہ بل سے بھی بارات وہاں پہنچ گئی اور خود دلا بھٹی بھی وہاں پہنچ گیا اور جب لڑکے اور لڑکی کے ہندو رسم کے مطابق پھیرے ہونے لگے تو لڑکی کے باپ کی جگہ خود دلا بھٹی وہاں بیٹھا اور خود لال رنگ کا ایک ساہلو (چادر یا دوپٹہ) جس پر پیلے پٹ (ریشمی دھاگہ) سے بڑی کاریگری سے بیل بوٹے ہوتے تھے، لے کر اس میں گڑ کی ڈھیلی لے کر لڑکی اور لڑکے کو تحفے پیش کئے- یہ منظر اس وقت اپنی مثال آپ تھا- گاؤں والوں نے اپنی نظر سے تو دیکھا لیکن ارد گرد کے لوگوں نے جب سنا تو وہ خوشی کے مارے ناچ اٹھے اور گیت گانے لگے-وہ دن کڑاکے کی سردی کا تھا لیکن اس مدھر سریلے اور دلکش گیت نے سب کے دلوں میں گرمی پیدا کر دی-(۱۰۶)

سندر مندریے تیرا کون وچارا دلا بھٹی والا
دلے دھی ویاہی سیر شکر پائی
کُڑی دا لال پٹاکا کُڑی دا ساہلو پاٹا
کُڑی دا جیوے چاچا ساہلو کون سمیٹے
چاچے چوری کٹی زمینداراں لٹی
نمبردار سدائے گن گن پولے لائے

اک پولا رہ گیا
سپاہی پھڑ کے لے گیا

فاطمہ عمر:

کتنی ہی بہاریں اور کتنی ہی خزائیں رخصت ہوئیں، وقت نے بہت سے نقوش دھندلے کر دیے- لیکن اس کہانی کا رنگ وروپ آج بھی برقرار ہے- آج بھی اس کے کرداروں کی ناکام حسرتوں پر ان کی آنکھیں بھیگنے لگتی ہیں- یہ دلسوز واقعات ان کے قلب وجاں میں رچ بس سے گئے ہیں- کہانی کچھ یوں ہے کہ

"شیخ عمر حیات چنیوٹ برادری کے ایک معزز اور معروف گھرانے کے فرد تھے اور برادری کے دوسرے افراد کی تقلید میں عازم کلکتہ ہوئے اور کاروبار شروع کر دیا- تھوڑے ہی عرصے میں اتنا روپیہ کمایا کہ کلکتہ شہر کی بڑی بڑی شاہراہوں پر ان کی پچاس کے قریب گاڑیاں چلنے لگیں- چنیوٹ آتے تو دریا کے کنارے اور مضافات کی سیر کرتے-ایک دفعہ حسب معمول چنیوٹ آئے تو پنڈی بھٹیاں میں مشہور میلہ سخی سرور لگا ہوا تھا-اس میلے میں دوسرے مشاغل کے علاوہ دور دور سے طوائفیں گانے اور ناچنے آتیں- عمر حیات گھوڑی پر سوار ہو کر میلہ پر چلے گئے-وہاں طوائفوں نے

اپنے اپنے ڈیرے قائم کر رکھے تھے جن میں رقص و سرور کی محفلیں جمی ہوئی تھیں- سب سے بڑا ڈیرہ فاطمہ نامی طوائف کا تھا- جس کا شمار پنڈی بھٹیاں کی خوبصورت طوائفوں میں ہوتا تھا- جب عمر حیات اس کے ڈیرہ پر پہنچے تو سفید قمیض شلوار اور سر پر کلے دار پگڑی باندھ رکھی تھی- حسن، جوانی اور دولت کے نشہ نے ان کو دوسروں سے نمایاں کر رکھا تھا- آپ جلد ہی طوائف کی توجہ کا مرکز بن گئے- اس غیر معمولی توجہ سے آپ بھی دل و جان سے اس پر فریفتہ ہو گئے- چنیوٹ واپس آئے تو اس کی یاد میں کھوئے کھوئے رہتے- ایک روز فاطمہ کے پاس اپنے بھائی محمد حسین کو چند شرائط کے ساتھ شادی کا پیغام ارسال کیا جو اس نے فوراً منظور کر لیا- نکاح کی تاریخ مقرر ہو گئی- عمر حیات کے بیشتر رشتہ دار اس رشتہ کے سخت خلاف تھے- ان کی عدم شرکت کے باوجود نکاح کی رسم ادا ہوئی- شادی کے بعد دنوں کلکتہ چلے گئے اور وہیں مستقل قیام کر لیا- پہلے ان کے ہاں ایک لڑکی پیدا ہوئی جس کے جوان ہونے پر اپنے حقیقی بھتیجے محمد صدیق کے عقد میں دے دی گئی جو کہ کچھ عرصہ کے بعد وفات پا گئی- کافی عرصہ کے بعد ۱۹۲۰ء کے لگ بھگ ان کے ہاں ایک چاند سا لڑکا پیدا ہوا- اس کی پیدائش پر والدین نے جی بھر کر خوشیاں منائیں- بچے کا نام گلزار محمد رکھا گیا-

میاں عمر حیات کے پاس دولت کی فراوانی تھی- انہوں نے چنیوٹ میں ایک وسیع محل کی تعمیر کا فیصلہ کیا- ۱۹۲۴ء کے اوائل میں اس کی تعمیر شروع کر دی گئی- دس لاکھ روپے کے خرچ سے اس کی تعمیر مکمل ہوئی- ابھی یہ مکمل ہوا ہی تھا کہ ۱۹۳۲ء میں میاں عمر حیات اس فانی دنیا سے رخصت ہو گئے اور اپنی چہیتی بیوی اور اکلوتے بیٹے کے ساتھ ساتھ اس خوبصورت محل کو بھی لاوارث چھوڑ گئے- سیٹھ عمر حیات کی وفات کے وقت گلزار کی عمر تیرہ چودہ سال کی تھی- اس اور اس کی والدہ فاطمہ کو ترکے میں ان گنت دولت اور مال و اسباب حاصل ہوا- لیکن دولت کے اس انبار کے ساتھ بد نصیبی کے سائے بھی ان کی تلاش میں تھے- اپنے خاوند کی وفات کے بعد اس کو اور بھی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا- لیکن یہ باہمت خاتون نامساعد حالات میں بھی اپنے بیٹے کی پرورش اور تربیت میں مگن رہی- اس کی ساری آرزوؤں کا محور اب گلزار محمد ہی تھا- فاطمہ بی بی کو چنیوٹ شہر کے غرباء اور مساکین ایک فیاض اور ہمدرد خاتون کے نام سے آج بھی یاد کرتے ہیں- جب گلزار نے سن شعور میں قدم رکھا تو فاطمہ بی بی نے محل کی رونق کو بحال کرنے کے لیے اپنے نوعمر لخت جگر کی شادی کا فیصلہ کیا- شادی کی رسومات نہایت تزک و احتشام سے منائی گئیں- کئی روز تک جشن کا سماں رہا- اس محل کے در و دیوار اور باسیوں کو خوش دیکھ کر سارا شہر مسرت سے لبریز تھا- چنیوٹ کی تاریخ میں اس سے زیادہ رنگارنگ تقریب کی کوئی مثال نہیں ملتی- لیکن قدرت کو یہ خوشیاں منظور نہ تھیں- کاتب تقدیر نے اس گھر کے مقدر میں نغمہ شادی کی بجائے نوحہ غم تحریر کر دیا اور خوشیوں کی بارات

ایک المناک سانحہ میں ڈھل گئی- اس المیہ کی داستان کچھ یوں رونما ہوئی کہ شادی کے دوسرے روز ولیمے والے دن صبح سویرے ہی دلہا غسل شادی کے لیے غسل خانہ میں داخل ہوا- جاڑے کے دن تھے- غسل خانہ کو گرم رکھنے کے لیے خادمہ نے جلتے ہوئے کوئلوں کا چولہا پہلے ہی غسل خانہ میں رکھ دیا تھا- دولہا نے غسل خانہ میں داخل ہوتے ہی اندر سے دروازہ بند کر لیا- جب کافی دیر تک گلزار محمد غسل خانہ سے باہر نہ آیا تو تشویش ہونے پر دروازہ کھٹکھٹایا گیا- اندر سے کوئی جواب نہ آنے پر دروازہ توڑ دیا گیا- گلزار محمد ننگے بدن فرش پر مردہ پڑا تھا- اس اندوہناک سانحہ کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی- اس غم میں ہندو مسلمان سب شامل تھے- قسمت کی ماری فاطمہ بی بی کی چیخ و پکار سن کر دل تڑپ جاتا تھا- اس نے سر کے بالوں میں انہی کوئلوں کی راکھ ڈال لی جن کوئلوں کے دھوئیں نے اس کے لخت جگر کی جان لے لی تھی- فاطمہ بی بی کے اصرار پر مرحوم گلزار کو محل میں ہی دفن کر دیا گیا- دکھوں کی ماری اور غمزدہ والدہ چنیوٹ کو چھوڑ کر کچھ عرصہ کے لیے پنڈی بھٹیاں آ گئی اور اپنے رشتہ داروں کے ہاں قیام کیا لیکن بیٹے کی جدائی نے جو اضطراب اس کے دل میں پیدا کر دیا تھا وہ کھینچ کر ایک بار پھر بیٹے کی قبر کے پاس لے گیا- بمشکل ایک سال کا عرصہ گزرا تھا کہ ۱۹۳۹ء میں خود بھی اپنے شوہر اور لڑکے سے راہ عدم جا ملی- اس طرح پورے خاندان کا دردناک حد تک خاتمہ ہوا- فاطمہ بی بی کی وصیت کے مطابق اس کو لڑکے کے پہلو میں دفن کر دیا گیا اور اس محل پر پھر سے تاریکی چھا گئی-

سیٹھ عمر حیات اور اس کے خاندان کا خاتمہ اس محل کے زوال کا پیش خیمہ تھا- عمر حیات کے بقیہ وارثان کی عدم دلچسپی کی بناء پر اس خاندان کے ملازموں نے یہاں رہائش اختیار کر لی اور فن تعمیر کا یہ خوبصورت شہ پارہ اپنے باذوق مکینوں سے محروم ہو کر شکست و ریخت کا شکار ہونے لگا- کئی سال یہاں یتیم خانہ بنا رہا- بالآخر ۱۹۹۰ء میں اس کی تزئین نو کر کے اس میں ایک لائبریری قائم کی گئی اور اس تاریخی اور ثقافتی ورثہ کو مکمل تباہی سے بچا لیا گیا- (۱۰۷)

پاروتی :

۱۹۳۳ء کے عرصے کی بات ہے کہ پنڈی بھٹیاں میں کالڑہ قوم کے ہندو جوندہ رام، نانک چند اور سرداری لال ساہوکارہ کا کام کرتے تھے- ان کا ایک منشی بوزا رام تھا جو بڑا شر پسند اور شرارتی تھا- ان کے ساہوکارہ بنک (موجودہ دفتر انجمن اصلاح المسلمین) کے سامنے ایک ہندو گیان چند کی دکان تھی جو ایک آنکھ سے کانا تھا- کالڑوں کی اس کے ساتھ بنتی نہ تھی- اس کا منشی بوزا رام اپنے مالکوں کی شہ پر آئے روز اس کو کانا کہہ کر آوازیں کستا اور اسے تنگ کرتا- اس پر گیان چند نے پنی اور اپنے والد

کی آئے روز کی بے عزتی کا بدلہ چکانے کا فیصلہ کر لیا- اس نے اپنی بیوی پاروتی جو بڑی خوبصورت تھی اس کے ساتھ مل کر کالڑوں کے قتل کا منصوبہ بنایا- پاروتی اپنے دھرم پتی کا اس شرط پر ساتھ دینے کے لیے تیار ہوئی کہ کالڑوں کے قتل کے بعد گیان چند اس کو بھی گولی مار دے گا کیونکہ وہ اپنے دھرم پتی کے بغیر ایک پل بھی زندہ نہیں رہنا چاہتی تھی- یہ عہد و پیمان کرنے کے بعد گیان چند نے ایک پستول حاصل کیا اور گھر پر اس کو چلانے کی تربیت حاصل کی- پھر ایک روز باپ کی بے عزتی کا بدلہ چکانے اور انتقام کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لیے کالڑوں پر حملہ کر دیا اس حملے میں نانک چند مارا گیا اور جوندہ رام شدید زخمی ہوا- گیان چند کے انتقام کی آگ ابھی ٹھنڈی نہیں ہوئی تھی چنانچہ اس کے بعد وہ پستول لے کر بوڑا رام کے گھر پر چڑھ دوڑا- یہاں بوڑا رام تو بچ گیا لیکن اس کا بیٹا منوہر لال جو سرگودہا کے سکول میں ٹیچر تھا اور چھٹی پر گھر آیا ہوا تھا وہ مارا گیا- اس کو قتل کرنے کے بعد گیان چند اپنی دھرم پتنی کے ساتھ کیئے گئے عہد کو پورا کرنے کے لیے گھر گیا اور گولی مار کر اسے بھی امر کر دیا اور خود پولیس کے سامنے پیش ہو گیا- اس وقت یہاں آغا سعادت علی تھانیدار تھا- اس نے گیان چند کو بچانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ اقبال جرم سے انکار کرنے پر کسی طرح سے بھی راضی نہ ہوا- کیونکہ وہ اب اپنی پاروتی کے پاس ہی جانا چاہتا تھا- اقبال جرم کرنے کے بعد عدالت نے اسے سزائے موت دے دی- مرنے سے پہلے گیان چند نے پنڈی بھٹیاں میں شادی گھر (تھانیدار کی موجودہ رہائش گاہ) تعمیر کروایا- یہ جگہ سرائے گیان چند کے نام سے مشہور ہوئی اور اس جگہ کانگریس کی مقامی تنظیم کی بنیاد رکھی گئی-(۱۰۸)

کیتی توں پچھاں ہٹ نہیں رہناں
بنجے کر چھڈیے ویر پرانا
جوڑی دے وچ بھنگ وی نہوں گھتی
اوہ سکھدے رہندے نیں ول کسب دا گولیاں چلانا
تے چھڈے رہندے روز نشانہ
نانک تے جوندہ، گیان بھن چھڈے نیں
باہمن بھج وگیا تے دس کرپے نوں گھتی
کریا آہندا دوست محمد ساڈے نال کہیہ ہویا
رنگین وسدیاں تے کھریوں لتھی
دوسا آہندا ایہہ گل بوڑے باہمن توں جا پچھ
آپوں نیویاں نوں صاحب ای سمجھے
تے کسے دیہاڑے کم آجاندی اے رکھی

مستی خان :

مستی خان دلا بھٹی کا جنگ جو اور دلیر بھتیجا تھا-ایک دفعہ کسی سید زادے نے مستی خان سے درخواست کی کہ ساندل بار کے جنگل میں ایک درخت ہے- صبح ہونے سے پہلے اس کی ٹہنی حاصل کرنی ہے-اگر وہ ناکام رہا تو سجادہ نشینی کے حق سے محروم کر دیا جائے گا-دلے کی بار کا جنگل وحشی جانوروں اور درندوں کی موجودگی کے سبب رات کے وقت خطروں کی آماجگاہ تھا-سید زادہ تنہا اس کام کا بیڑا نہیں اٹھانا چاہتا تھا- مستی خان اس کے ساتھ ہو لیا- جنگل کے وسط میں پہنچے تو روشنیوں اور رقص کا منظر دیکھ کر مستی خان نے گھوڑے کی لگامیں اس طرف پھیر لیں-وہ جاننا چاہتا تھا کہ جنگل میں اتنی روشنیاں کہاں سے آئی ہیں اور کس نے اس ویران جگہ پر رقص و سرور کی محفل سجا رکھی ہے- مستی خان جب اس منظر کے بالکل قریب پہنچا تو چشم زدن میں سارا منظر نظروں سے اوجھل ہو گیا- اس جگہ ایک بلا ظاہر ہوئی- مستی خان نے تلوار سونت لی- وہ صبح صادق تک اس بلا سے برسر پیکار رہا- بالآخر بلا بول اٹھی "مستی خان جیسا سنا تھا تجھے ویسا ہی پایا" دراصل وہ ایک جن تھا اس نے مستی خان کو اپنا دوست بنالیا اور کہا حکم کرو کیا چاہتے ہو- سید زادے کی شرط کا وقت ختم ہو رہا تھا- مستی نے مطلوبہ درخت کی شاخ کی فرمائش کر دی-بلا نے ہاتھ دراز کیا اور اس درخت کا ایک کٹا ہوا بہت بڑا ٹہنا اٹھا کر مستی اور سید زادے کے سامنے رکھ دیا- سید زادہ وہ ٹہنا اٹھا کر چلتا بنا-اسے سجادہ نشینی مل گئی-ادھر جن اور مستی خان میں دوستی ہو گئی جو ہمیشہ قائم رہی- یہ جن مستی خان کے ساتھ دلے کی فوج میں شامل ہو کر دشمنوں سے لڑتا تھا-(۱۰۹)

شیراں :

دلے کی بار کی نسلوں میں بہادری اور شجاعت کا جوہر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے-اس لیے اپنی عزت کے تحفظ کے لیے بلا تامل دشمن کے مقابل صف آرا ہو جانا ان کا وتیرہ رہا ہے-اس میدان میں بار کے مردوں نے ہی صرف بہادری کے جوہر نہیں دکھائے-بلکہ عورتوں نے بھی اپنی بہادری کے کرتب دکھا کر تاریخ میں اپنے نام رقم کرائے ہیں-ایسی ہی بہادر عورتوں میں ایک نام "شیراں" کا ہے جو دراصل اپنے نام کی طرح ہی شیر تھی- پنڈی بھٹیاں کے نواحی گاؤں "پرانیکی" کے زمیندار گھرانے میں ۱۹۶۰ء کی دہائی میں پل کر جوان ہوئی تو والدین نے اس کی شادی بیاہ کا بندوبست شروع کر دیا اور اس کے سہاگ کا سونا خرید کر رکھ لیا-شریکوں اور حریصوں کی نظروں میں یہ سونا کھٹکنے لگا- چنانچہ انھوں نے علاقہ جھنگ کے بدنام ڈاکو سلطانہ کو اس کی خبر کر دی-ایک رات سلطانہ ڈاکو اپنے دو ساتھیوں سمیت نیزوں اور بلموں سے لیس ہو کر شیراں کے گھر آداخل ہوا-اس وقت شیراں اور اس

کاوالد گھر میں اکیلے تھے-ڈاکوؤں نے شیراں کے سہاگ کا جو سونا گھر میں تھا وہ مانگا- لیکن شیراں کے باپ نے مزاحمت کی-اس پر سلطانہ ڈاکو نے اسے بلم مار کر شدید زخمی کر دیا- شیراں ہاتھ جوڑ کر ڈاکوؤں کے سامنے کھڑی ہو گئی اور خدا اور رسول کے واسطے دینے لگی کہ اس کے باپ کو نہ مارو- مگر سلطانہ نے جوان شیراں پر بھی دست درازی شروع کر دی-اپنی عزت کو خطرے میں دیکھتے ہوئے شیراں دونوں ہاتھوں میں قرآن مجید اٹھا کر ڈاکوؤں کے سامنے فریاد کرنے لگی کہ وہ اسے کچھ نہ کہیں- سلطانہ ڈاکو کی بے دینی اور بے غیرتی انتہا تک پہنچی ہوئی تھی-اس نے شیراں کی کوئی فریاد نہ سنی اور زور سے ہاتھ مار کر قرآن پاک کو زمین پر دے مارا- یہی وہ گھڑی تھی جب دلے کی بار کی شیراں کا خون کھول اٹھا اور وہ شیرنی کی طرح دھاڑتی ہوئی ڈاکوؤں پر جھپٹ پڑی- پہلے اس نے سلطانہ ڈاکو کے ہاتھوں سے بلم چھینی اور اس کی آنکھ پھوڑ دی پھر ایک ہی وار سے اسے ڈھیر کر دیا- سلطانہ کے باقی دو ساتھی بپھری ہوئی شیرنی کی غیبی طاقت کے سامنے نہ ٹھہر سکے اور شیراں کے پے در پے وار سے وہ بھی ڈھیر ہو گئے- چیخ و پکار سن کر سارا گاؤں اکٹھا ہو گیا- صبح پو پھوٹتے ہی تینوں ڈاکوؤں کی لاشیں پنڈی بھٹیاں شہر لائی گئیں اور ہزاروں لوگوں کی نگاہ عبرت کے لیے رکھ دی گئیں- حکومت نے شیراں کی بہادری کی بڑی داد دی اور اس کا وظیفہ لگا دیا- شیراں نے دلے کی بار کی تاریخ میں ایک ایسے باب کا اضافہ کر دیا تھا کہ جس کا ایک ایک لفظ اس کی بہادری، شجاعت اور دلیری کی علامت تھا- شیراں آج بھی اپنے گاؤں میں اس سارے منظر کو سمیٹے ہوئے خوش و خرم زندگی بسر کر رہی ہے-(۱۱۰)

دلے دی بار کی قومیں

ذات کا نظام اتنا کہنہ اور پیچیدہ ہے کہ اب تک بہت ساری کوششوں کے باوجود بھی مصنفین اس کی حقیقت کے بارے میں کوئی حتمی رائے دینے سے قاصر رہے ہیں، کچھ اس کی قدامت نے اس پر تاریکی کے پردے چڑھا دیئے ہیں اور کچھ اس کی پیچیدگی نے لوگوں کے ذہنوں کو متحیر کر دیا ہے جن کے نتیجہ میں ذات کی ابتداء اور اس کی صحیح نوعیت کے متعلق پوری واقفیت نہیں ہو سکی ہے۔ البتہ یہ بات ضرور واضح ہے کہ ذات پات کے موجودہ نظام کو ہندو برہموں نے اپنے مفاد کے لیے بنایا تھا اور اس پر مذہب کی مہر بھی لگا دی تاکہ غیر برہموں اور چھوٹی ذات والوں پر اپنے دیرینہ اثر اور تسلط کو قائم رکھنے کا ایک اچھا جواز ڈھونڈ نکالے۔ چنانچہ اس نظریے کے تحت صدیوں تک ذاتوں اور پیشوں کی بنیاد پر انسان، انسان سے نفرت کرتا رہا ہے اور اسے دھتکارتا رہا ہے۔ اور افراد کی ذاتوں کو ان کے پیشوں کے ساتھ منسلک کر دیا گیا۔ جیسے موچی، کمہار، چھپہ گر وغیرہ۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ذات کی بنیاد پیشے پر کبھی نہیں ہو سکتی۔ اس لیے جوں جوں پیشوں میں تبدیلی پیدا ہوتی گئی توں توں افراد کی قدر و منزلت میں بھی اضافہ ہوتا گیا اور ان کی ذاتیں بھی تبدیل ہوتی گئیں۔ دلے کی بار کے علاقے میں کچھ قومیں انتہائی قدیم ہیں اور کچھ دوسرے علاقوں سے آئی ہیں۔ اہم اور بڑی ذاتوں کی تفصیل کچھ یوں ہے۔

بھٹی :

دلے کی بار کے بھٹی نسل کے اعتبار سے سورج بنسی راجپوت ہیں۔ ان کا قدیم وطن بیکانیر کا علاقہ بھاٹنیر ہے۔ راجپوت راجہ بھونی کے بارہ بیٹے تھے سب سے بڑا گوپال تھا۔ گوپال کے پوتے گوندرائے کے پانچ بیٹے انبر، چابر، میلو، اتو اور دھیر تھے۔ دھیر کی اولاد بھٹنیر سے نکل کر اول نور محل کے جنگلوں میں آباد ہوئی پھر راوی چناب کے کنارے کی طرف چلے گئے اور اس طرف کے علاقوں پر قابض ہوتے گئے۔ آج یہ علاقے کے ۹۰ مواضعات کے مالک ہیں۔ یہ بھٹی خانوادے ماضی میں بے حد اثر و رسوخ کے مالک رہے ہیں اور ان کی بہادری اور جوانمردی کی بے شمار داستانیں ہمیں تاریخ کے اوراق میں ملتی ہیں۔ مغلوں کے دور میں اس قوم کے جوان دلا بھٹی نے مغل شہنشاہ اکبر اعظم کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تھا۔ جلال خاں بھٹی اور اس کے بھائی مستی خان نے راجہ رنجیت سنگھ کا

مقابلہ کیا-اس قوم کی دیگر سر کردہ شخصیات کا ذکر آگے آئے گا-(۱۱۱)

بکسیں بھٹی:

بکشیں یا بکسیں ایک ایسے شخص کا نام تھا جس نے بھٹی راجپوتوں کے آبائی وطن بھٹنیر سے اپنے کنبے سمیت چار پانچ صدیاں پہلے کوچ کر کے اس علاقے میں آکر قیام کیا-اس کے کوچ کرنے کی وجہ مال مویشیوں کے چارے کی کمی اور قبیلے کے باہمی جھگڑے تھے-شاہ کوٹ کے بزرگ حضرت نولکھ ہزاروی نے بکسیں کو دائرہ اسلام میں داخل کیا اور اس کی اپنے مرید رائے عقوب کھرل کی بیٹی سے شادی کر دی-اس طرح وہ بار میں خاصے رقبہ پر قبضہ کر کے ہمیشہ کے لیے یہیں کا ہو گیا- پھر رفتہ رفتہ یہ قوم پھیلتے پھیلتے وسیع علاقوں پر آباد ہوتی گئی- آج بیسیوں مواضعات کے مالک ہیں-اٹھارہویں صدی عیسوی کے وسط میں بکسیں کی اولاد سے لال کا پوتا اور جیادہ کا بیٹا مسو بھٹی ایک معروف بہادر شخص گزرا ہے-چوہدری مہدی حسن بھٹی (سابق ایم این اے) اور بریگیڈئیر رب نواز (ستارہ جرات) کا تعلق بھی بکسیں قوم سے ہے-(۱۱۲)

ہنجرا:

پنجاب کے جاٹ اقوام میں بارہویں بڑی قوم ہے-ان کے جد امجد کا نام ہنجر اؤں یا ہنجر انو تھا جو حصار کے علاقہ سے نقل مکانی کر کے دلے کی بار میں آیا تھا اور یہاں اسنجاب نامی شہر بسایا تھا- جس کے کھنڈرات صدیوں تک یہاں موجود تھے-یہ شہر کولو تارڑ کے قریب تھا-اس قوم نے ایک اور گاؤں منڈ ھیانہ ملانوالہ بھی بسایا تھا جس کے کھنڈرات دوہٹہ عظمت کے قریب ماضی قریب تک موجود تھے-اس قوم کے افراد نے بھٹنیر سے آئے ہوئے بھٹیوں کو پناہ دی تھی اور بعد ازاں وہ انہیں کے مغلوب ہوتے گئے-ہنجر اؤں کی کم و بیش آٹھ دس ذیلی شاخیں ضلع حافظ آباد میں آباد ہیں-جو بے حد اچھے کاشتکار اور غیور و جسور ہیں- پنڈی بھٹیاں کے اکثر ہنجر اوہاڑی ضلع کے علاقے میں منتقل ہو چکے ہیں-

کھرل:

پنڈی بھٹیاں تحصیل کے علاقوں میں سب سے زیادہ تعداد میں کھرل آباد ہیں-بظاہر یہ جاٹ مشہور ہیں لیکن اصلاً راجپوت ہیں-نیشاپور کے مشہور راجہ کرن کی اولاد ہیں-راجہ کرن کی اولادوں میں ایک شخص بھوپا نامی نے نیشاپور کو خیر آباد کہہ کر پنجاب کی جانب نقل مکانی کی تھی اور اوچ

شریف آیا تھا- جہاں حضرت مخدوم جہانیاں شاہ کی تبلیغ سے بھوپا اور اس کا بیٹا کھرل مسلمان ہو گئے تھے- کھرل کے بارہ بیٹے تھے- جن کی اولادیں اوچ شریف سے اٹھ کر دریائے راوی کے اکناف و اطراف میں پھیل گئیں- باہم خانہ جنگی کا شکار ہوئے تو دلے کی بار کے علاقوں میں آکر آباد ہوئے- چوریڑا، رابیرہ، پھلیرہ، دولو کے سب کھرلوں کی شاخیں ہیں- علاقے کے سب سے بڑے رقبے پر قابض محنتی کاشتکار ہیں-

گورایہ :

پنڈی بھٹیاں کے نواحی علاقوں میں کافی تعداد میں آباد ہیں- گورایہ نامی شخص ان کا جد امجد تھا- گورایہ کی نسلوں سے مل نامی شخص نے لکھی تھل سے نقل مکانی کر کے ضلع حافظ آباد کے علاقے کو اپنا وطن بنایا تھا- یہ چندر بنسی راجپوتوں کی ایک شاخ سروہا سے اپنا تعلق جوڑتے ہیں- ایک خیال یہ ہے کہ یہ لوگ سرسا سے نقل مکانی کر کے یہاں آباد ہوئے تھے- وہ کافی عرصے تک خانہ بدوشوں کی سی زندگی بسر کرتے رہے اور یہاں جگہ جگہ پھر کر مال و مویشی چراتے رہے- اب یہ علاقے کے کئی دیہات کے مالک اور اعلیٰ زراعت کے دلدادہ ہیں- ورکوں، تارڑوں اور چیموں سے باہم شادیاں کیں- (۱۱۳)

لودی کے :

مسٹر موریس کی تحقیق کے مطابق یہ کھرلوں کی شاخ ہیں لیکن لودی کے بذات خود الگ قوم ہونے کے دعویدار ہیں- مورث اعلیٰ لودی پندرہ نسل قبل دریائے راوی کے کنارے آباد ہوا- بعد ازاں خانہ بدوشی کی زندگی کے تحت سانگلہ ہل آگیا- اس کے چار بیٹے تھے جو سب کے سب معروف لٹیرے تھے- ورکوں، بھڑاؤں اور جاگ قوم کی زمینوں پر قبضہ کر کے زراعت کرتے رہے- سکھ دور کی ابتداء ہوئی تو انہوں نے اپنے گاؤں آباد کئے- لودی کے چاروں بیٹوں کے نام پر ان کی ذیل شاخیں ہیں عموماً دوسری قوم کے مردوں سے اپنی عورتوں کی شادی نہیں کرتے-

تارڑ :

ان کا جد امجد تارڑ نامی محمود غزنوی کے لشکر میں ملازم تھا- اس کی اولاد میں سے ایک شخص نبی نامی سب سے پہلے بیکانیر (بھاٹنیر) سے نکل کر گجرات آیا تھا- اس نبی کے بیٹوں میں سے ایک شخص امراہ نامی نے چناب پار کر کے بار کے علاقے میں اپنے نام سے ایک گاؤں امراہ آباد کیا تھا- اس امراہ

کی اولادیں یہاں اب کثرت سے آباد ہیں- نبی کے سات بیٹے تھے جس کی وجہ سے تارڑ قوم مزید سات شاخوں میں تقسیم ہو گئی- مغل حکمرانوں کے دور میں یہ قوم اثر و رسوخ کی حامل تھی- ۱۷۷۰ء میں اس قوم کے دو فرزندوں محمد صغیر اور عزت بخش نے بڑی شہرت حاصل کی- بلاشبہ یہ ذہین، خوبصورت اور بہادر قوم ہے- انہوں نے گجرات سے اٹھ کر یہاں کولو تارڑ، وینیے تارڑ، مظفر جیسے دیہات آباد کئے- اسی قوم کے راج محمد تارڑ، سیف اللہ تارڑ، ارشاد اللہ تارڑ اور افضل حسین تارڑ اپنے اپنے وقتوں میں اسمبلیوں کے رکن رہے-

گوندل :

جاٹ اور زراعت پیشہ قوم ہے- پنڈی بھٹیاں کے علاقے میں یہ دریائے چناب کے پار ضلع منڈی بہاؤالدین اور سرگودہا سے آکر آباد ہوئے اور کئی مواضعات بسائے- بابا فرید شکر گنج کے ہاتھوں مسلمان ہوئے تھے اور انہی کے مرید ہیں- ایک اور روایت کے مطابق ساندل اور گوندل بھائی تھے-

ہرل :

پنوار راجپوتوں کی ایک لڑی ہے- کھرلوں کی طرح یہ قوم بھی رائے بھوپا کو اپنا مورث بتاتی ہے- مگر ان کا یہ کہنا ہے کہ یہ لوگ رائے بھوپا کے دوسرے بیٹے کی اولاد ہیں- ابتداء میں جیسلمیر سے اوچ پہنچے اور آخر کار کمالیہ میں آکر آباد ہوئے- وہیں سے پھیلتے گئے- دلے کی بار کے علاقے میں پنڈی بھٹیاں اور چنیوٹ کے درمیانی حصے میں آباد ہیں-

نول :

یہ قوم بار کی قدیم قوم اور راجہ نول کی اولاد ہے جو راجہ دھان کا بیٹا تھا- ٹوڈر نولوں کا پہلا سردار تھا جس نے اسلام قبول کیا- ان کی بعض رسمیں تامل ناڈ سے مطابقت رکھتی ہیں- بے باکی، جوشیلا پن اور جنگ جو اس قوم کی خصوصیات ہیں-

چدھڑ :

اصلاً راجپوت ہونے کے دعویدار ہیں اور تنوار راجپوتوں کے فرزند راجہ طور کی اولاد ہیں- ان کا قدیم وطن راجپوتانہ تھا جہاں سے محمود غزنوی کے وقت میں نقل مکانی کر کے سب سے پہلے بہاولپور میں آباد ہوئے جہاں اوچ شریف کے مشہور پیر شیر شاہ والی کے ہاتھوں پر انہوں نے اسلام

قبول کر لیا-اس کے بعد وہ جھنگ آئے اور پھر کافی تعداد میں چناب وراوی کی اطراف آباد ہوتے گئے-بار کے علاقے جلالپور کہنہ اور موضع جنڈو کی کے علاوہ سات آٹھ دیہاتوں میں آباد ہیں-

آھیر :

یہ یہاں کی نہایت قدیم قوم ہے- ھیر یا آھیر قوم کا قبل از تاریخ کے دور سے اس کا پتہ چلتا ہے- کئی ماہرین کا خیال ہے لفظ آھیر حضرت آدم کے بیٹے ہابیل یا آبیل کی بگڑی ہوئی شکل ہے اور حضرت ہابیل کے ابناو اخلاف پر مشتمل ہے-بنیادی طور پر یہ زراعت پیشہ قوم ہے-

سپرا جاٹ :

گل جاٹوں کی ایک شاخ ہے- تحصیل نواں شہر انڈیا میں سکندرپور اس قوم کا مسکن رہا ہے- یہاں کے معروف صوفی بزرگ حضرت شیخ بہلول دریائی سپرا تھے اور ان کی اولادیں ٹبہ شاہ بہلول میں آباد ہیں-

چاہل یا چہل :

وہ راجہ اگر سین کی اولاد ہیں جو سورج بنسی راجپوتوں کی نسل میں سے تھا-اس راجہ کے چار بیٹے چاہل، چھینہ ، چھمہ اور ساہی تھے-ان چاروں میں سے الگ الگ قومیں وجود پذیر ہوئیں-اس کا اصل وطن مالوہ تھا-

نون :

نون دراصل بھٹی قوم کی مشہور و معروف ذیلی شاخ ہے- یہ لوگ خود کو راجہ گنج کی اولاد بتاتے ہیں جو والئی سیالکوٹ راجہ سالباہن کی اولادوں میں سے تھا- ماضی میں یہ قوم بڑے سیاسی و سماجی مرتبے کی حامل رہی ہے- سرگودہا کے علاقے سے اٹھ کر یہاں آئے اور ان کے جد امجد نے اوچ شریف کے بزرگ مخدوم جہانیاں کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا-اس قوم کے ایک بزرگ میاں خیر محمد نون پنڈی بھٹیاں میں مدفون ہیں اور ان کا مزار ہر خاص و عام کے لیے مرجع خلائق ہے-

وٹو :

پنڈی بھٹیاں کے گردونواح کے علاقوں میں وٹو قوم کے افراد بھی معقول تعداد میں آباد ہیں-

وٹو راجہ سالباہن کی اولاد ہیں جو بھٹی راجپوتوں کا جد امجد تھا- یہ لوگ راجہ سالباہن کے پڑپوتے راجپال کی اولاد ہیں- ماضی میں کھرل، ڈوگر اور جوئیہ قوموں کے ساتھ یہ بر سرپیکار رہی ہے- پنجابی میں وٹو، وٹہ یعنی پتھر کا مفہوم دیتا ہے اور یہ لقب اس قوم کے ایک شخص ادھم کو بہادری اور دلیری کی وجہ سے دیا گیا- اس قوم کے کھیوا نامی شخص نے پاک پتن کے مشہور و معروف ولی حضرت بابا فرید گنج شکر کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا تھا- گلہ بانی اس قوم کا قدیم پیشہ رہا ہے- اب یہ کاشتکار بن چکے ہیں- پنڈی بھٹیاں کے علاقے کے وٹو دریائے ستلج کے کنارے سے اٹھ کر آباد ہوئے-

ھونجن :

یہ قوم بھٹی راجپوتوں کی ذیلی گوت ہے- ان کے جد امجد کا نام ھونجن تھا- اس قوم کا پورا ایک گاؤں پنڈی بھٹیاں کے نواح میں آباد تھا- اب یہ قوم یہاں سے نقل مکانی کر کے سرگودھا کے علاقے میں جا بسی ہے اور ان کے علاقوں پر ڈاہر قوم کے افراد قابض ہیں-

چیمہ جاٹ :

دلے دی بار کے علاقوں میں چیمہ قوم کے جو خاندان آباد ہیں ان کی اکثریت ضلع سیالکوٹ سے یہاں آئی تھی- کئی چیمے اپنے آپ کو چوہان راجپوت بتاتے ہیں- ان کا کہنا ہے کہ کم و بیش ۵۰۰ سال قبل ان کے جد امجد چیمہ نے دہلی سے نقل مکانی کی تھی اور پہلے کانگڑہ اور پھر وہاں سے اٹھ کر امرتسر میں آباد ہوا تھا- وہ دہلی کے مشہور راجہ پرتھوی رائے کی اولادوں سے تھا-

اس چیمہ کے دو پوتے کنگ اور دھول بڑے نامی گرامی گزرے ہیں جو موجودہ چیمہ قوم کے اصل بانی ہیں- یعنی ان دونوں کی اولادیں چیمہ کہلائیں- چیمے بلاشبہ ایک خوبصورت، جفاکش اور بہادر قوم ہیں- ان کے متعلق سر ایبٹ سن نے درست کہا تھا! "چیمے ایک طاقتور اور منظم قوم ہیں تاہم بے حد جھگڑالو ہیں-" کئی ماہرین کا خیال ہے کہ چیمے اور چٹھے ایک ہی قوم سے تعلق رکھتے ہیں- اسی وجہ سے یہ کہاوت آج بھی مشہور ہے کہ "چیمے اور چٹھے، کھان پین نوں وکھو وکھ تے لڑن نوں اکٹھے-" پنڈی بھٹیاں میں ڈیرہ چیمہ کے علاوہ سکھیکی میں بھی اس قوم کے افراد آباد ہیں-

لنگاہ :

بنیادی طور پر افغان قوم ہے جو دریائے سوی و دھادر کے علاقہ سے نقل مکانی کر کے راہڑی اور اس کے نواح میں آباد ہوئے تھے- ہندوستان پر تیمور کے حملے کے وقت ملتان آگئے- ملتان پر کئی

برسوں تک حکمرانی کرتے رہے-ایک اور روایت کے مطابق یہ بھٹہ ،کھرل، ہرل اور لک قوم کے بھائی ہیں- پنڈی بھٹیاں کے نواحی علاقے قلعہ مراد بخش کے اطراف میں آباد ہیں اور کاشتکاری کرتے ہیں-

گھمن :

اصلاً راجپوت ہیں اور راجہ ملکیر کی اولاد ہیں جو چندر بنسی راجپوت تھا اور دہلی کے راجہ دلیپ کا پوتا تھا-راجہ ملکیر کی اولادوں میں سے ایک شخص سن پال نے قوم کے رسم ورواج کے برعکس کسی غیر قوم میں شادی کر لی- جس کی بنا پر اسے راجپوتوں نے اپنی قوم سے نکال دیا-اس سن پال کی اولادوں میں سے ایک شخص گھمن نامی نے فیروز شاہ کے عہد میں جموں کی طرف نقل مکانی کی اور وہاں شاہی ملازمت اختیار کر لی-اس شخص گھمن کی نسلیں الگ سے ایک ذات بن گئیں- پنڈی بھٹیاں شہر کے علاوہ موضعات میں بھی اس قوم کے کئی افراد آباد ہیں-

رانا(راجپوت) :

رانا راجپوت قوم ہے اور ان کا جدامجد رانا راہپ تھا جو ۱۲۰۱ء میں چتوڑ کے تخت پر مسند آرا ہوا-اس نے اپنے قبیلے کا نام سیسودیا رکھا اور اپنے قدیم سرکاری لقب راول کو ترک کر کے رانا کا سرکاری لقب اختیار کیا- شاہی نسل کے افراد راناوت کہلائے اور اس سے پیشتر راول دت کہلاتے تھے-راناوت اور راول کے امتزاج سے راوت بنا جو ان دو الفاظ کی مختصر شکل راوت کو رانا کے ماتحت صف اول کے سردار کا لقب ہونے کی حیثیت حاصل ہو گئی-لقب تبدیل کرنے کی ایک وجہ یہ تھی کہ جیسلمیر کے راجپوت بھٹی حکمرانوں نے بھی راول لقب اختیار کر رکھا تھا-راہپ نے راول کی بجائے رانا کا سرکاری لقب اختیار کر کے ایک قسم کا امتیاز پیدا کر دیا- پنڈی بھٹیاں کے موضع مچھونکہ اور ارد گرد کے رانا قوم کے اکثر افراد قیام پاکستان کے وقت مشرقی پنجاب کے علاقوں سے ہجرت کر کے یہاں آئے تھے-

گوجر :

گوجر قدیم آریا کھشتری ہیں اور ان کو گوجر لقب جنگ مہابھارت کے موقع پر ملا تھا- جن بہادروں نے کرشن جی کا ساتھ دیا تھا وہ گوجر کہلائے-گوجروں سمیت تمام آریاؤں کی مذہبی اور علمی زبان سنسکرت تھی-برصغیر میں ورود کے بعد گوجر قبائل نے کوہ اراؤلی اور اس کے ارد گرد کے

علاقوں کو خاص طور پر اپنا مرکز بنایا اور گوجری زبان بھی یہیں پیدا ہوئی- گوجروں نے یہاں طویل عرصے تک حکومت کی- آٹھویں صدی عیسوی میں گوجر حکومت کی حدود کابل سے لے کر کرناٹک تک پھیلی ہوئی تھیں-اب گوجر قبائل کشمیر کے علاوہ پاکستان کے تمام علاقوں میں پھیلے ہوئے ہیں اور یہ زیادہ تر قیام پاکستان کے وقت مشرقی پنجاب کے علاقوں سے ہجرت کر کے یہاں آئے تھے-(۱۱۴)

آرائیں :

بار کے علاقے میں جگہ جگہ پھیلے ہوئے ہیں-لفظ آرائیں عربی لفظ الرائی سے نکلا ہے- پہلے آرائین بنا اور آخر کار آرائیں ہو کر رہ گیا-اب تک اس قوم کو آریہ نسل سے سمجھا جاتا تھا مگر اب یہ حقیقت پایہ تکمیل کو پہنچ چکی ہے کہ ان کا تعلق عرب نسل سے ہے-اس قوم کے مورث اعلیٰ ایک بزرگ سلیم الرائی تھے جو مدینہ منورہ سے ہجرت کر کے وادی ہرات میں آئے اور پھر ان کے مجاہدانہ جوش نے اسے غازی محمد بن قاسم کا ساتھ دینے پر مجبور کر دیا- چنانچہ اسلامی فتوحات کے بعد ان کی نسل ملتان کے قرب و جوار میں پھیل گئی- غازی ممدوح کے قتل کے بعد دلبرداشتہ ہو کر ان لوگوں نے مجبوراً سپاہ گری کو چھوڑ کر گلہ بانی اور تلہ رانی کے پیشے اختیار کئے-شرافت، امن پسندی اور مذہبی شغف کو دیکھ کر کسی نے کہا تھا-رعیت رائین، دھن گائیں-دیگر لوگوں کی نسبت بہترین کاشتکاری کرتے ہیں-

پنڈی بھٹیاں اور جلالپور کے آرائیں مجموعی طور پر خوشحال اور یہاں کی مقامی، سیاسی، وسماجی زندگی میں موثر ہیں-

ممبرڑ :

یہ بنیادی طور پر بلوچ قوم ہے- یہ لوگ پہلے بلوچستان سے بھٹیانہ آباد ہوئے-وہاں سے بھٹیوں کے یہاں آنے کے کچھ عرصے بعد ہی اٹھ کر آباد ہوئے- گڑھی ممبراں ان کا پورا گاؤں آباد ہے اور کاشتکاری پیشہ ہے-

اولکھ :

دلے کی بار میں اولکھ قوم کے افراد بھی بستے ہیں-ان کا جد امجد اولکھ تھا-اس کا پڑپوتا سولہ پشت پہلے مانجھ کے علاقے سے یہاں آیا اور یہاں کے دھوتڑ قبیلے مین شادی کر لی-اس وساطت سے یہاں آباد ہوئے اور زمینیں حاصل کیں-

ڈھڈی :

ڈھڈی قوم پنوار راجپوتوں کی ایک شاخ ہے- میلسی ان کا اصل مسکن تھا- جہاں ان کی موجودگی کی بابت تذکرہ چودھویں صدی نصف اول میں ملتا ہے- جب دہلی کی حکومت روبہ انحطاط تھی تو یہ لوگ مختلف دریاؤں کے کناروں پر آباد ہونے کے لیے بکھر گئے- پنڈی بھٹیاں کے علاقے میں کاشتکاری کے پیشے سے منسلک ہونے کے علاوہ بعض کاروباری پیشے بھی اختیار کئے- یہاں کے بعض زرگر ڈھڈی قوم سے تعلق رکھتے ہیں-

کھچی :

اصلاً راجپوت چوہان ہیں- اجمیر ان کا قدیم مرکز تھا جہاں سے یہ قوم دہلی منتقل ہو گئی- مغلیہ عہد میں دریائے ستلج کے کناروں کے ساتھ ساتھ پھیل گئی- اس روش پر چلتے ہوئے بتدریج کئی خاندان چناب کے علاقوں میں سکونت پذیر ہوتے گئے- یہاں سکھیکی کے اردگرد کے علاقوں کے علاوہ باغ کہنہ میں بھی اس قوم کے افراد آباد ہیں- باغ کہنہ کے کھچی یہاں مدفون صوفی بزرگ خضر سلطان کی اولاد ہیں-

گلوتر :

اس قوم کے افراد راجہ رنجیت سنگھ کے دور حکومت میں دیوان ساون مل کے ایماء پر یہاں آ کر آباد ہوئے- اس سے قبل ان کی آمد یا موجودگی کے نشانات نہیں ملتے- پنڈی بھٹیاں کے علاقے میں اس قوم کے افراد مویشی چوری میں بہت بدنام ہیں-

نیکوکارے :

خود کو ہاشمی النسل بیان کرتے ہیں- شیخ نصیر الدینؒ ان کے جد امجد ہیں- ۱۴۳۰ء میں یہ بزرگ شیخ واہن (بہاولپور) کے مقام پر اقامت گزیں ہوئے- مل خاندان کے عہد میں سادات اچ سے روحانی نسبت پیدا کی- اس خاندان کے افراد بار کے علاقہ ہرسہ شیخ اور بستی غازی شاہ وغیرہ میں آباد ہیں- پنڈی بھٹیاں میں بھی اس قوم کے چند گھر مقیم ہیں-

میکن :

یہ لوگ سورج بنسی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں- ان کے مورث اعلیٰ کا نام میکن تھا- بے حد

بہادر اور ذہین قوم ہے-

ورک :

یہ راجپوت ہونے کا دعوی کرتے ہیں اور منہاس راجپوتوں کی ذیلی شاخ یا ان کے بھائی بند ہیں-ان کا کہنا ہے کہ وہ منہاس راجپوتوں کے ہمراہ جموں سے اس علاقے میں آئے تھے-سب سے پہلے وہ امرتسر میں گھچلی کے مقام پر آباد ہوئے تھے اور اس کے بعد لاہور و گوجرانوالہ کے اضلاع میں آئے-ان کے جد امجد کا نام ویرک تھا- یہ ویرک یلہان کی اولادوں میں سے تھا- جبکہ ورک جاٹوں کا کہنا ہے کہ ان کے جس جد امجد نے جموں سے نقل مکان کی تھی اس کا نام ادر سین تھا جبکہ ورک اس ادر سین کا بیٹا تھا- پنڈی بھٹیاں کے بعض زرگر اور ماشکی پیشوں کے افراد اصلاً ورک قوم سے تعلق رکھتے ہیں-

تھہیم :

ان کا دعوی ہے کہ وہ نسلاً عرب ہیں اور بانی اسلام کے دور کے ایک انصاری قبیلہ بنو تھہیم سے ان کا نسلی تعلق ہے- حضرت عمر فاروقؓ خلیفہ دوم کے دور میں جب بصرہ چھاؤنی و شہر کی بنیاد ڈالی گئی تو حضرت عمرؓ کے حکم سے وہاں سندھ کے کئی جاٹ خاندان بھی آباد ہو گئے تھے- یہ جاٹ وہاں قبیلہ تھہیم کے بھائی بند رہے اور واپس آکر تھہیم کہلانے لگے- ٹاڈ کی رائے کے مطابق یہ لوگ نسلاً راجپوت ہیں اور داھیم راجپوت ہیں- دلے کی بار کے علاقوں میں معقول تعداد میں آباد ہیں-

سانسی :

یہ لوگ سماجی اعتبار سے نچلی درجے کی زندگی بسر کر رہے ہیں ان سے کم و بیش چوڑے چماروں کا کام لیا جاتا ہے- مقامی زبان میں ان کو دیندار کہا جاتا ہے- ان کی اصل کے متعلق روایت ہے کہ یہ لوگ راجپوتوں کی ایک شاخ ہے- سانسی ان کے جد امجد کا نام تھا جس کی اولادوں میں سے ایک شخص ادرات نامی نے تیرھویں صدی میں بھٹنیر (ہندوستان) سے نقل مکانی کی تھی اور ضلع گوجرانوالہ میں آباد ہوا تھا- یہ قوم کافی عرصہ تک اس علاقہ میں خانہ بدوشوں کی سی زندگی بسر کرتی رہی- تاہم ادرات کی اولادوں میں سے مہاتری اور سندر نامی اشخاص نے گوجرانوالہ ضلع میں کچھ مواضعات بھی آباد کئے- یہیں سے اس قوم کے افراد پنڈی بھٹیاں کے علاقوں میں آباد ہوئے تھے- مہاراجہ رنجیت سنگھ کا تعلق بھی اسی قوم سے تھا-

مغل :

پنڈی بھٹیاں کے لوہار، درزی اور قاضی مغل کہلاتے ہیں- یہاں کے قاضیوں کا دعوی ہے کہ وہ عربی النسل ہیں- ہارون الرشید کے دور میں ان کے کئی افراد قاضی کے عہدوں پر فائز رہے- بعد ازاں اس خاندان کے چند افراد وسطی ایشیاء کے علاقوں میں پھیل گئے تھے اور وہاں سے مغلوں کے ساتھ ہندوستان آئے اور پھیلتے پھیلتے ان کی اولادیں چنیوٹ میں آکر بس گئیں- یہیں سے یہ پنڈی بھٹیاں آکر بس گئے- یہ قاضی اپنا شجرہ نسب حضرت سلمان فارسی سے ملاتے ہیں اور پنڈی بھٹیاں کے قاضی مرزا احمد سعید مغل کی اولادوں میں سے ہیں- علاوہ ازیں یہاں کے درزی جن کی اکثریت دریائے چناب کے پار سے اٹھ کر یہاں آباد ہوئی تھی مرزا مغل کہلاتے ہیں-(۱۱۵)

سید :

دلے کی بار میں سیدوں سے ایک خاص تقدس وابستہ رہا ہے اور یہ تقدس شاید رسول کریم ﷺ کے ساتھ ان کے نسلی تعلق کی وجہ سے ہے- مسلمان رسول خدا ﷺ اور آپ کی صاحبزادی حضرت فاطمہؓ کی نسل سے تعلق رکھنے والوں کی بے حد عزت کرتے ہیں- عباسیوں کے عروج اور شیعہ تحریک کی اشاعت نے سیدوں کی اخلاقی حیثیت کو بہت بلند مقام عطا کیا ہے- ہندوستان جیسی سرزمین میں جہاں برہمن مذہبی پیشواؤں کو خصوصی حقوق حاصل رہے تھے اس قدر مبالغہ آمیز عزت و توقیر کا حاصل ہونا کوئی تعجب خیز بات نہ تھی- پنڈی بھٹیاں کے علاقوں میں نقوی، گیلانی اور بخاری سید زیادہ معروف ہیں- پنڈی بھٹیاں کا نقوی سید خاندان قیام پاکستان کے وقت مشرقی پنجاب سے ہجرت کر کے یہاں آباد ہوا اور سید مصطفےٰ نقوی ہائی سکول کے قیام پاکستان کے بعد پہلے ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے- ان کا نسبی تعلق گردیزی سیدوں سے ہے- بخاری سیدوں کے خدا رسیدہ بزرگ سید محمد حیات صاحب موضع خرم چور ہیڑہ میں مدفون ہیں- سید شعیب شاہ نواز اور ظفر حسین شاہ ایڈووکیٹ ان کے مذہبی و سیاسی جانشین ہیں- جلالپور میں گیلانی سیدوں کے خاندانوں کو بھی احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور ان کے ایک بزرگ سید نیامت حسین بھی مدفون ہیں-

لودھرا :

شاہ شمس تبریز کے ہاتھوں مسلمان ہوئے اور تقریباً تین ساڑھے تین سو سال قبل احمد لودھرا نامی شخص بیکانیر ریاست سے یہاں آکر آباد ہو گیا- احمد کے دو بیٹے صالت اور مانگ تھے- صالت کے آگے چار بیٹے جان محمد، جلال، معظم اور امام تھے- انھیں کے اولادیں پھلتی پھولتی گئیں-

دریائے چناب کے قریب موضع لودھراں کے لودھروں کا کہنا ہے کہ وہ کشمیر سے آئے تھے-یہ بھی ممکن ہے کہ ان کے آباؤاجداد صدیوں پہلے کشمیر سے بیکانیر جاکر آباد ہوئے ہوں اور تب بیکانیر سے اٹھ کر یہاں آباد ہوئے-بہر حال یہ قوم پنڈی بھٹیاں کی قدیم قوموں میں سے ہے اور ان میں شرح خواندگی تقریباً سو فیصد ہے-اسی وجہ سے ماضی میں اس قوم کے بعض افراد نے بڑا نام کمایا ہے-ان میں معروف ماہر امراض چشم ڈاکٹر محمد شفیع مرحوم، ڈاکٹر قادر بخش، ڈاکٹر فضل الٰہی، بابو علی محمد، چوہدری محمد حسین ایڈووکیٹ وغیرہ ہیں-اس خاندان کے ایک فرد ڈاکٹر مظہر الحق آج کل امریکہ کے شہر نیویارک میں مقیم ہیں اور وہاں پاکستان ڈے پریڈ کے چیئرمین ہیں-یہاں کی مقامی سماجی و سیاسی زندگی میں یہ قوم ہمیشہ موثر کردار ادا کرتی آئی ہے-

ڈھیرے :

بذات خود یہ کوئی قوم نہیں ہے-یہ نام اس لیے پڑ گیا ہے کہ اس قوم کے افراد کھڈیوں کا کاروبار کرتے تھے اور کھڈیوں کے سوت کی ڈھیریاں لگاتے تھے-یہیں سے ان کو ڈھیرہ کہا جانے لگا-اصلاً راجپوت ہونے کے دعویدار ہیں-اس قوم کے ایک فرد کرم الٰہی ایڈووکیٹ نے لائلپور جاکر وکالت کی اور بڑا نام کمایا-وہاں کچہری کے پاس وکیلوں والی گلی انہی کی وجہ سے مشہور ہے-کرم الٰہی وکیل کی بیٹی بیگم ثریا شفیع لاہور کالج میں پروفیسر رہیں-وہ معروف معالج چشم ڈاکٹر محمد شفیع کی اہلیہ بھی تھیں-کرم الٰہی کے ایک فرزند خالد سلیم وزارت خارجہ میں ایڈیشنل سیکرٹری رہے اور آج کل اسلامی کانفرنس سیکرٹریٹ میں اسسٹنٹ سیکرٹری کے عہدے پر فائز ہیں-

چھینبے :

چھینبہ یا چھپہ گر قوم چھپہ گری کے عوامی فن کا پیشہ اختیار کرنے کی نسبت سے وجود میں آئی-ورنہ یہ اصل قوم نہیں ہے-محض پیشے کی وجہ سے یہ چھینبے یا چھپہ گر کہلاتے ہیں-یہاں کے چھینبے صدیوں سے اس عوامی فن کو زندہ رکھے ہوئے ہیں-ان کی اصل ذاتیں کھوکھر، ابھان بھٹی اور ڈھڈی ہیں-جو کھوکھر کہلاتے ہیں-وہ اپنا سلسلہ نسب قطب شاہ سے جوڑتے ہیں جو حضرت عباسؓ کی اولاد میں سے تھے اب یہ پیر ہجرہ شاہ مقیم کے مرید ہیں-جو ابھان بھٹی کہلاتے ہیں وہ راجپوت ہونے کے دعویدار ہیں اور راجہ بھونی کی اولاد ہیں-جو ایک زمانے میں بھٹنیر سے اٹھ کر کشمیر کے علاقوں پر قابض ہوا تھا اور گورداسپور کانگڑہ کے علاقہ کا حکمران بنا تھا-اس کی چار سو بیویاں تھیں اور اولاد کثرت میں تھی-یہیں یہ محاورہ "بھان متی کا کنبہ" وجود میں آیا-جب راجہ بھون مرا تو کثرت

اولاد کی وجہ سے ان کی لڑائیاں شروع ہو گئیں- چنانچہ اس کی اولاد میں سے کئی افراد پنجاب آکر آباد ہو گئے اور چنیوٹ سے لے کر وییے کے درمیانی حصوں میں پھیلتے گئے- ماضی میں یہ کاشتکاری، امامت اور چھپہ گری کے پیشوں سے بھی منسلک رہے- یہاں کے ابھان بھٹیوں کے ایک بزرگ میاں کھیوا ٹھٹھہ بھدروں میں دفن ہیں اور ہر سال ان کا میلہ لگتا ہے- روایت ہے کہ اس موضع میں کوئی مویشی چوری ہو جائے تو اس بزرگ کی کرامت کی وجہ سے چور اندھا ہو جاتا ہے- اس قوم کے کئی افراد جلالپور بھٹیاں اور کولو تارڑ میں بھی معقول تعداد میں آباد ہیں-

پھمرہ :

یہ آج کل شیخوں کی ہی ایک گوت سمجھی جاتی ہے مگر در حقیقت یہ ایک الگ قوم ہے اور مغلوں کے ساتھ وسطی ایشیا کے علاقے سے ہندوستان آئے تھے اور ضلع جہلم کے علاقے پنڈ داد نخان اور کھیوڑہ کے ارد گرد آباد ہوئے- ۱۸۵۷ء کے غدر کے دوران اسلام نامی پھمرہ پنڈی بھٹیاں کے علاقے میں آبسا اور یہاں شیخوں کے ساتھ رشتہ داریاں قائم کیں- اس وجہ سے وہ بھی شیخوں کے ساتھ جڑ گئے- حالانکہ جہلم کے پھمرے آج بھی مرزا لکھتے ہیں- محمد اسلام کے بعد خدا بخش کے دو بیٹے احمد دین اور جلال دین ہوئے یہاں کے پھمرے انہیں دونوں بھائیوں کی اولادیں ہیں- شیخ چراغ دین، شیخ محمد حیات اور شیخ محمد امین کا شمار اس قوم کے سرکردہ افراد میں رہا ہے-(۱۱۷)

شیخ ودہاون :

تقریباً تین چار سو سال قبل اس کے پہلے فرد بخت محل نامی نے اسلام قبول کیا اور دہلی سے آ کر اس علاقے میں سکونت اختیار کی- کوئی آٹھ پشت پہلے کرم الہی ودہاون کے دو بیٹے الہی بخش اور کریم بخش ہوئے جنھوں نے قصبہ پنڈی بھٹیاں کے محلہ قتل گڑھا اور خیر محمد میں اپنی اپنی کھوئیاں قائم کیں- الہی بخش کے پھر تین بیٹے فضل دین، امیر دین اور غلام حسین ہوئے- پنڈی بھٹیاں کے ودہاون انہی تین بھائیوں کی اولادیں ہیں- البتہ غلام حسین اور امیر دین کی اولاد میں سے بعض افراد کلکتہ اور بعد ازاں ڈھاکہ چلے گئے اور وہیں سکونت اختیار کر لی- الہی بخش کے بھائی کریم بخش کی اولاد چنیوٹ میں چوڑی کنڈوالے ودہاون کے نام سے مشہور ہیں- ان کے کئی افراد کراچی اور فیصل آباد میں بھی آباد ہو گئے- اس قوم کی سہگل وہرہ اور جلالپور کے پوری شیخوں کے ساتھ رشتہ داریاں بھی ہیں- کچھ ودہاون خاندان دریائے چناب کے پار سے بھی اٹھ کر یہاں آباد ہوئے تھے- یہ قوم مجموعی طور پر محنتی اور تجارت پیشہ ہے-

زرگر :

دلے کی بار کے زرگر زیادہ تر دو قوموں سے تعلق رکھتے ہیں-ایک ورک اور دوسرے چوہان- کچھ ڈھڈی اور گوندل بھی ہیں-ورک زرگر بھولا نامی شخص کی اولاد ہیں-اس کی چھ پشت بعد پہلا شخص کرم تھا جو مسلمان ہوا تھا-کرم کے دو بیٹے ماہی اور درگاہی ہوئے-ماہی کی اولاد میں سلطان، شہادت اور واحد تین بیٹے تھے-پنڈی بھٹیاں، جلالپور، رسولپور اور گردونواح کے ورک زرگر انہی تین بھائیوں کی اولاد ہیں-چوہان زرگر خود کو پرتھوی راج چوہان کی اولاد کہتے ہیں-ان کا دعوی ہے کہ پرتھوی راج کے گھر چنیوٹ کے زرگروں کی ایک لڑکی (جو ہندو تھی) بیاہی گئی تھی-اس کے بطن سے ایک لڑکا سوہن ہوا تھا-جب شہاب الدین غوری نے پرتھوی راج چوہان کو شکست دی تو اس کی بیوی اپنے بیٹے کے ہمراہ چنیوٹ آگئی-اس کے ساتھ اس کا سوتیلا بیٹا موہن بھی تھا-بعد میں ان کی اولادوں نے اسلام قبول کر لیا- چنیوٹ اور پنڈی بھٹیاں کے چوہان زرگر سوہن کی اولاد ہیں اور صدیوں سے انہوں نے اپنے ننہالی پیشے کو جاری رکھا ہوا ہے-(۱۱۸)

راول :

اصلاً راجپوت ہیں لودان کا جد امجد باپا راول تھا-جس کا اصل نام سائیل آدس تھا-اس کے معنی آقائے کوہ کے ہیں-باپا راول ۱۳ ے ء میں پیدا ہوا تھا اور بڑا بہادر اور نڈر تھا-بعد میں چتوڑ کا حکمران بنا-اس کے ہندو بچوں کی تعداد ۹۸ تھی اور انہیں اگنی اوپاسی سورج بنسیہ (آتش پرست سورج بنسی) کہا جاتا تھا-راول ان حکمرانوں کا لقب تھا بالآخر باپا ایران چلا گیا اور وہیں اس کی وفات ہوئی- پرتھوی راج چوہان اسی خاندان سے تھا-اسی نسبت سے راول خود کو چوہان بھی لکھتے ہیں-

پٹھان :

دلے کی بار میں پٹھان جگہ جگہ بکھرے ہوئے ہیں-اکثریت یوسف زئی شاخ سے تعلق رکھتی ہے-یہ لودھی حکمرانوں کے عہد میں مشرقی پنجاب کے علاقوں میں آکر آباد ہوئے تھے اور قیام پاکستان کے وقت وہاں سے ہجرت کر کے ان علاقوں میں آبسے-

بلوچ :

دلے کی بار کے علاقہ مڑھ بلوچاں کے بلوچ عرصہ قدیم سے بلوچستان سے آکر ضلع لائل پور میں آباد ہوئے-پھر وہاں سے آکر یہاں آبسے-ان بلوچوں نے انیسویں صدی کے آخر میں انگریزوں

کی افغانستان کے ساتھ لڑائی میں انگریزوں کی بھرپور مدد کی تھی اور انھیں جنگی سامان کی سپلائی کے لیے اونٹ فراہم کئے تھے۔ پنڈی بھٹیاں قصبہ میں بھی بلوچوں کا پورا قبیلہ آباد ہے جو دربار میاں خیر محمد نون کا مجاور ہے۔ ان کے پہلے شخص محمد بلوچ نامی نے کوئی دو سو سال قبل میران شاہ (بھیرہ) کے مزار سے نقل مکانی کی تھی اور یہاں خیر محمد نون کے دربار پر لنگر تقسیم کرنے کا کام سنبھالا تھا۔ موجودہ بلوچ قبیلہ اسی محمد کی اولاد ہے اور آج بھی اونٹوں کے ذریعے پیشے سے منسلک ہے۔

قریشی :

میراثی قریشی قوم ہونے کے دعویدار ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ عرب کے قریش قبیلے کی شاخ بنی اسد کی اولاد ہیں۔ روایت ہے کہ حضرت امام حسینؓ نے کربلا کی جاگیر اس قبیلے سے ۶۰ ہزار دینار کے عوض خرید کر دی تھی اور خریدنے کے بعد قبیلے کو واپس ہبہ کر دی تھی اور یہ ہدایت فرمائی تھی کہ وہ اہل بیت کی قربانیوں اور ان پر ہونے والے ظلم و ستم کا پرچار کرتے رہیں گے۔

چنانچہ سانحہ کربلا کے بعد بنی اسد نے شہیدان کربلا کی قبروں کی نشاندہی کی اور ان واقعات کی تفصیل کو نسل در نسل محفوظ کر کے آگے پہنچانے کا کام کیا۔ ان کا اصل کام خاندان اہل بیت کی تاریخ کو محفوظ کرنا ٹھہرا۔ کہا جاتا ہے کہ مخدوم آف جہانیاں جب عرب سے اٹھ کر برصغیر آئے تو بنی اسد کے کچھ افراد بھی ان کے ساتھ آ گئے۔ پھر یہ لوگ رفتہ رفتہ برصغیر بھر میں پھیلتے گئے اور مختلف مقامی حکمرانوں اور راجوں اور سرکردہ قوموں کے شجرہ نسب اور کارناموں کو محفوظ کرنے کا کام اپناتے گئے۔ ان کو میر یا میراثی کے ناموں سے منسوب کیا گیا۔ ڈوم اور بھانڈ ان کے مقابلے میں کم تر درجے کے مالک ہیں۔ یہاں کے میراثی قریشی بڑے ذہین اور منہ زور ہیں۔ اب ان کی نئی نسلیں خاندانی پیشہ کو ترک کر کے محنت مزدوری اور چھوٹے موٹے کاروبار کرنے لگے ہیں۔ یوں اس قدیم طریقہ تاریخ دانی کو زوال ہو چکا ہے۔

وسیر :

یہ قوم پنوار اور راجپوتوں کی ایک شاخ ہے اور ڈھڈی قوم سے جا ملتی ہے۔ پنڈی بھٹیاں کے علاقے میں یہ اس وقت آباد ہوئے تھے جب دہلی کی حکومت روبہ انحطاط تھی۔ یہاں اس قوم کے افراد نے کاشتکاری کے ساتھ ساتھ ترکھانوں کا پیشہ بھی اختیار کیا۔

قاضی :

دلے کی بار کے اہم قصبے جلالپور بھٹیاں میں آباد قاضی قوم کے افراد کشمیر سے اٹھ کر یہاں آباد ہوئے تھے۔اس قوم کے دھرم پال نامی شخص نے اسلام قبول کیا اور نور حسین نام اختیار کیا۔ نور حسین مغل بادشاہ شاہ جہاں کے دور میں اس علاقے میں آکر آباد ہوئے اور علی پور میں قاضی مقرر ہوئے۔بعد ازاں ان کے فرزند محمد جمیل بھی اورنگ زیب کے دور میں قاضی کے عہدے پر فائز رہے۔

۱۱۲۷ ہجری میں محمد جمیل کے پوتے محمد فاضل بھی اس عہدے پر فائز ہو گئے۔ یہ محمد شاہ رنگیلا کا دور تھا اور ان کی تقرری کا حکم نامہ آج بھی اس خاندان کے جانشین قاضی عبدالرشید ارشد کے پاس محفوظ ہے۔اسی خاندان کے قاضی غلام فرید اور محی الدین ۱۹۰۱ء میں جلالپور کی انجمن اشاعت اسلام کے بانیوں میں شامل تھے۔اس خاندان کے افراد ان اہم سرکاری عہدوں پر فائز رہنے کے علاوہ علم وادب کے بھی بڑے دلدادہ تھے۔چنانچہ یہ کہا جاتا ہے کہ اس خاندان نے شخصیتیں پیدا کی ہیں۔افراد پیدا انہیں کئے۔(۱۱۹)

سراج :

یہ بھٹی راجپوت ہونے کے دعویدار ہیں۔ان کا کہنا ہے کہ راجہ ہس پت کی تیرھویں نسل سے بھونی نامی شخص کے گیارہ بیٹے تھے۔ان میں ایک کا نام سرا تھا جو بعد میں سراج کے نام سے معروف ہوا۔وہ زین سازی کے کام کا بڑا ماہر تھا۔اس کی اولاد تقریباً تین سو سال قبل کشمیر سے اٹھ کر یہاں آباد ہوئی۔سراج کی پانچویں پشت پر محمود نامی شخص کے تین بیٹے میاں لال، سلطان اور سرخو ہوئے۔پنڈی بھٹیاں کے سراج انہی تین بھائیوں کی اولاد ہیں۔اکثر زین سازی کے قدیم پیشے سے وابستہ ہیں۔رنجیت سنگھ جب یہاں قابض ہوا تو سراجوں کی طرف سے تحفۃً اسے ایک زین پیش کی گئی۔اس کے عوض رنجیت سنگھ نے انہیں کوٹ دلاور اور ٹھٹھی بہلول پور کے قریب زمین الاٹ کر دی۔اس طرح کچھ سراج کاشتکاری سے بھی وابستہ ہو گئے۔تمام سراج اہل تشیع ہیں۔

ماشکی یا بہشتی :

یہ بذات خود کوئی ذات نہیں بلکہ پیشہ کے اعتبار سے ماشکی کہا جاتا ہے جو چمڑے کی بنی ہوئی مشکوں سے پانی بھر کر تقسیم کرتے تھے۔اصلاً یہ ورک اور بھٹی ہیں جو ماشکی بھٹی کہلانے کے دعویدار ہیں۔وہ ضلع گجرات کے علاقے ڈنگہ سے اٹھ کر پہلے پیر کوٹ پھر ثابت شاہ اور اس کے بعد یہاں آکر قیام پذیر ہوئے۔یہاں ان کی ورک ماشکیوں کے ساتھ رشتہ داریاں ہوئیں اور یہ ایک

دوسرے کے ساتھ خلط ملط ہوتے گئے-یہ سادے خان نامی شخص کی اولاد ہیں-جو بیکانیر راجپوتانہ سے اٹھ کر پنجاب میں آباد ہو گیا تھا-ورک ماشکی جنڈیالہ شیر خاں (ضلع شیخوپورہ) کے موضع جھبراں سے اٹھ کر یہاں آباد ہوئے تھے-اب ان کی اولادیں یہ خاندانی پیشہ ترک کر چکی ہیں-

جوگی :

جوگی کے معانی اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ وہ شخص جو مختلف ریاضتوں کے ذریعے ذہنی سکون حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے-علم نجوم اور رمل جانتا ہو-یہی ان کا پیشہ رہا ہے-یہ لوگ ڈرم بجاتے گاؤں گاؤں جاتے ،لوگوں کا حال معلوم کرتے اور انہیں ان کی قسمت کا حال بتاتے-یہاں کے جوگی قوم کے اصلاً سپرا اور باجوہ ہیں-

چنگڑ :

اس قوم کے آباؤاجداد جموں کے پہاڑی علاقوں سے آئے تھے-بنیادی طور پر خانہ بدوش قبیلہ ہے جو کام کاج کی غرض سے پھرتا رہتا ہے مگر کئی ایک کام کاج کی غرض سے ایک جگہ پر آباد بھی ہوئے-یہ شاہ شمس تبریز آف ملتان کے ہاتھوں مسلمان ہوئے تھے-محنت مزدوری کر کے کمانا جانتے ہیں-

شیخ قریشی :

دہلی میں سب سے زیادہ تعداد میں آباد تھے-انبالہ اور امرتسر میں بھی تھے-یہ اپنا تعلق ملتان کے بزرگ حضرت بہاؤالحق سے جوڑتے ہیں-جو ہاشمی قریشی سمجھے جاتے ہیں-یہاں کے شیخ قریشی قیام پاکستان کے وقت انہی علاقوں سے ہجرت کر کے یہاں آباد ہوئے تھے-

کنجر :

بعض علاقوں میں کنچن بھی کہا جاتا ہے-کوئی قوم نہیں محض عصمت فروشی کے پیشہ کی وجہ سے کنجر مشہور ہوئے-پنڈی بھٹیاں کے کنجروں کے متعلق روایت ہے کہ اڑھائی تین سو سال قبل بھٹیوں اور چٹھوں کی لڑائی کے نتیجے میں مال غنیمت کے طور پر یہ یہاں آئے تھے-بعد میں اس پیشہ کے کئی اور خاندان بھی دریا پار سے یہاں آکر آباد ہوئے-ان کی عورتیں شادی بیاہ یا خاص موقعوں پر اپنے فن کا مظاہرہ کرتیں-ان کی کئی خوبرو لڑکیاں جاگیرداروں اور زمینداروں کے عقد میں آئیں-

کئی ایک ناجائز اولادوں کی مائیں بھی بنیں-اب یہ پیشہ تقریباً معدوم ہو چکا ہے اور ان کے مرد محنت مزدوری کر کے باعزت زندگی گزارنے کی طرف مائل ہو چکے ہیں-

دراوڑ :

یہ قوم یہاں کی قدیم ترین قوموں میں سے ہے- عام طور پر مصلی یا مسلم شیخ کہلاتے ہیں-ان کے متعلق محققوں کا خیال ہے کہ یہ آسٹرونیگرو ہیں جو آسٹریلیا سے آئے اور وادی سندھ کے منڈورا قبائل کو دھکیل کر یہاں آباد ہو گئے-ان قوموں نے حاکم اقوام کی گوتیں اختیار کر کے ان ناموں کو اپنی پہچان بنالیا- دھاپ، سہوترے، تاہر، گھارد، پیگانی، چترے، شیرنے، بھنگیلے، ساہنی، گگوے، چواڑ، چوری، ملکھٹ اور ملک وغیرہ ان کی گوتیں ہیں- آریاؤں کے حملوں کے بعد ان کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑ لیا گیا جن سے سماجی طور پر ابھی تک نکل نہیں پار ہے-

ڈب :

اصلاً جاٹ ہیں- ڈب جاٹوں کی ایک گوت ہے اور دلے کی بار کے قدیم ترین باشندگان میں سے ہیں-آریائی عہد سے اس قوم کا سراغ ملتا ہے-زیادہ تر زراعت پیشہ ہیں-

چوڑے (بھنگی) :

گوت ان کے بے شمار ہیں-ان کا قول ہے کہ لال بیگ فقیر نے جو اپنے وقت کا ایک بزرگ تھا مذہب ایجاد کیا اور ہم کو چیلہ بنایا- خاکسار ہمارا نام ہے خاکروبی ہمارا کام ہے، نعمت خدا کی عام ہے، نہ کچھ حلال ہے نہ حرام ہے-اس واسطے ہم سب کچھ کھا لیتے ہیں- یہاں کے چوڑے مسلمان ہونے بعد البتہ حرام حلال کی ضرور تمیز کرنے لگے ہیں-

شیخ ڈھولئے :

حضرت سخی سلطان کے مداح و علمبردار کہلاتے ہیں-گدائی و دریوزہ گری پر ان کا گذارہ ہے- میلوں کے قافلوں اور تہواروں میں یہ اکثر اکٹھے ہوتے ہیں-

دیگر پیشہ ور ذاتیں :

پیشہ ور ذاتوں میں ماچھی، جولاہے، تیلی، کمہار، قصاب اور نائی اہم قومیں ہیں-ماچھی سوم پال کی اولاد ہونے کے دعویدار ہے جو راجہ بھونی حکمران جیسلمیر کا بیٹا تھا-یہ دیہاتوں میں فصلوں کی بوائی

اور کٹائی کے موقع پر کام کرتے ہیں اور عموماً ماچھی عورتیں دایااور باورچی کے طور پر کام کرتی ہیں۔ تنوروں میں روٹیاں لگانا ان کا عام پیشہ ہے۔بار کے علاقے کے کچھ ماچھی کھوکھر، مہار، منہاس اور سل قوموں سے بھی تعلق رکھتے ہیں۔اسی طرح نائی بھی راجہ بھونی کے بیٹے لکھن پال سے اپنا تعلق جوڑتے ہیں جو بھٹیوں کے معین کے طور پر ان کے ساتھ آئے تھے۔جولاہے اور چمار بنیادی طور پر ایک ہی قوم سے تعلق رکھتے ہیں۔صرف پیشوں کی نوعیت کا فرق ہے۔یہ ماضی میں سب سے پسماندہ دستکار طبقہ تھا۔زیادہ تر جولاہے بھٹی کہلاتے ہیں۔البتہ کوئی کوئی کھوکھر، جنجوعہ، سندھو اور جریال بھی کہلاتے ہیں۔ان کی کم عقلی اور سادگی مشہور ہے۔چماروں میں چنڈڑ اور گولیا گوتیں زیادہ مشہور ہیں۔دستکار قوموں میں ترکھان بار کی زندگی میں ایک لازمی عنصر رہا ہے۔فرنیچر اور تعمیرات میں یہ ماہر ہیں۔ان کی اصل قومیں وسیر، گھمن، جنجوعہ، کھوکھر، بھٹی اور متھارو ہیں۔کمہار بھی صدیوں سے اس دھرتی کے سینے سے مٹی نکال نکال کر برتنوں کی شکل میں اپنے عوامی فن کا ثبوت پیش کرتا آیا ہے۔یہ مٹی کے برتن بنانے کے علاوہ گدھوں کے ذریعے باربرداری کا کام بھی کرتے ہیں۔ان کی اصل قومیں گولا، مہار، ڈول، ڈھڈی، اور کھوکھر ہیں۔البتہ تمام کمہار اپنے ساتھ رحمانی لکھتے ہیں۔قصابوں کے متعلق ایک کہاوت مشہور تھی کہ جس نے ابھی تک چیتا نہیں دیکھا وہ بلی کو دیکھ لے اور جس نے ٹھگ کو نہیں دیکھا وہ قصاب کو دیکھ لے۔(۱۲۰)

جنجوعہ :

ابوالفضل اور سر میپل گرفن کے نزدیک جنجوعہ قوم اصل میں جادوبنسی راجپوت ہے۔ان کی اپنی روایات کے مطابق جنجوعہ قوم راجہ مل راٹھور کی وارث نسل ہے جو قنوج یا جودھ پور سے ۹۸۰ء میں نقل مکانی کر کے جہلم آیا اور ملوٹ تعمیر کیا۔راجہ کے ایک بیٹے کا نام جودھ تھا جو کوہ نمک کا بھی پرانا نام ہے۔اس راجہ کے واحد برادر وبر کی اولاد جنجوعہ کہلاتی ہے۔شمال میں گکھڑوں اور مغرب میں اعوانوں نے انہیں بے دخل کر دیا اور آخر کار وہ وسطی اور مشرقی حصوں پر قابض رہ گئے۔بعد ازاں جگہ جگہ بکھرتے گئے۔

اعوان :

دلے کی بار کے علاقے میں اعوان جگہ جگہ پھیلے ہوئے ہیں اور ایک روایت کے مطابق یہ قطب شاہ کی اولاد ہیں۔دوسری روایت کی رو سے بتایا جاتا ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی جو بی بی پاک ہرات سے تعلق رکھتی تھیں ان سے اعوانوں کی نسل چلی۔ابتداء میں پشاور کے اطراف میں آباد تھے۔بعد میں نمک کے پہاڑوں کی طرف منتقل ہو گئے۔اعوان چھ سو سال تک میانوالی کے خطہ

پر حکمران رہے۔اسی عرصے میں یہ وسطی پنجاب کے علاقوں میں بھی آکر آباد ہوتے رہے۔یہ علوی بھی کہلاتے ہیں۔یہ بے تکلف خوش طبع اور جتھے کے ساتھ انسیت رکھتے ہیں۔

شیخ پوری :

کھتریوں کی قوم سے سلسلہ نسب ملتا ہے۔تیرہ چودہ نسلیں قبل اسلام قبول کیا اور دہلی کے علاقے سے آکر دریائے چناب کے دونوں کناروں کے اردگرد آباد ہوئے۔جلالپور بھٹیاں کے پوری شیخ میاں عبدالفتاح پوری کی اولاد ہیں۔ان کی اب بارہویں نسل چل رہی ہے۔زمینداری اور تجارت دونوں قسم کے پیشوں سے منسلک ہیں۔ماضی میں چمڑے اور ہڈیوں کی تجارت میں ان کا اجارہ تھا۔مجموعی طور پر خوشحال اور متمول ہیں۔

ڈاہر :

یہاں کے ڈاہر اصلاً جاٹ ہیں اور مغل عہد میں کمالیہ کے علاقے سے اٹھ کر یہاں آباد ہوئے تھے۔یہ زیادہ تر پنڈی بھٹیاں کے جنوبی حصے میں پھیلے ہوئے ہیں۔موضع ہندوآنہ کے ڈاہر خوشحال اور سیاسی و سماجی طور پر بااثر ہیں۔یہاں کے مہر مغل خاں انگریزی دور میں ذیلدار اور بعد ازاں سفید پوش رہے۔ان کے فرزند مہر مولاداد اور بھتیجے مہر نور محمد ضلع کونسل کے ممبر رہے۔ان کی مقامی ذیلدار بھٹیوں سے رشتہ داریاں بھی قائم ہیں۔

مسن :

اپنے جد امجد کے نام کی مناسبت سے مسن کہلاتے ہیں۔یہاں کے مسن دریائے چناب کے پار سے آکر آباد ہوئے اور یہ سب چوغطہ نامی شخص کی اولاد ہیں۔اس قوم کے میاں غلام محمد مسن اور ان کے بیٹے میاں ظہور احمد مسن سیاسی و سماجی سرگرمیوں میں نمایاں رہے۔

کھنہ :

ہندوؤں سے مسلمان ہوئے شیخ کہلاتے ہیں۔جلالپور کے کھنہ قبیلہ میں شیخ کرم الٰہی اور شیخ احمد دین نمایاں شخصیات تھے۔شیخ کرم الٰہی نے مقامی مسلمان جاٹوں کو ہندو ساہوکاروں کے چنگل سے نجات دلانے کے سلسلے میں اہم خدمات سرانجام دیں۔وہ مصالحت کے بڑے ماہر تھے۔اس خاندان کے چند افراد اب لاہور جابسے ہیں۔

☆☆☆

اولیاء کرام

حضرت میاں خیر محمد نون :

آپ حضرت شاہ بیگ نون ولی کے فرزند تھے- حضرت شاہ بیگ کو شب برات نصیب ہوئی تھی- آپ سے روایت ہے کہ مجھے پیر دستگیر شیخ عبدالقادر جیلانی نے بازو سے پکڑ کر حضرت محمد ﷺ کے حضور پیش کیا-اس لیے اس خاندان کا نام اویسی قادری رکھا گیا کیونکہ خواجہ اویس قرنی کی طرح آپ نے باطنی بیعت کی تھی-شاہ بیگ ولی کے آٹھ فرزند تھے- جن میں ایک حضرت میاں خیر محمد نون ہیں- کہا جاتا ہے کہ آپ جب شکم مادر میں تھے تو حضرت شاہ بیگ ولی جب گھر تشریف لاتے تو آپ والدہ ماجدہ کو اٹھنے پر مجبور کرتے-اگر کسی وجہ سے آپ نہ اٹھتیں تو پیٹ میں درد شروع ہو جاتا-آپ کی ایک اور کرامت یہ ہے کہ جب آپ کی عمر پانچ سال کی تھی تو آپ کے والد نے کہا بیٹا چاہ چلاؤ تاکہ وضو کر لوں- آپ نے چاہ کو چلانا شروع کیا اور اپنا پگڑی اتار کر گادھی پر رکھ دی اور کھوہی چلنے لگی-والد نے وضو کے بعد نماز پڑھی اور گھر چلے گئے-اگلی صبح جب والد صاحب مسجد میں نماز کے لیے تشریف لائے تو دیکھا کہ کھوہی ابھی چل رہی ہے اور گادھی پر میاں خیر محمد نون کی پگڑی پڑی ہوئی ہے- آپ نے پگڑی اٹھالی اور حضرت میاں خیر محمد نون کو دی اور کہا کہ بیٹا جلدی مت کرو- جوان ہوئے تو علاقے میں رشد و ہدایت کی شمعیں روشن کرتے رہے- کچھ عرصہ بعد رنجیت سنگھ کا باپ مہان سنگھ ۱۷۶۵ء میں حضرت خیر محمد نون کے مسکن ہلا لپور (اب یہ گاؤں ضلع سرگودھا میں ہے) پر چڑھ دوڑا-ان دنوں سکھوں نے اس علاقے میں بڑی غارت گری شروع کی ہوئی تھی- مہان سنگھ نے گاؤں کا محاصرہ کر لیا اور میاں خیر محمد نون اہل گاؤں کے ہمراہ قلعہ بند ہو گئے-اتفاقاً ایک طرف سے قلعہ کی دیوار بیٹھ گئی- سکھ قلعہ کے اندر داخل ہو گئے اور انہوں نے اعلان کر دیا کہ تمام کمی (معین) مرد اور عورتیں اپنے اپنے بچے لے کر باہر نکل جائیں کمیوں کی عورتوں اور مردوں نے اپنے اور نون قوم کے بچے و بچیاں اٹھا لیے اور باہر نکل گئے-اس کے بعد سکھوں نے قتل عام شروع کر دیا اور میاں خیر محمد نون کو پکڑ کر لاہور لے گئے جہاں ان دنوں تین سکھ سرداروں کی حکومت تھی- لاہور لے جا کر میاں خیر محمد نون کو شہید کر دیا گیا- آپ کے مرید وہاں پہنچے جن میں نمایاں میاں محمد یار خاں بھٹی پنڈی بھٹیاں، میاں اثالث، محمد باقی قوم گجر ساکن کھون پنڈ داد نخان وہاں موجود تھے- یہ مرید حضرت خیر محمد نون کو اپنے اپنے گاؤں لے جا کر دفن

کرنا چاہتے تھے-اس بات پر ان میں جھگڑا ہو گیا اور لڑائی تک نوبت چلی گئی-اگلے روز ہر دو فریقین کو حضرت خیر محمد نون نے خواب میں بشارت دی کہ میری لاش کو بیل گاڑی پر رکھ دیں جہاں بیل گاڑی رک جائے وہاں مجھے دفن کر دیں- لڑنے جھگڑنے کی ضرورت نہیں- آپ کے حکم کے مطابق ایسا ہی کیا گیا--بیل گاڑی چل پڑی اور جہاں آپ کا روضہ مبارک ہے یہاں آکر رک گئی-اس جگہ آپ کو دفن کر دیا گیا- پھر میاں محمد یار بھٹی نے اچھوتے طرز تعمیر کے روضہ کی دو منزلہ خوبصورت عمارت تعمیر کروائی-اس پر اس وقت ایک لاکھ دمڑی خرچ ہوئی-گنبد کے اندرونی حصہ پر خوبصورت نقش و نگاری کرائی گئی جو آج بھی اس کی دلکشی کا نمونہ ہے-آپ کے مزار پر علماء و فقراء ہی حاضری نہیں دیتے بلکہ بہت سے راجے نواب اور نامور مسلمان یہاں حاضری دیتے رہے ہیں-آپ کا عرس ۲۱ بیساکھ کو ہوتا ہے- جس میں ملک کے طول و عرض سے بے شمار افراد خلوص ارادت سے شرکت کرتے ہیں-

شیخ بہلول دریائی :

آپ کا پورا نام بہاول دین ہے- ۹۱۲ھ ہجری بمطابق ۱۵۱۴ء ضلع جھنگ کے قصبہ لالیاں کے قریب دریائے چناب کے کنارے آباد ایک چھوٹے سے گاؤں ونو کے میں پیدا ہوئے-والد ماجد کا نام میاں موسی تھا- جن کا تعلق سیرا جاٹوں سے تھا-پانچ برس کی عمر میں حرف شناسی کے لیے آپ کو حسب دستور قریبی مدرسے میں داخل کروادیا گیا- جہاں عجیب و غریب قسم کے سوالات کے نتیجے میں کچھ عرصہ کے بعد استاد نے شیخ بہلول کے والد کو مشورہ دیا''یہ بچہ کسی اور منزل کا مسافر ہے'' بہتر ہے کہ اسے کسی درویش کے سپرد کر دیا جائے-والد کے اتنے وسائل نہ تھے کہ وہ تربیت کے لیے اسے کسی اور جگہ بھیج دے-ادھر شیخ بہلول نے عنفوان شباب میں قدم رکھا تو اندر کی بے چینی نے برا حال کر دیا-والدین نے اس کا حل شادی میں ڈھونڈا-اس طرح دو بیٹے محمد علی اور ولی محمد تولد ہوئے- عمر عزیز کے ۲۸ ویں برس میں اندر کا اضطراب نا قابل برداشت ہو گیا اور شیخ بہلول زیارت حرمین شریفین کی سعادت کے لیے چل نکلے-زادراہ کی فکر نہ تھی بس خدا پر بھروسہ تھا- چنانچہ وہ پہلے نجف اشرف روضہ حیدر کرار پر حاضر ہوئے-دو برس تک مزار مقدس پر جاروب کشی کی-یہاں سے کوچ کرتے روضہ حسینؓ پر حاضری دی اور یہاں تین ماہ قیام کرنے کے بعد عازم حرمین شریفین ہوئے- شیخ بہلول مناسک حج ادا کرنے کے بعد روضہ رسول ﷺ پر حاضر ہوئے اور چھ ماہ بارش انوار میں بسر ہوئے- یہیں سے شیخ موصوف بغداد کی طرف روانہ ہو گئے جہاں پہنچ کر غوث اعظم شیخ عبدالقادر جیلانی کے مزار پر حاضری دی-ایک سال بعد مشہد میں امام موسی کاظم کے مزار

پر پہنچ کر یہیں کچھ عرصہ بسر کیا- یہاں سے کوچ کیا تو افغانستان میں کوہ پنج شیر کی چوٹی پہنچ کر ایسی غار پہنچے جو اصحاب کہف کے غار کی ہو بہو تصویر بیان کی جاتی ہے- یہاں موجود ایک بزرگ سے روحانی فیض حاصل کیا اور ان کے حکم پر لاہور روانہ ہو گئے- یہاں پہنچ کر محلہ تلہ گھاگا، کی مسجد ابو بکر تشریف لے آئے جہاں حضرت شاہ حسین مقیم تھے- شیخ بہلول نے شاہ حسین کو اپنی شاگردی میں لے لیا اور مسلسل ۲۶ برس تک ان کی دینی اور صوفیانہ تعلیم کا فریضہ انجام دیا- متحدہ ہندوستان میں یہ زمانہ سیاسی اعتبار سے زیروزبر کر دینے والا تھا- حفظ قرآن کے بعد شیخ بہلول اپنے شاگرد کی تربیت عموماً درگاہ حضرت علی ہجویری المعروف داتا دربار کیا کرتے تھے- شیخ بہلول لاہور سے رخصت ہوئے مگر اپنے آبائی قصبے میں جانے کے بجائے حکومت وقت (مغل شہنشاہ اکبر) کے باغی اور پنجاب کے نامور سپوت دلا بھٹی کے علاقے پنڈی بھٹیاں میں آ گئے اور یاد الٰہی میں مصروف ہو گئے- یہ زمین ابدال احمد نامی زمیندار کی ملکیت تھی- بعد میں ابدال احمد کی پشت سے برخوردار نامی ایک ولی کامل پیدا ہوئے جن کا مزار علاقہ بھوانہ میں آج بھی مزار میاں لکھا کے نام سے مشہور ہے- پنڈی بھٹیاں آنے سے کچھ عرصے کے بعد ہی شیخ بہلول خالق حقیقی سے جا ملے اور دریائے چناب کے کنارے گاؤں کانووال کے پاس مدفون ہوئے- بعد ازاں دریابرد ہونے کے نتیجے میں ان کے جسد خاکی کا صندوق نکال کر بہ شاہ بہلول لا کر دفن کیا گیا-

حضرت شاہ بہلول کو شہید اعظم سلطان فتح علی ٹیپو حاکم میسور کے جد اعلیٰ ہونے کا بھی اعزاز حاصل ہے- شیخ بہلول کے فرزند اکبر محمد علی کی شادی حضرت شیخ محمد حسین گیسودراز کے خلیفہ مجاز حضرت حسن بخت کی صاحبزادی زینت بیگم سے ہوئی جن کے بطن سے چار لڑکے تولد ہوئے- محمد الیاس، علی محمد، محمد امام اور فتح محمد، شادی کے بعد محمد علی گلبرگہ تشریف لے گئے اور دربار حیدر آباد سے منسلک ہو گئے- چنانچہ فتح محمد اور الیاس حیدر آباد دکن میں پیدا ہوئے اور اپنی والدہ ماجدہ کے ہمراہ اراکاٹ چلے گئے- نواب اراکاٹ کی ملازمت کے دوران فتح محمد یعنی شیخ بہلول دریائی کے پوتے کے ہاں شہباز خاں اور حیدر علی پیدا ہوئے- شہباز خاں فرزند اکبر تھے اور حیدر علی ان سے چھوٹے- حیدر علی نے ریاست میسور کی فوج میں شمولیت اختیار کی اور فاتح میسور ہوئے- سلطان ٹیپو اس فاتح حیدر علی کے بیٹے تھے- اس طرح ٹیپو سلطان کے دادا، بہلول دریائی کے پوتے تھے- یہ چار پشتوں کا سلسلہ کوئی اتنا دراز نہ تھا کہ سلطان فتح علی ٹیپو کے شوق شہادت کو متاثر کر سکتا- دریائے چناب کے پانی کا اثر کم از کم سات پشتوں تک جاتا ہے- اس لیے اسے چن آب یعنی آب مہتاب کہا جاتا ہے اور اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ چاند ہی سمندروں میں طوفان کا اصل سبب ہے- مدوجزر چاند ہی کی بدولت ظہور پذیر ہوتے ہیں-(۱۲۱)

مروان شاہ :

پنڈی بھٹیاں کے قریبی گاؤں جوگی جاکے (موجودہ صدیق آباد) میں ۱۱۰۰ ہجری کے لگ بھگ پیدا ہوئے۔ بچپن میں ہی والد کا انتقال ہو گیا اور اپنے خاندانی پیشہ محنت مزدوری کو اپنا لیا۔ کھیتوں میں پانی لگانا اور فصل کی کٹائی کرنا ان کی ذمہ داری تھی۔ سکھ زمیندار کے ہاں جب ملازم تھے تو اپنی ضعیف والدہ کو کندھوں پر بٹھا کر اپنے ساتھ کھیتوں میں لے جاتے اور ان کی خدمت کرتے۔ یہی ان کا معمول تھا۔ ایک دفعہ فصل کی کٹائی کا موسم تھا۔ گندم کے بھروٹے باندھ کر کندھوں پر اٹھا کر لے جا رہے تھے کہ اسی دوران دوسرے مزدور نے دیکھا کہ بھروٹہ سر سے اوپر خلا میں اٹھا ہوا ہے اور مروان شاہ با آسانی بھاری بھروٹے لے جا رہے ہیں۔ پھر دوسرا واقعہ یہ ہوا کہ شب برات فصلوں کو پانی دے رہے تھے کہ اچانک پانی دودھ بن گیا۔ آپ نے دودھ کو فوری طور پر پی لیا۔ ساتھ ہی اپنے ساتھ پیر بھنجن کو بھی پلایا۔ اس واقعہ کے بعد علاقے میں ان کی قدر کی جانے لگی۔ جب پنڈی بھٹیاں کے محمد یار بھٹی کو ان کے بارے میں علم ہوا تو یہاں لے آیا اور کھوکھراں والی کھوئی کی زمین ان کے حوالے کر دی۔ وہیں میاں مروان شاہ نے اپنی ماں کی خدمت جاری رکھی اور بالآخر ان کا انتقال ۱۱۶۵ ہجری کو ہو گیا۔ انتقال کے بعد ان کو ایک کنویں کے پاس دفن کیا گیا اور ان کا ایک چھوٹا سا مزار بھی میاں محمد یار بھٹی نے تعمیر کرایا۔ یہ کنواں اب بند ہو چکا ہے ان کا پرانا مزار معدوم ہو چکا ہے اور اب اس کی تعمیر نو کی گئی ہے۔ میاں مروان جو مسلم شیخ قوم سے تعلق رکھتے تھے کو بعض حضرات نے بعد ازاں مردان کے نام سے پکارنا شروع کر دیا۔ حقیقت میں ان کا نام مروان ہی ہے۔ ان کا عرس ہر سال ساون کی ۱۱ تاریخ کو ہوتا ہے۔ اب تک اس مزار کے حوالے سے یہ روایت رہی ہے کہ تنازعات کے فیصلے کے لیے بعض افراد یہاں آکر اپنی صفائی میں قسم اٹھاتے ہیں اور اس قسم کی تصدیق کے لیے مزار کے متولی باقاعدہ تحریر لکھ دیتے ہیں۔ (۱۲۲)

سخی ثابت شاہ :

تقریباً سوا دو سو سال قبل آپ نے تبلیغ اسلام کی خاطر یہاں جنگل میں کوٹ نکہ کے قریب ڈیرہ لگایا، ایک مسجد قائم کی اور راہگیروں کی سہولت کی خاطر کنواں کھدوایا۔ یہ کنواں آج بھی موجود ہے اور ان کے عقیدت مند بیماریوں سے شفا کے لیے اس کنویں کے پانی سے نہاتے ہیں۔ اس کے ساتھ پھل دار درخت لگوا کر یہاں ایک مہمان خانہ بھی بنوایا۔ جس میں لنگر عام ہوتا تھا۔ عصر سے لے کر عشاء تک دو نقارے بجائے جاتے تھے تاکہ جنگل میں بھٹکا ہوا کوئی مسافر یہاں پناہ لے سکے۔ ہندو سکھ مسلمان سب آپ کو عقیدت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ روایت ہے کہ پنجاب کے سکھ

حکمران راجہ رنجیت سنگھ پنجاب کا حکمران بنا تو اس نے ثامت شاہ کے علاقے کی جائیداد آپ کے نام کر دی۔ خود آپ کے ہاں چونکہ اولاد نہ تھی۔ اس لیے یہ جائیداد اپنے مرید مہتاب شاہ کو منتقل کر دی۔ اس کے بعد یہ مرید غلام نبی کو منتقل ہو گئی۔ اب یہ جائیداد اسی کی ملکیت ہے۔ یہ دونوں مرید بھی سخی ثامت شاہ کے مزار کے احاطے میں دفن ہیں۔ ان کے ساتھ ایک اور قبر بھی ہے جس کے متعلق بتایا جاتا ہے کہ اس میں سخی ثامت شاہ کی گھوڑی کو دفن کیا گیا تھا۔ یہاں ہر سال ۸-۹ محرم کو سخی ثامت شاہ کا عرس ہوتا ہے۔

خواجہ خضر سلطان قادری :

حضرت خواجہ خضر سلطان قادری جن کا مزار شریف موضع جلالپور کہنہ تحصیل پنڈی بھٹیاں میں مرجع خواص وعام ہے ایک باکمال صاحب کشف وکرامات ولی اللہ ہیں۔ آپ ملک عین الدین کے اکلوتے بیٹے جو قوم کے راجپوت کھچی تھے۔ گیارہویں صدی ہجری میں پیدا ہوئے۔ آپ کا وطن مالوف دریائے راوی کے نزدیک موضع پھنڈر متصل بلہ کھچیاں تھا۔ آپ کا سلسلہ عقیدت حضرت شیر شاہ شیر گڑھی سے تھا۔ والدین اور اہلیہ کی وفات کے بعد زندگی کو صوفیانہ رنگ میں ڈھال کر حضرت صاحب کرمانی کے ہاں بیعت ہو گئے اور عرصے تک خدمت مفوضہ میں مصروف رہے۔ بالآخر حضرت صاحب کرمانی کے حلقہ ارادت میں چلے گئے اور خضر جاٹ سے خضر سلطان بن گئے اور علاقہ نواحی شہر جلالپور میں اشاعت توحید ودین کے لیے مامور کیے گئے۔ لیکن یہاں آنے سے پہلے اپنے مرشد کی ہدایت کے مطابق ایک قافلہ کے ہمراہ حرمین شریفین پہنچے اور وہاں خانہ کعبہ اور روضہ رسول میں بارہ سال معتکف رہے اور بارہ حج کیے۔ اس کے بعد بغداد میں آکر غوث اعظم کے روضہ پر بارہ سال گزارے اور اس دوران ہر سال بالالتزام حج کے لیے حرمین شریفین میں حاضر ہوتے رہے۔ یہاں سے رخصت ہوئے تو جلالپور تشریف لے آئے اور رشد وہدایت کی تبلیغ میں مصروف ہو گئے۔ ہزاروں لوگ آپ سے فیض یاب ہوئے۔ اسی اثناء میں آپ اپنے جن دو بیٹوں کو اپنے بھائیوں کے پاس چھوڑ آئے تھے وہ بھی پوچھتے پوچھاتے آپ کے پاس آملے اور جب وفات کا وقت قریب آیا تو اپنے بڑے صاحبزادے محمد اکرم کو دستار خلافت بندھوا کر اپنا جانشین فرمایا۔ اب بھی ان کی اولاد آپ کے مزار شریف کی متولی ہے۔ آپ کا لنگر بہت وسیع تھا۔ مغلیہ حکومت کے دور میں لنگر کے لیے آپ کو ایک جاگیر ملی ہوئی تھی جو سکھوں کے عہد تک قائم رہی۔ بعد میں اس اراضی کا بہت سا حصہ انگریزوں کے عہد میں سرکاری تحویل میں چلا گیا۔ ہر سال آپ کے عقیدت مند یہاں آکر آپ کا عرس مناتے ہیں۔ (۱۲۳)

شیخ موسیٰ ڈڈ :

ان کے متعلق روایت ہے کہ بابا فرید شکر گنج کے ہمعصر تھے اور ان کے مریدوں میں شامل ہوتے تھے اور ایک مرتبہ حضرت فرید شکر گنج حج کو جانے لگے تو شیخ موسیٰ ڈڈ سے ساتھ چلنے کو کہا لیکن انہوں نے معذرت کر لی- حضرت فرید شکر گنج جب مکہ پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ موسیٰ ڈڈ وہاں موجود ہیں اور فرمایا کہ موسیٰ ڈڈ کس طرح یہاں پہنچ گیا- یہیں سے بابا فرید گنج شکر کے مریدین شیخ موسیٰ کو موسیٰ ڈڈ کے نام سے پکارنے لگے- درحقیقت ان کا تعلق لنگاہ قوم سے تھا اور شیخ کا لقب بزرگی کی وجہ سے ملا- بعد ازاں جلالپور کے علاقے میں آکر دین اسلام کی تبلیغ میں مصروف ہو گئے اور یہیں انتقال فرمایا- جلالپور کے موضع محمود پور میں مدفون ہیں- ٹھٹھہ شیخوں میں آباد لنگاہ قوم انہی کی اولاد ہے-

جھولن شاہ :

سائیں جھولن شاہ کا مزار پنڈی بھٹیاں کے قبرستان کے عین وسط میں واقع ہے- ان کا اصل وطن انبالہ تھا اور اعوان قوم سے تعلق رکھتے تھے- مغلیہ عہد میں پنڈی بھٹیاں آ گئے اور لوگوں کو روحانی فیض سے نوازتے رہے- ان کا عرس ہر سال بھادوں کی پہلی جمعرات کو ہوتا ہے-

سید محمد حیات شاہ بخاری :

دینی و روحانی شخصیت، دریائے چناب کے مغربی کنارے پر واقع گاؤں نواں کوٹ (ضلع سرگودھا) میں ۱۸۸۴ء میں ایک دینی گھرانے میں پیدا ہوئے- والد محترم سید احمد شاہ صاحب سے ابتدائی تعلیم مکمل کرنے کے بعد اپنے ماموں سید امیر شاہ صاحب کے ہاتھ بیعت ہوئے اور سلسلہ قادریہ میں داخل ہو گئے- اس کے بعد عطار انوالہ (پنڈی بھٹیاں) کے مولوی شمس دین سے دینی علوم سیکھے اور فن خطابت میں بھی دسترس حاصل کی- بعد ازاں حضرت پیر مہر علی شاہ صاحب گولڑہ شریف کے ہاتھ بیعت ہو گئے اور سلسلہ چشتیہ میں شامل ہوئے- کچھ عرصہ گولڑہ شریف میں رہ کر تصوف کے اسرار و رموز سے واقفیت حاصل کی اور پیر صاحب گولڑہ شریف کی طرف سے خلافت عطا ہونے پر واپس اپنے علاقے میں آکر دینی تعلیم کی تبلیغ اور ترویج کے لیے سرگرم عمل ہو گئے- جگہ جگہ جا کر اپنے زور خطابت سے اصلاح معاشرہ کی تلقین کرتے رہے- عمر بھر مسجد کو مرکز بنائے رکھا اور قرآن پاک کے سوا سات پاروں کی تلاوت روزانہ کا معمول تھا- آپ کی کرامات میں سے ایک مستند کرامت یہ ہے کہ ساون بھادوں کے موسم میں آپ دریائے چناب کی دوسری طرف جانے

کے لیے کشتی پر سوار ہونے لگے تو ماچھی قوم کے ایک شخص کو کشتی میں سوار دیکھ کر واپس مڑ آئے۔ یہ شخص آپ سے بلاوجہ مخاصمت رکھتا تھا۔ آپ نے اپنی گھوڑی کو چابک مار کر دریا میں ڈال دیا۔ دیکھتے ہی گھوڑی آسانی سے دریا پار کر کے دوسرے کنارے جا پہنچی۔

دینی خدمات کے ساتھ ساتھ تحریک پاکستان کے دوران بھی آپ کا کردار نمایاں تھا۔ اپنے خطبات میں مطالبہ پاکستان کی بھرپور طریقے سے وضاحت کرتے رہے۔ گوجرانوالہ، سرگودھا، جھنگ، فیصل آباد اور حافظ آباد کے اضلاع میں پھیلے ہوئے مریدین کے لیے ۱۹۴۶ء کے الیکشن کے دوران مسلم لیگ کے حق میں فتویٰ جاری کیا۔ ان پڑھ لوگوں کو قائل کرنے کے لیے آپ نے علاقے کے معروف پنجابی شاعر خان رانجھا کو بھی اپنے ساتھ رکھا جو اپنے مخصوص لہجے کی شاعری کے ذریعے لوگوں کو مسلم لیگ کو ووٹ دینے کی طرف مائل کرتا۔

آپ نے فروری ۱۹۴۹ء میں انتقال فرمایا اور موضع نواں کوٹ میں مدفون ہوئے۔ ایک سال بعد یہ علاقہ دریا برد ہوا تو آپ کے دو مریدوں سردار ہنجرا اور رحمت ولد زیادہ نے خرم چوہریڑہ (پنڈی بھٹیاں) میں پانچ کنال اراضی فراہم کر کے ان کا جسد خاکی یہاں لا کر دفن کیا۔ آپ کے بعد آپ کے فرزند پیر صالح شاہ مرحوم آپ کے جانشین بنے۔ آج کل ان کے گدی نشین سید شعیب شاہ نواز ہیں۔

سید نیامت علی شاہ:

جلالپور بھٹیاں میں مدفون ہیں۔ آپ کے متعلق روایت ہے کہ ہجرہ شاہ مقیم کے بزرگ نور شاہ صدر دین کی اولاد میں سے تھے اور والی قطب امام بیگم کوٹ لاہور کے برادر حقیقی ہیں۔ آپ کے متعلق تاریخ مخزن پنجاب کے مصنف مفتی غلام سرور نے لکھا کہ یہ بزرگ خدار سیدہ قوم کے بھٹی تھے۔ اب ان کی اولاد پانچ سو روپے سالانہ وجہ پنشن سرکار انگریز سے پاتی ہے۔ مصنف کی یہ رائے غلط ہے۔ در حقیقت یہ بزرگ سید خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اور تقریباً دو سوا دو سو سال قبل جلالپور میں تبلیغ کی غرض سے تشریف لائے تھے اور یہیں مقیم رہ کر دین اسلام کی خدمت کرتے رہے۔ تقریباً ۹۰ سال کی عمر میں انتقال فرمایا اور قصبہ جلالپور میں ہی مدفون ہوئے۔ ان کی اولاد ان کے مزار کے قرب میں ہی آباد ہے اور سید میراں نواز جانشین ہیں۔ ہر سال ۵ اہاڑ کو ان کے عرس کا میلہ ہوتا ہے۔

بابا گہنے شاہ:

چک نمبر ۱۱ ہمیر وکا و لگن میں پیدا ہوئے۔ پکی ڈال پاڑ لکھن (پنڈی بھٹیاں) میں ان کا مزار ہے۔ آپ وہاں پنج رکنی کمیٹی پنچائیت عامہ کے منتخب اور اعلیٰ رکن تھے۔ لوگ آپ کے عدل و انصاف

پر مبنی مقدمات عامہ کے فیصلہ جات کی شہرت سن کر دور دراز کے علاقوں سے آتے اور آپ کو حکم بنا کر اپنے مقدمات کے فیصلے کرواتے۔بدیں وجہ آپ چوہدری کے لقب سے یاد کئے جاتے۔بابا نظام شاہ (صد قانہ) سے بیعت ہوئے اور سلسلہ طریقت میں شامل تھے۔کثیر التعداد لوگوں کو حلقہ ارادت میں منسلک کیا۔یہ اس علاقے کے سلسلہ ملنگ کے مرشد تھے۔آخری عمر میں معذور ہو گئے تو مرید آپ کو پالکی میں بٹھا کر لے جاتے اور ملنگوں کی ایک جماعت دھمال ڈالتی ہوئی ساتھ روانہ ہوتی۔یہ عجیب دلفریب منظر ہوتا تھا۔

بابامالن شاہ :

معروف ملنگ۔ موضع دلواں شریف (پنڈی بھٹیاں) میں درمیانے درجے کے زمیندار بابا نتھوال کے ہاں ۱۸۷۰ء کے لگ بھگ پیدا ہوئے۔ علاقہ دریابرد ہوا تو انگریز سرکار نے موضع ہمیروکی (سانگلہ ہل اور مڑھ بلوچاں کے درمیان) متبادل رقبہ دے کر وہاں آباد کیا۔بابامالن بچپن سے ہی صوم و صلوۃ کے پابند اور سخاوت کے شوقین تھے۔ پنجابی شاعری کی صنف ڈھولا میں بھی خاص دلچسپی تھی۔برادری میں شادی کی اور دو لڑکے محمد حسین اور سوہن محمد شاہ اور ایک لڑکی دولت بی بی پیدا ہوئے۔بابا گہنے شاہ کے ہاتھوں بیعت ہوئے اور دنیاوی زمیندارہ اور امیرانہ لباس اتار کر نوشاہی لباس زیب تن کر لیا۔کم خوری، کم گوئی اور کم خوابی کی ریاضت کی اور دونوں ہاتھوں میں کنگن، پاؤں میں لکڑی کی چپل (کھڑانواں اور گھنگھرو پہن کر کافئے پڑھتے اور رقص کرتے سیاحت کو نکل کھڑے ہوئے۔برصغیر کے کئی علاقوں میں قیام کیا اور مجاہدہ کرتے رہے۔واپس آئے تو مستئی عشق کی کیفیت شدید ہو چکی تھی۔بس سوٹی اور لنگوٹی پر اکتفا کیا اور چار ابرو تراشہ کروا کر گھر میں مچ لگا کر بیٹھ گئے۔کچھ عرصہ بعد لاہور چلے گئے اور ہائیکورٹ کے باہر قیام پذیر ہوئے پھر یہاں سے اٹھ کر میانی صاحب جا کر قیام کیا۔وہاں سے آکر چنیوٹ کی پہاڑی کی چوٹی پر مقیم رہے۔وہاں سے پنڈی بھٹیاں کے نواح میں دلی دربار بیٹھک لگائی اور بھٹی قوم کے زمینداروں نے یہ جگہ ان کو نذرانے کے طور پر دے دی۔اسی طرح پاک پتن، جھنگ، ساہیوال سے ہوتے ہوئے لڈن (ضلع وہاڑی) جا پہنچے۔وہیں ۳۱ دسمبر ۱۹۴۱ء کو ان انتقال ہو گیا۔لڈن سے میت لا کر موضع ہمیروکی میں دفن کیا گیا۔برصغیر میں واحد ملنگ بزرگ ہیں جن کا سال کے ہر دن یعنی سال میں ۳۶۵ دن کسی نہ کسی جگہ میلہ لگتا ہے۔یہ میلہ یا عرس وہاں وہاں ہوتا ہے جہاں جہاں سائیں مالن نے بیٹھک کی تھی۔لڈن (ضلع وہاڑی) میں ان کا عرس ۱۲۔۱۳ پوہ کو اور ہمیروکی (پنڈی بھٹیاں) میں عرس ۲۷۔۲۸ پوہ کو ہوتا ہے۔ان کے مرید پورے پاکستان میں جگہ جگہ پھیلے ہوئے ہیں اور تارک الدنیا ہو کر رہبانیت کی

زندگی بسر کر رہے ہیں- خود ہمیر وکی میں ان کے جانشین تو پر تعیش زندگی گزار رہے ہیں اور سائیں مالن کے ملنگوں سے اپنی زمینوں پر خوب کام کرواتے ہیں- ان جانشینوں نے سائیں مالن کے مزار کے احاطے کے اندر ایک درخت پر یہ لکھوار کھا ہے کہ "یہ جنتی درخت ہے اور اس کے نیچے سے گزرنے والا سیدھا جنت میں جائے گا-" اس ارزاں جنت کے حصول کے لیے آنے والوں کو جنت ملے یا نہ ملے لیکن ان کے پیش کئے ہوئے نذرانے جانشینوں کی دنیاوی زندگیوں کو ضرور جنت بنا دیتے ہیں-

دلی دربار :

سائیں مالن کے ایک پیروکار سائیں مستان نے پنڈی بھٹیاں کے نواح میں دلی دربار کو مسکن بنایا- یہ وہی جگہ تھی جہاں سائیں مالن نے بیٹھک کی تھی- سائیں مستان نے تمام عمر لنگوٹ میں گزار دی اور ۶۰ سال تک بال کٹوائے اور نہ نہایا- ان کے بالوں کی لمبائی ساڑھے نو فٹ تھی- انگریزی دور حکومت میں ان ملنگوں کو ریل کا مفت سفر کرنے کی اجازت تھی- اسی روایت کے تحت آج بھی اس علاقے کے ریلوے کارندے ان سے ٹکٹ طلب نہیں کرتے- اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ ملنگوں کے مرشد سائیں مالن کو ایک دفعہ سانگلہ ریلوے سٹیشن پر مفت سفر کرنے سے روکا گیا تو ریل آگے نہ چل سکی- ریلوے ملازموں نے سائیں مالن سے معافی طلب کی تو گاڑی چلی- اس پر آئندہ کے لیے ان کے لیے سفر مفت کر دیا گیا- سائیں مستان کے ڈیرہ کو دلی دربار اس وجہ سے کہا جاتا ہے کہ یہ ملنگوں کا شاہی مقام ہے- یہاں یہ گزشتہ ۹۰ سال سے وہ آگ مسلسل جلائی جارہی ہے جسے سائیں مالن نے اپنی بیٹھک کے دوران جلایا تھا- یہاں ملنگ بھنگ پیتے ہوئے اس آگ کی راکھ کو اپنے گنجے سروں اور منہ پر ملتے جاتے ہیں اور اپنے خاص مکتبہ فکر کا اظہار کرتے جاتے ہیں- سائیں مستان کا انتقال چند برس قبل ہی تقریباً سوا سو سال کی عمر میں ہوا تھا- یہاں اس کا میلہ ہر سال ساون کے مہینے میں لگتا ہے-

سلسلہ مجذوبیت اور فقیر :

اولیاء کرام کے علاوہ کچھ مجذوب شخصیات کا ذکر بھی ضروری ہے جن کو یہاں کے لوگ بڑی عقیدت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں- ان میں سے سب سے پہلے سائیں مو تھے- جن کے متعلق روایت ہے کہ وہ بیک وقت ایک سے زیادہ جگہ دیکھے جاتے- اصل میں یہ لاہور کے بھاٹی دروازے کے رہنے والے تھے- ان کے جانے کے بعد قصبہ پنڈی بھٹیاں میں مائی پٹھانی آئیں- وہ شہر میں کم تو لنے

والوں پر نظر رکھتی تھیں اور انہیں کوستی تھیں- یہ یہاں سے روزانہ ہوئیں تو سائیں شمس آ گئے- سیلاب ۱۹۷۳ء کے دوران وہ بغیر کچھ کھائے پیئے بغیر چار پانچ روز لاری اڈے پر پانی میں گھرے رہے-وہ جھنگ سے اٹھ کر یہاں آئے تھے لیکن ان کا یہیں انتقال ہو گیا اور ٹاؤن کمیٹی کے عقب میں دفن ہوئے- یہاں ان فقیروں کا ذکر بھی ضروری ہے جن کے نام کھوئیاں (چاہ) قصبہ پنڈی بھٹیاں کے چاروں طرف پھیلی ہوئی ہیں- تقریباً دو اڑھائی سو برس قبل جب قصبہ کے چار. . طرف فصیل تھی تو بھٹی قبیلہ نے ان فقیروں کو شہر کے چاروں اطراف اپنی زمینوں پر ا . . بٹھا تا کہ ایک تو وہ ارد گرد کے حالات پر نظر رکھیں دوسرا دیر سے آنے والے مہمانوں کو اپنے ہاں قیام کے لیے ٹھہرائیں- یہ فقیر اور ان کی کھوئیاں آج بھی دھاتو شاہ، معنی شاہ، چاندی شاہ، راجھو شاہ کے ناموں سے مشہور ہیں اور ان کی اولادیں ان کھوئیوں کی مالک ہیں- دھاتو شاہ سیال زمیندار تھے اور چنیوٹ کے پیر اسماعیل شیخ کے مرید تھے- جبکہ راجھو شاہ سید تھے اور مغل دور میں ان کا انتقال ہوا تھا- جبکہ معنی اور چاندی شاہ کے فقیر کھرل قوم کے فرد تھے-

☆☆☆

شخصیات

دلا بھٹی :

دلا بھٹی جس کا اصل نام عبداللہ تھا۔سرزمین پنجاب کے لوگوں کے لیے ہمیشہ جرات مندی بہادری اور شہ زوری کی علامت رہا ہے، کیونکہ وہ پنجاب کا ایک ایسا کردار تھا جس نے حاکم وقت سے ٹکر لی اور سرکشی کی۔وہ اس مقصدی تحریک کا بھی حصہ تھا جس کا آغاز حضرت مجدد الف ثانی نے اکبر کے دین الٰہی کے خلاف کیا تھا۔ دلا بھٹی کو اس تحریک میں شامل ہونے کا جذبہ ورثے میں ملا تھا۔

جب ۱۵۴۷ء کو پنڈی بھٹیاں سے چند کوس دور دریائے چناب کے کنارے چوچک کے مقام پر (جہاں اب لاہور اسلام آباد موٹروے تعمیر ہو چکی ہے) دلا بھٹی کی پیدائش ہوئی تو اس کی دایا نے بچے کے جسم پر ایک نشان دیکھا اور دلے کی والدہ مائی لدھی کو بتایا کہ یہ بچہ تاریخ میں اپنا نام پیدا کرے گا اور بہت بہادر اور نڈر ہوگا۔ چنانچہ تاریخ نے ثابت کیا کہ دلا بھٹی مزاج اکبر کے خلاف وسطی پنجاب سے اٹھنے والی ایک خوفناک آواز بن کے سامنے آیا۔ایک اور روایت کے مطابق جب دلا بھٹی ہوا تھا تو سان چڑھی تلوار کا پانی دھو کر اس کے لبوں سے لگایا گیا تھا۔ جب وہ جوان ہوا تو پرتھاجٹ، داوو خان ڈوگر، جمال خان، کمال خان، سرمچو چوڑا، کلا ہر والا، ٹلا مراثی، دولا کولا، کھابنا وزیر اس کے قریبی ساتھی تھے اور انہی کے ساتھ اس کی محفلیں گرم رہتیں۔ دلا بھٹی کی مغلوں کے ساتھ لڑائیوں کا تفصیلی تذکرہ تو پچھلے صفحات میں ہو چکا ہے۔ان لڑائیوں سے قطع نظر دلا بھٹی کی جوانمردی اور بہادری کی کئی داستانیں آج بھی اس کے نام کی طرح زندہ ہیں۔ان داستانوں میں ایک داستان یہ بھی ہے کہ جب ابتدائی محاذ آرائیوں میں کئی بار مغل فوج نے دلے کو اسیر بنالیا۔ تو دلی میں تو وہ ٹکے دینے کا وعدہ کر لیتا مگر اپنے علاقہ میں آکر منکر ہو جاتا۔اکبر اعظم کو معلوم ہوا تو اس نے حکم دیا کہ اب کی بار جب دلے کو اس کے روبرو لایا جائے تو دلا بار کی مٹی بھی ساتھ ہو۔ حکم کی تعمیل کی گئی۔ مٹی کو پہلے زمین پر بکھیر دیا گیا اور دلا بھٹی کو بعد میں بلا کر اس مٹی پر کھڑا کر دیا گیا۔اکبر نے پوچھا تم ٹکے ادا کرو گے ؟ دلے نے صاف صاف انکار کر دیا تب شہنشاہ اکبر نے حکم دیا کہ دلے کو رہا کر دو۔ اس کا کوئی قصور نہیں ہے۔" یہ مٹی ہی ایسی ہے۔"

دلا بھٹی پھر بھی اکبر کا باغی رہا۔بالاخر اسے کئی موقعوں کے بعد گرفتار کر کے ۴۲ سال کی عمر میں دہلی دروازے کے باہر محلہ نخاس نولکھا بازار میں اکبر کے حکم کے تحت سرعام تختہ دار پر کھینچ دیا گیا۔اس منظر کو دیکھنے والوں میں حضرت شاہ حسین صاحب منزلت ہستی بھی تھے۔اس کی جانثاری

کو اس کے عہد نے بھی نظر انداز کیا اور نہ ہی بعد کے زمانے اسے بھلا سکے ہیں کیونکہ اس نے ایک نئی طرز کے عوامی فلاحی نظام "لوک راج" کو متعارف کروایا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ چار صدیاں گزرنے کے باوجود لوگ اسے یاد کرتے ہیں۔ آج تک اس کا نام ظلم کے خلاف ایک نمونہ ہے اور وہ پنجاب کے غیور عوام کے اذہان میں روز روشن کی طرح واضح ہے۔ کچھ عرصہ قبل دلا بھٹی کی قبر میانی قبرستان لاہور میں دریافت کی گئی جس کی تربت پر ایک لوح ۱۹۴۳ء کی نصب کردہ تھی۔ اس کی عبارت کچھ یوں ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بہادر دلا بھٹی ولد فرید خاں بھٹی

سکنہ پنڈی بھٹیاں

محمد بخش بھٹی دل شیر مائی ولد نبی بخش بھٹی

ولد گلاب خاں ڈسٹرکٹ راولپنڈی مرید تارہند گی

اس نے اپنی دولت سے بنایا ہے کسی سے چندہ وغیرہ نہیں لیا ۱۹۴۳ء

بہر حال وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ یہ دلا بھٹی ہی کی قبر ہے کیونکہ ایک شاہی باغی کو پھانسی کے بعد اس طرح کے عوامی قبرستان میں دفن کرنے کی روایت تاریخ میں کم ہی ملتی ہے۔ دلے کی اولاد کے متعلق بھی مختلف آراء ہیں۔ کچھ کے خیال میں وہ لاولد تھا اور کچھ اس کی اولاد ہونے کے دعویدار ہیں۔ ان میں موضع دلے کی کے بھٹی خاص طور پر قابل ذکر ہیں جو دلا بھٹی کی اولاد ہونے کے مدعی ہیں۔ وہ اس کے ثبوت میں درج ذیل شجرہ نسب پیش کرتے ہیں۔

بھٹی	دوسر	گھناج	جگ پال	سنگھر	بجلی	پیر محمد	مراد
جگ	نیرد	اوددو	چھن	مانگھر	فرید	کریم بخش	یتیم
ریل	من	مکھرا	پرم	گوندھ	دلا	مہند	
بیاس	جونیر	چوڑ	بھونی	دراج	جہاں خاں	مستی	
تنو	انچل	دھنگ	کوڑاپاڑ	نتھو	محبت خان	خیر	

نواب سعد اللہ خاں :

مغل بادشاہ شاہجہاں کے چہیتے وزاعظم نواب سعد اللہ خاں کا تعلق علاقہ "دلے دی بار" سے تھا- وہ پنڈی بھٹیاں چنیوٹ روڈ پر واقع گاؤں پترا کی میں ۱۶۰۹ء کے آس پاس پیدا ہوئے- ان کی پیدائش کے متعلق ایک مشہور روایت ہے کہ ان کی پیدائش کے وقت ان کی والدہ نے ولایتی انار کی طلب کی- جو غربت کی وجہ سے نواب سعد اللہ خاں کے والد امیر بخش کے لیے مشکل بات تھی- لیکن اس کی عورت نے کہا کہ میرے کان کی بالیاں نقرہ پانچ روپیہ کی ہیں- تم اس کو لے جاؤ اور فروخت کر کے انار لے آؤ- اتفاقاً انہی دنوں سوداگران میوہ فروش، کابلی، ادھر آ گزرے وہ ڈالی انار وانگور کی بحضور شاہ دہلی لے جاتے تھے- امیر بخش نے سوداگران سے کابلی انار کی فرمائش کی اور حال سنایا- سوداگر قیافہ شناس تھا- دریافت کر گیا کہ ضرور اس عورت کے شکم میں فرزند اقبال مند ہے- یہ سوچ کر انار امیر بخش کو دے دیے اور کہا کہ یہ جو ابھی سے قندھاری انار مانگتا ہے بڑا نام پیدا کرے گا-

سوداگر کی یہ پیش گوئی درست ثابت ہوئی اور غربت وافلاس میں تحصیل علم میں مشغول رہنے والا سعد اللہ خاں ترقی کرتے کرتے بالآخر مغل بادشاہ شاہجہاں کے دربار میں جا پہنچا اور عرض مکرر، داروغہ دولت خانہ اور دیوان کے عہدوں سے ہوتا ہوا وزیر اعظم کے اہم ترین مقام پر جا فائز ہوا- یہ مقام اسے اس کے علمی و عقلی کمالات کی بدولت حاصل ہوا تھا- ایک دانا اور دانش مند وزیر کی حیثیت سے اس نے مغلیہ سلطنت کو بے پناہ ترقی دی- یہی وجہ ہے کہ شاہجہاں اس پر بے حد اعتماد کرتا تھا- وہ نہ صرف صاحب قلم تھا بلکہ صاحب تلوار بھی تھا- قندھار اور بلخ کی فوجی مہموں میں شہزادہ اورنگ زیب کے ساتھ فوج کی قیادت کی- اس کو تعمیرات کا بھی شوق تھا- جامع مسجد دہلی کے علاوہ اکبر آبادی مسجد، سعد آباد اور شاہی مسجد چنیوٹ تعمیر کرائیں- رنگ محل لاہور کے ساتھ ساتھ دو شاندار حویلیاں بھی اس کے ذوق کی نشانیاں تھیں-

سعد اللہ کو قولنج کا عارضہ تھا- اسی بیماری میں ۱۰۶۶ ہجری میں انتقال ہوا- اس کے انتقال کے بعد اس کی اولاد بھی معزز مناصب پر فائز رہی-

حکیم میاں عمر الدین :

حکیم میاں عمر الدین جنجوعہ صاحب علم و دانش تھے- ان کو مختلف علوم پر بیک وقت عبور حاصل تھا- وہ علم صرف، نحو، علم ہئیات، علم ہندسہ، علم طب، علم نجوم اور علم قیافہ میں کافی دسترس رکھتے تھے- ۱۸۲۰ء کے قریب ریاست فرید کوٹ میں حکیم محمد بخش کے ہاں پیدا ہوئے جو فرید کوٹ کے حکمران راجہ گلاب سنگھ کے طبیب تھے- حکیم محمد بخش نے اپنے بیٹے کو ابتدائی تعلیم فرید کوٹ

میں ہی دلائی- فارسی اور عربی کے وہ خود عالم تھے-۱۸۲۶ء میں گلاب سنگھ کے بیٹے اتار سنگھ نے اپنے باپ کو قتل کر دیا اور خود ریاست کی حکمرانی سنبھال لی اور حکیم محمد بخش کو ان کی خدمات کے صلے میں سرکاری طبیب کے عہدے پر برقرار رکھا- لیکن حکیم محمد بخش نے یہ کہہ کر اپنا سرکاری منصب واپس کر دیا کہ جو شخص اپنے باپ کا وفادار نہیں ہو سکتا اس کے ساتھ وفاداری کیوں کر ہو سکتی ہے- خود اتار سنگھ ایک برس بعد ہی مر گیا- حکیم عمر الدین اپنے والد محترم کے ساتھ مزید کچھ عرصہ ریاست فرید کوٹ میں رہے اور مختلف علوم سیکھے- منشی، فاضل کرنے کے بعد وہ الہ آباد چلے گئے اور ۱۸۴۰ء کی دہائی کے عرصے میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت اختیار کر لی وہ الہ آباد کی دیوانی کچہری میں ریذیڈنٹ بنجمن ٹیلر کے ساتھ وابستہ تھے -بعد ازاں جب دیوانی الہ آباد سے اکبر آباد منتقل ہو گئی تو میاں عمر الدین بھی اس کے ساتھ اکبر آباد منتقل ہو گئے -اس دوران صوبہ شمال مغربی کے لیفٹیننٹ گورنر جیمز تھامس نے بنجمن ٹیلر کی وساطت سے میاں عمر الدین کو اردو کی ایک انشاء تحریر کرنے کی فرمائش کی -اس فرمائش پر آپ نے اردو کی ایک انشاء بہار بے خزاں کے نام سے تحریر کر کے اس کے دو نسخے تیار کئے -ایک لیفٹیننٹ گورنر جیمز تھامسن کو بھیج دیا اور دوسرا خود اپنے پاس رکھ لیا- یہ قلمی نسخہ آج بھی ان کے پڑپوتے حکیم صفدر ساقی کے پاس محفوظ ہے-

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے وقت آپ اکبر آباد میں موجود تھے اور اس جنگ کے واقعات آپ کی آنکھوں کے سامنے واقع ہوئے تھے- چنانچہ ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت چھوڑ کر پنجاب کی طرف آ گئے - یہاں ہرن پور (ضلع جہلم) میں قیام کیا- کچھ عرصہ بعد ہی دریائے جہلم سے اٹھ کر دریائے چناب کے کنارے پنڈی بھٹیاں آباد ہو گئے -اس وقت تک پنجاب مکمل طور پر انگریزوں کے قبضے میں آ چکا تھا اور نئی انگریزی اصلاحات کے نتیجے میں پنڈی بھٹیاں میں سرکاری مدرسہ بھی قائم ہو چکا تھا- میاں عمر الدین اس مدرسہ کے پہلے ہیڈ ماسٹر مقرر ہوئے- یہاں انہوں نے علم کی کرنوں کو منور کیا اور مسیحائے ثانی کے لقب سے بھی ملقب ہوئے -انہوں نے کئی کتابیں بھی تحریر کیں -ان میں (۱) علم طب سے متعلق کتاب دسمبر ۱۸۷۸ء کو مکمل کی -(۲) علم رمل پر ۱۸۷۸ء (۳) علم نجوم (۴) کتاب حکمت ۱۲۷۱ ہجری)(۵) اور موسیقی کے موضوع پر کتاب شامل ہیں- ان تمام کتابوں کے قلمی نسخے ان کی اولاد (حکیم صفدر ساقی) کے پاس محفوظ ہیں- میاں عمر الدین کے فرزند حکیم علی احمد اور پوتے حکیم دوست محمد بھی اپنے وقت کے بہترین طبیب اور علم دوست شخصیتیں تھیں- ان کے پڑپوتے حکیم صفدر ساقی بھی ایک اچھے شاعر کی حیثیت سے ان کے ورثے کے امین ہیں-(۱۲۵)

میاں محمد دین :

آپ پنجابی کے مشہور شاعر اور عالم دین تھے-۱۸۴۰ء کے لگ بھگ پنڈی بھٹیاں کے موضع کوٹ بدر دین المعروف بھنبے میں بھٹی قوم میں پیدا ہوئے- حکیم بدر دین کی شاگردی میں مختلف علوم پر دسترس حاصل کی اور طب کا پیشہ اختیار کیا-اعلی پائے کے خطیب بھی تھے اور پنڈی بھٹیاں کی شاہی جامع مسجد میں کچھ عرصہ خطابت کرتے رہے-یہیں ایک معروف طوائف مائی عمر جان سے دوسری شادی کی اور اسے راہ حق پر لگایا-مائی عمر جان نے مرنے سے پہلے مسجد سے ملحقہ اپنا مکان مسجد کے نام کر دیا تھا-میاں محمد دین نے پنجابی شاعری میں بڑا نام پیدا کیا-آپ کا سب سے اہم کارنامہ قرآن کی سورۃ مزمل کی پنجابی زبان میں منظوم تفسیر ہے-آپ کی یہ کاوش ۱۳۲۵ ہجری میں نور مکمل کے نام سے شائع ہوئی-یہ تفسیر علم و حکمت کا وہ شاہکار ہے جس پر پنجابی ادب ہمیشہ فخر کرتا رہے گا-اس تفسیر میں آپ نے بہت سے قرآنی موضوعات اور ایمانی مسائل کو بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے- یہ تفسیر آپ کے جذبہ ایمانی اور شاعرانہ صلاحیتوں کا منہ بولتا ثبوت ہے-آپ حضرت سلطان باہو کے بڑے مقلد تھے-چنانچہ ان کے فارسی دیوان کا پنجابی منظوم ترجمہ کر کے شرح دیوان باہو کے نام سے شائع کرایا- پنجاب کی لوک داستانوں پر بھی طبع آزمائی کی اور قصہ مرزا صاحباں لکھ کر بڑی شہرت پائی-اس کے علاوہ تصوف، طب اور علم ہندسہ میں بھی کئی کتابیں تحریر کیں-تصوف پر آپ کی کتابیں چرخہ حقانی، کافی دل صافی، فراق محمد، جنگ نامہ، پنج گنج محمدی اور نکتہ وحدت ہیں-ان کتابوں میں اپنے صوفیانہ کلام کے ذریعے دنیا کی بے ثباتی اور آخرت کی فکر کی طرف توجہ مبذول کرائی-میاں محمد دین شاعری کے ساتھ ساتھ موسیقی کے اسرار و رموز سے بھی مکمل طور پر واقف تھے-شاعری اور موسیقی کا یہ شوق آج بھی ان کے پوتے محمد یعقوب اور عبدالغفور زندہ رکھے ہوئے ہیں-مولوی محمد دین نے ۴ اسوج ۱۹۲۶ء میں وفات پائی اور اپنے گاؤں بدر دین (بھنبے) میں مدفون ہوئے-اس تاریخ کو ہر سال ان کا عرس منایا جاتا ہے-(۱۲۶)

ڈاکٹر عزیز علی :

پنڈی بھٹیاں کے ایک ہندو خاندان میں پیدا ہوئے-بچپن ہی سے آزاد منش اور باغیانہ سرشت کے مالک تھے-ان کی پیدائش پر ہندو پنڈتوں نے جو جنم پتری بنائی اس کے مطابق نو مولود پر تھمی لال کے مقدر میں "ناستک" یعنی مذہب سے باغی ہونا لکھا تھا-شاید یہ قبولیت کی گھڑی تھی کہ ڈاکٹر صاحب سن بلوغت کو پہنچے تو طبیعت بت پرستی سے بے زار ہو کر دین اسلام کی طرف راغب ہونے لگی بالآخر ایک روز بت کدے سے منہ موڑ لیا اور حرم کی راہ پر چل دیئے-ان کے اہل خانہ اور عزیز

اقارب کو پرتھمی لال کی یہ جسارت پسند نہ آئی اور ان کا سماجی مقاطعہ شروع کر دیا۔ اپنے بیگانے ہو گئے اور بیگانوں نے دشمنی اختیار کر لی۔ حالات اس قدر دگر دوں ہوئے کہ انھیں اپنے گھر بار کو الوداع کہنا پڑا اور یوں حقیقت کی جستجو نے ان کا رشتہ ایک دائمی آزمائش سے جوڑ دیا۔

پنڈی بھٹیاں سے ہجرت کرنے کے بعد ڈاکٹر عزیز علی کچھ عرصہ سادات رجوعہ کی پناہ میں رہے اور پھر چنیوٹ میں سکونت اختیار کر لی۔ یہاں بھی ہندو سماج کی طرف طعن و تشنیع اور صعوبتوں کا سلسلہ بند نہ ہوا تو انھوں نے سرگودھا کا انتخاب کیا اور جنوری ۱۹۳۷ء میں وہاں سے ماہنامہ یاد خدا کا آغاز کر دیا۔ لیکن چھ سات ماہ بعد پھر چنیوٹ آ گئے اور اب "یاد خدا" بھی یہاں سے جاری ہونے لگا۔ اپنی جرات اور حق گوئی کی بدولت بہت جلد اس جریدہ کو مسلم حقوق کے علمبردار کا مقام حاصل ہو گیا۔ انھوں نے ناانصافیوں کے خلاف بھی آواز بلند کی اور اس کی پاداش میں قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں۔ تحریک پاکستان کا آغاز ہوا تو آپ کے اخبار نے اس تحریک کو جلا بخشنے میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ قیام پاکستان کے بعد یاد خدا کی اشاعت کا سلسلہ منقطع کر کے خود کو اصلاحی تحریکوں کے لیے وقف کر دیا۔ ۱۹۵۰ء میں ڈاکٹر عزیز علی نے ایک اور رسالے ہفتہ روزہ "نقاد" کا اجراء کیا۔ ڈاکٹر عزیز علی اپنی تگ و دو کے باوجود علاقے کی علمی، سماجی اور سیاسی زندگی میں کوئی بڑی تبدیلی یا انقلاب تو نہ لا سکے تاہم انقلاب کی صدا ان کر در و دیوار پر دستک ضرور دیتے رہے۔ (۱۲۷)

قاضی محمد عالم نظامی :

آپ قصبہ جلالپور بھٹیاں میں مارچ ۱۸۹۷ء میں یہاں کے مشہور علمی قاضی خانوادے میں پیدا ہوئے۔ شروع سے تصوف کی طرف مائل تھے۔ آپ کا شمار اپنے زمانے کے ان لوگوں میں ہوتا تھا جنھوں نے اپنے دلوں کو جذبہ ایمانی سے مالا مال کر لیا تھا اور دنیاوی زندگی ان کے لیے بے مقصد تھی۔ آپ کے کلام میں نسے اسوہ حسنہ بحر طویل، نماز، شان درود، پکی روٹی، انجام غصہ، راج مائی، فاطمہ توبہ نامہ اور پنجابی کلام تصویر شبیر مشہور ہیں۔ آپ نے بڑی سادہ زندگی بسر کی اور اکتوبر ۱۹۸۰ء کو وفات پائی۔

حیرت جلالپوری :

آپ کا نام غلام نبی اور تخلص حیرت ہے۔ اپنے کلوتے لڑکے ڈاکٹر محمد سعید کی نسبت سے کنیت ابو سعید ہے۔ ۱۵ مارچ ۱۹۰۹ء کو جلالپور بھٹیاں میں میاں عزیز احمد کے ہاں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم پنڈی بھٹیاں سے، مڈل ڈی بی مڈل سکول حافظ آباد سے اور میٹرک آریہ سماج ہائی سکول حافظ

آباد سے پاس کیا۔بعد میں معلّمی کے پیشہ سے منسلک ہو گئے۔اس کے بعد اسلامیہ کالج لاہور سے ایف ایس سی کی تعلیم مکمل کی اور بی۔ایچ۔کیو دہلی میں ملازمت اختیار کرلی۔قیام پاکستان کے وقت دہلی سے راولپنڈی منتقل ہو گئے۔مگر سیاسی وجوہ کی بنا پر انھیں نہ صرف ملازمت سے سبکدوش کر دیا گیابلکہ تعمیر کے لیے دیا گیا پلاٹ بھی واپس لے لیا گیا۔اس کے بعد آپ نے اصلاح ہائی سکول چنیوٹ میں بطور سائنس ٹیچر ملازمت اختیار کرلی اور وہاں سے الاصلاح رسالہ بھی جاری کیا۔اس طرح ان کی شخصیت اپنی خداداد صلاحیتوں کے باوصف ادب و سائنس کا سنگم رہی۔آپ نے ایک ادبی رسالہ ''طلوع سحر'' بھی جاری کیااور مدرسۃ بنات کے نام سے لڑکیوں کے سکول کے اجراء میں بھی اہم کردار ادا کیا۔چنیوٹ کی ادبی تقریبات میں شرکت کی وجہ سے انھیں شاعر چنیوٹ کا خطاب دیا گیااور جلالپور میں تعلیمی خدمات کے سلسلے میں بجا طور پر جلالپور کے سرسید کہلانے کے حقدار ہیں۔آپ کی تصانیف میں اعجاز نطق، حریم خیال، نقوش فکر اور سپید گل شامل ہیں۔علاوہ ازیں شمشیر قلم کے نام سے ان کا ایک شعری مجموعہ بھی شائع ہوا۔ان کا انتقال ۷ نومبر ۱۹۹۰ء میں ۸۱ سال کی عمر میں ہوااور جلالپور بھٹیاں میں دفن ہوئے۔(۱۲۸)

خلیفہ سراج الدین :

جلالپور کہنہ (تحصیل پنڈی بھٹیاں) کی علمی وادبی شخصیت خلیفہ سراج الدین ۱۸۹۵ء کے لگ بھگ فضل الٰہی کھچی کے ہاں پیدا ہوئے۔معلّمی کے پیشے سے منسلک رہے۔وہ ایک قابل اور محنتی معلم اور منشی تھے۔عربی اور فارسی زبانوں اور بالخصوص علم عروض پر انھیں ید طولیٰ حاصل تھا۔نہایت ہی مخلص دیانتدار اور خدا پرست شخصیت تھے۔ادبی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ علاقے کی سماجی وسیاسی سرگرمیوں میں بھی پیش پیش تھے۔یہاں ۱۹۱۰ء میں قائم ہونے والی مسلمانوں کی واحد سماجی تنظیم انجمن اشاعت اسلام سے وابستہ رہے۔بعد ازاں تحریک پاکستان کے دنوں میں مسلم لیگ نیشنل گارڈ کے سالار کی حیثیت سے اہم خدمات انجام دیں۔ان کے علمی نسخوں میں سراج البلاغتہ، لمحات فکریہ اور سراج السالکین جو ۱۹۳۱ء میں تحریر ہوا قابل ذکر ہیں۔خلیفہ سراج الدین نے ۲۴ اکتوبر ۱۹۷۰ء کو وفات پائی اور جلالپور کہنہ میں دفن ہوئے۔

جیون پرکاش جیون :

پنجابی، ہندی اور اردو کے انقلابی شاعر اور سیاسی کارکن ۲۵ نومبر ۱۹۱۸ء کو پنڈی بھٹیاں میں پیدا ہوئے۔بچپن میں ہی والد کا انتقال ہو گیا اور ان کی پرورش کا سارا بوجھ والدہ محترمہ شریمتی

بھانواں دیوی گاندھی کے کندھوں پر آن پڑا- اس طرح جیون کو بچپن سے ہی زندگی کے لیے جدوجہد کرنا پڑی- ابتدائی تعلیم پنڈی بھٹیاں میں مکمل کی- ابتدا آریہ سماج اور بعد ازاں کانگریس سے وابستہ ہو گئے- ۱۹۳۹ء میں حیدر آباد ستیہ گرہ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا- پھر ۱۹۴۲ء میں انگریزو بھارت چھوڑدو تحریک میں حصہ لیااور جیل یاترا کی- حب الوطنی کے جذبے کے تحت انگریزی بنا ہوا کپڑا ترک کر کے ہمیشہ کھدر استعمال کیا حتی کہ شادی کے روز بھی کھدر کا لباس خود بھی پہنااور بیوی کو بھی پہنایا- کانگریس کی پنڈی بھٹیاں شاخ کے علاوہ تحصیل حافظ آباد تنظیم کے جوائنٹ سیکرٹری بھی تھے -بعد ازاں ضلع کانگریس کمیٹی لاہور کے سرگرم رکن بھی رہے-

تقسیم ہند کے بعد جیون پرکاش جیون امرتسر (بھارت) چلے گئے- یہاں پہلے رام آشرم سکول میں ٹیچر مقرر ہوئے پھر ڈی اے وی ہائی سکول میں چلے گئے- یہیں سے ریٹائر ہوئے اور پھر دہلی جا کر مقیم ہو گئے- جیون جی ایک اعلی پائے کے ادیب اور شاعر ہیں انھیں لکھنے کی ترغیب پنڈی بھٹیاں میں ہی مہاشہ برکت رام جی سے ملی جو خود ایک ادیب اور شاعر تھے- جیون کی ابتدائی پنجابی انقلابی نظموں کا مجموعہ "بھانبڑ" کے نام سے ۱۹۴۸ء میں امرتسر سے شائع ہوا- اس کے علاوہ آپ کی ۱۰۰ کے قریب تصانیف ہیں جن میں ۵۰ پنجابی زبان میں ہیں کئی کتابوں پر ایوارڈ بھی ملے- آپ نے رابندر ناتھ ٹیگور کی مشہور تصنیف کا منظوم ترجمہ بھی کیا- دیگر کتابوں میں ویر درشن، جیون پھلواری، رون پردیپ، قومی گیت، کرانتی کاری دیانند، دیش گیت، برفانی آگ، جی چاہتا ہے، پرزہ پرزہ کٹ، اب منزل قریب ہے، امرتسر دے لوک، انمول ہندی، انمول پنجابی زیادہ قابل ذکر ہیں- بھارت میں آپ کی شخصیت کے بارے میں ایک کتاب ابھیندن گرنتھ کے نام سے شائع ہوئی- جیون پرکاش جیون آج کل اپنے دو بیٹوں کے ساتھ دہلی میں مقیم ہیں-(۱۲۹)

قاضی غلام رسول :

پنجابی زبان کے مشہور علاقائی شاعر قاضی غلام رسول پنڈی بھٹیاں کے موضع ساکھی میں ۱۹۱۶ء میں محبوب عالم کے ہاں پیدا ہوئے- بچپن سے علم وادب کے شوقین تھے- یہ شوق پروان چڑھا تو اپنی علاقائی زبان پنجابی کے مخصوص انداز میں شعر کہے- ان کا کلام قصہ ابراہیم، سسی دی ڈولی، ستو سڑا فراقیہ، تریمہ دن، چرخہ حقانی اور چیچی کی شکل میں موجود ہے- ان کے کلام کو پنجابی ذوق رکھنے والے بڑے شوق سے پڑھتے ہیں- قاضی غلام رسول کا انتقال ۴ ستمبر ۱۹۸۷ء کو ہوا اور ساکھی میں ہی دفن ہوئے-

ذکی سرور کوٹی :

حافظ آباد کے موضع کوٹ سرور کے رہنے والے تھے۔ ۱۹۳۰ء کے لگ بھگ پنڈی بھٹیاں ہائی سکول سے میٹرک کا امتحان امتیازی حیثیت سے پاس کیا اور اپنے ہم جماعت ایم ایچ صوفی مرحوم کے ہمراہ گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لیا مگر مالی مسائل کے باعث مزید تعلیم جاری نہ رکھ سکے اور سکول ٹیچر ہو گئے۔ شاعری سے خصوصی طور پر لگاؤ تھا۔ مرثیہ اور نوحہ گوئی کرتے۔ ازان الاحیاء کے نام سے مجموعہ کلام شائع ہوا۔ ذکی سرور کوٹی کے نام سے شاعری کرتے تھے۔

ڈاکٹر محمد شفیع (مسیحائے چشم) :

مسیحائے چشم ڈاکٹر محمد شفیع لودھرا جو ۱۹۱۸ء میں پنڈی بھٹیاں میں پیدا ہوئے۔ متوسط طبقے کے ماں باپ کے اکلوتے بیٹے تھے۔ قصبہ کے ہائی سکول سے میٹرک کرنے کے بعد ۱۹۳۴ء میں میڈیکل سکول امرتسر میں داخلہ لیا جہاں سے ۱۹۳۸ء میں ایل ایس ایم ایف کا امتحان پاس کیا۔ آنکھوں کے امراض میں شروع سے دلچسپی تھی۔ چنانچہ اپنے وقت کے نامور آئی سپیشلسٹ ڈاکٹر سوہن سنگھ اور پروفیسر تلسی داس کے ساتھ تربیت کی۔ اسی اثناء میں ۱۹۴۰ء میں پنجاب سے ڈی او کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۴۲ء میں بطور اسسٹنٹ میڈیکل آفیسر ایرانی آئل کمپنی میں ملازمت اختیار کی۔ ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۹ء تک ایران میں قیام کیا اور اسسٹنٹ میڈیکل آفیسر سے آئی سپیشلسٹ کے عہدے پر ترقی ہوئی۔ اس دوران ایران میں چند دوستوں کے ساتھ مل کر پاکستان ایسوسی ایشن کی بنیاد رکھی اور اس کے صدر منتخب ہوئے اور جب تک ایران میں راجہ غضنفر علی پاکستان کی طرف سے پہلے سفیر کے طور پر پہنچ نہیں گئے ڈاکٹر محمد شفیع غیر سرکاری طور پر سفیر کی خدمات بجالاتے رہے۔ ۱۹۴۸ء میں انگلستان جا کر آکسفورڈ اور لندن سے ڈی او کا خاص ڈپلومہ حاصل کیا۔ ۱۹۴۹ء میں کمپنی سے علیحدگی اختیار کر کے انگلستان چلے گئے اور لندن اور ایڈنبرا دونوں جگہ سے ایف آر سی ایس کا امتحان پاس کیا اور وہاں کے امراض چشم کے مشہور ہسپتال مور فیلڈ اور کنگ کالج کے سٹاف کے طور پر کام کرتے رہے۔ ۱۹۵۴ء میں پاکستان واپس آئے تو نشتر میڈیکل کالج ملتان میں اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہوئے اور آئی ڈیپارٹمنٹ کی بنیاد ڈالی۔ ۱۹۵۷ء میں پروفیسر بنے۔ ۱۹۶۶ء میں لاہور منتقل ہو گئے اور آخر دم تک کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج کے پروفیسر رہے۔ امراض چشم کے بے مثال ماہر کا دل، دل کی بیماری کے قابو میں آگیا اور آخر مئی ۱۹۷۳ء کو ہار گیا۔ (۱۳۰)

ڈاکٹر محمد شفیع مرحوم کو قدرت کاملہ نے جتنا عرصہ خدمت عوام کے لیے دیا مرحوم نے اسے صحیح معنوں میں خدمت اور محض خدمت پر صرف کیا۔ انہوں نے زر و دولت کی کبھی ہوس تو کیا چاہ

بھی نہ کی۔انہوں نے تربت، چمن، مستونگ (بلوچستان) آزاد قبائلی علاقہ پارہ چنار، لائل پور اور چنیوٹ میں کئی مفت آئی کیمپ لگائے اور ہزاروں بے نور لوگوں کو نور کی روشنی پہنچائی۔ان کی زندگی میں پاکستان سے کوئی شخص انگلستان امراض چشم کے علاج کی غرض سے جاتا تو وہاں کے ڈاکٹر یہ کہہ کر واپس لوٹا دیتے کہ ڈاکٹر شفیع ابھی زندہ ہیں۔ڈاکٹر شفیع کی شادی کرم الٰہی ایڈووکیٹ کی صاحبزادی بیگم ثریا سے ہوئی تھی جو لاہور کالج برائے خواتین میں پروفیسر رہیں اور ان سے دو بیٹے اور ایک بیٹی ہوئی۔یہ تینوں عظیم باپ کے مقدس مشن پر چلتے ہوئے ڈاکٹری کے پیشے سے منسلک ہیں۔ایک شاعر خورشید انصاری فرید آبادی نے ڈاکٹر شفیع مرحوم کو اس طرح خراج تحسین پیش کیا۔

ہو بے بصر کوئی تو بصارت کا غم نہیں
نشتر بھی ان کے ہاتھ میں مرہم سے کم نہیں

ایم۔ایچ۔صوفی :

محمد حسین صوفی حافظ آباد کے موضع کوٹ اسحاق کے رہنے والے تھے۔ابتدائی تعلیم کے بعد پنڈی بھٹیاں کے ہائی سکول سے ۱۹۳۰ء کے لگ بھگ میٹرک امتیازی حیثیت سے پاس کیا۔اس کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور سے تعلیم مکمل کی اور بعد ازاں انگلستان بھی گئے۔اسی دوران پنڈی بھٹیاں میں مسلمانوں کی سماجی تنظیم انجمن اصلاح المسلمین کے قیام میں بھی مدد دی اور اس کی سرگرمیوں

میں حصہ لیتے رہے۔تعلیم مکمل کرنے کے بعد ۱۹۳۸ء کے لگ بھگ انڈین سول سروس کا امتحان پاس کیا اور مختلف اہم سرکاری عہدوں پر فائز رہے۔قیام پاکستان کے بعد ایوبی دور حکومت میں کیبنٹ سیکرٹری اور بعد ازاں پنجاب پبلک سروس کمیشن کے چیئرمین کے عہدے پر فائز ہوئے۔اسی عہدے سے ریٹائر ہوئے۔چند برس پہلے انتقال ہوا اور اپنے آبائی گاؤں کوٹ اسحاق میں دفن ہوئے۔

راج محمد تارڑ :

راج محمد تارڑ سولپور کے مشہور تارڑ قبیلہ کے چشم وچراغ تھے۔ان کے آباؤاجداد وقت کے تقاضوں کے مطابق اپنے علاقے میں ہمیشہ قائدانہ کردار ادا کرتے رہے گویا سیاست، سیادت اور قیادت ان کی گھٹی میں شامل تھیں۔ان کی شادی ونیکے تارڑ کے میاں خوشی محمد تارڑ کی صاحبزادی سے ہوئی تھی۔خوشی محمد تارڑ شروع سے مسلم لیگ سے وابستہ تھے اور ۱۹۳۰ء میں انہوں نے حافظ آباد میں اس وقت اس کے جلسہ کی صدارت کی تھی جبکہ حکومت وقت کے خوف سے لوگ اس جماعت میں شامل ہونے سے ڈرتے تھے۔۱۹۴۶ء کے انتخابات کا موقع آیا تو راج محمد تارڑ تحصیل حافظ آباد کے حلقے سے مسلم لیگ کے صوبائی امیدوار بنے اور کامیابی حاصل کی۔بعد ازاں دہلی میں

قائداعظم کی زیر صدارت مسلم لیگ لیجسلیٹرز کنونشن دہلی میں شرکت کی اور مطالبہ پاکستان کی بھر پور حمایت کی۔ قیام پاکستان کے بعد ۱۹۵۱ء کے انتخابات میں بھی حصہ لیا مگر ممتاز دولتانہ کی مخالفت کے باعث کامیاب نہ ہو سکے۔آپ علاقے کے مخلص سیاسی رہنما تھے۔

چوہدری ارشاد اللہ تارڑ :

چوہدری ارشاد اللہ تارڑ ۱۹۲۲ء میں رسولپور تارڑ میں چوہدری مراد بخش تارڑ کے ہاں پیدا ہوئے۔حافظ آباد سے میٹرک کرنے کے بعد ۱۹۴۲ء میں گورنمنٹ کالج فیصل آباد سے گریجوایشن کیا۔اس کالج میں مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کی سرگرمیوں میں پیش پیش رہے۔یہیں سے تحریک پاکستان کا جذبہ پیدا ہوا۔لاء کالج لاہور میں داخلہ لیا لیکن تعلیم مکمل نہ کر سکے۔اس کے بعد چوہدری سردار خاں اور خواجہ محمد صفدر کے ایماء پر گوجرانوالہ مسلم لیگ کے سیکرٹری مقرر ہوئے۔وہ آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے ممبر بنے اور اس حیثیت سے قائداعظم سے ملاقاتوں کا شرف حاصل رہا۔

آل انڈیا مسلم لیگ دہلی کے اجلاس میں شریک ہوئے۔جس میں عبوری حکومت کے قیام کا فارمولا منظور ہوا تھا۔اس کے علاوہ بمبئی کے اس اجلاس میں بھی انہیں شرکت کا اعزاز حاصل ہوا۔جس میں مسلم لیگ کونسل نے راست اقدام کا فیصلہ کیا تھا۔قائداعظم کے ساتھ خط و کتابت بھی رہی۔۱۹۴۶ء کے الیکشن میں اپنے عزیز راجہ محمد تارڑ مسلم لیگی امیدوار کی کامیابی کے لیے دن رات کام کیا اور خضر وزارت کے خلاف تحریک سول نافرمانی کے دوران ضلع گوجرانوالہ سے اولین قافلے کے ساتھ گرفتاری پیش کی۔قیام پاکستان کے بعد چوہدری ارشاد اللہ تارڑ جناح عوامی لیگ کے ضلعی کنوینر رہے۔ایوب دور میں کنونشن لیگ میں شامل ہو گئے اور ۱۹۶۲ء اور ۱۹۶۵ء کے انتخابات میں قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔۱۹۷۰ء، ۱۹۷۷ء اور ۱۹۸۸ء کے انتخابات میں بھی حصہ لیا مگر کامیاب نہ ہو سکے۔ضیاء الحق کی مجلس شوریٰ میں بھی شامل رہے۔علاقے کی سیاست میں ان کا ہمیشہ اہم کردار رہا ہے۔

چوہدری محمد حسین لودھرا :

۱۹۰۷ء میں پنڈی بھٹیاں میں ڈاکٹر فتح محمد لودھرا کے ہاں پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ۱۹۲۴ء میں گورنمنٹ برانڈرتھ سکول گوجرانوالہ سے میٹرک کیا۔اس کے بعد ایف سی کالج لاہور سے بی اے کی ڈگری حاصل کی۔۱۹۳۱ء میں لاہور لاء کالج سے ایل ایل بی کا امتحان پاس کیا اور ۱۹۳۱ء میں حافظ آباد میں وکالت کا آغاز کیا۔ساتھ ساتھ علاقے کی سیاسی و سماجی

سرگرمیوں میں دلچسپی پیدا کی- تحریک پاکستان کے دوران مسلم لیگ حافظ آباد کے رہنما ملک علی بہادر اعوان کے ساتھ مل کر گرانقدر خدمات سرانجام دیں- مہاجرین کی آبادکاری کے کاموں میں بھی بھرپور حصہ لیا اور مقامی ریلیف کمیٹی کے رکن رہے- بلدیہ حافظ آباد کے کونسلر اور نائب صدر بھی رہے- اس حیثیت سے حافظ آباد میں تعلیم کے فروغ کے لیے کوشاں رہے- کالج اور لائبریری کے قیام میں بنیادی کردار ادا کیا- اس لیے کالج کی لائبریری ان کے نام سے منسوب کی گئی- ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ میں شہری دفاع میں بہترین خدمات کے اعتراف میں فیلڈ مارشل ایوب خان کی طرف سے ایک عدد پستول دیا گیا جس پر آپ کا نام بھی کندہ کیا گیا تھا- مختلف رفاہی، سماجی و دینی تنظیموں کے عہدیدار اور سرپرست رہے- انجمن اصلاح المسلمین پنڈی بھٹیاں کے کم از کم ۳۰ سالانہ اجلاسوں میں مختلف قومی و سیاسی اور حکومتی رہنماؤں کی خدمت میں سپاس نامے پیش کیے- ستمبر ۱۹۹۷ء میں انتقال کیا اور پنڈی بھٹیاں میں دفن ہوئے-(۱۳۱)

غلام محمد مسن :

۱۸۹۰ء کی دہائی میں پنڈی بھٹیاں کے مسن گھرانے میں پیدا ہوئے- مروجہ تعلیم مکمل کرنے کے بعد کاروباری سرگرمیوں میں مصروف ہو گئے- اس دور میں قصبہ کے غریب عوام جاگیردارانہ تشدد اور جبر کا مسلسل شکار تھے- ان کا اثر لیتے ہوئے غلام محمد مسن نے اپنی سماجی زندگی کا آغاز کیا اور ۱۹۳۲ء میں مقامی مسلمانوں کی تنظیم انجمن اصلاح المسلمین کے قیام میں بنیادی کردار ادا کیا- جلد ہی وہ اس انجمن کے سیکرٹری جنرل منتخب ہو گئے اور تھوڑے سے وقفے کے سوا ۱۹۵۷ء میں اپنی وفات تک اس عہدہ پر فائزرہ کر سماجی و تعلیمی میدان میں مقامی مسلمانوں کے لیے گرانقدر خدمات انجام دیں-

۱۹۴۲ء میں مسلم لیگ کی مقامی شاخ کے قیام میں بھی پیش پیش رہے اور اس کے سیکرٹری جنرل بنے- تحریک پاکستان کے دوران گرانقدر خدمات انجام دیں اور مہاجرین کی آبادکاری کے لیے بھی مقامی ریلیف کمیٹی میں شامل ہو کر کوشاں رہے- ۱۹۵۲ء کی تحریک ختم نبوت میں حصہ لیا اور گرفتار ہوئے- ۱۹۵۴ء کے بلدیاتی الیکشن میں کونسلر بھی منتخب ہوئے- الغرض قصبہ کی سماجی بھلائی کے ہر کام میں حصہ لیا اور جاگیرداروں کے سامنے سینہ سپر رہے- مئی ۱۹۵۷ء میں انتقال کیا-

شیخ محمد حیات پُچھرہ :

شیخ محمد حیات ۱۹۰۸ء میں پنڈی بھٹیاں میں پیدا ہوئے- یہیں سے تعلیم مکمل کی- کاروباری

ملازمت کی غرض سے کلکتہ چلے گئے، پھر دھن بار، بالگڑہ، بھاگل پور اور جھریا وغیرہ میں مقیم رہے۔ قیام پاکستان سے قبل جھریا (صوبہ بہار) مسلم لیگ کے سیکرٹری اور امن سبھا کے سرگرم رکن تھے۔ اس دوران انہوں نے تحریک پاکستان کے سرگرمیوں میں بھی بھرپور طور پر حصہ لیا۔ پاکستان بننے پر جس جہاز کے ذریعے اپنے وطن لوٹے اس میں تحریک پاکستان کے اہم قائدین بھی سوار تھے۔ اس جہاز کا استقبال خود قائداعظم محمد علی جناح نے فرمایا تھا۔ اپنے آبائی قصبے پنڈی بھٹیاں آئے تو ریلیف کمیٹی میں شامل ہو کر لٹے پٹے مہاجرین کی آبادکاری میں ہاتھ بٹایا۔ بعد ازاں ہر سماجی سرگرمی میں حصہ لیتے رہے۔ مقامی تنظیم انجمن اصلاح المسلمین کے صدر اور ۱۹۶۰ء کے بلدیاتی الیکشن کے نتیجے میں ٹاؤن کمیٹی کے چیئرمین منتخب ہوئے۔ وہ ایک سچے پاکستانی تھے اور ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان کا سانحہ نہ سہہ سکے اور اس کے دو ماہ بعد ہی خالق حقیقی سے جا ملے۔

میاں اسلم حیات بھٹی:

میاں اسلم حیات بھٹی جلالپور بھٹیاں میں میاں مراد بخش بھٹی کے ہاں ۱۹۱۵ء میں پیدا ہوئے۔ تعلیم جلالپور اور حافظ آباد سے مکمل کی۔ ۱۹۳۷ء میں جلالپور بھٹیاں میں مسلم لیگ کی شاخ قائم کر کے اس کے پہلے صدر منتخب ہوئے۔ ۱۹۴۰ء میں دیگر کارکنوں کی سرپرستی کرتے ہوئے مسلم لیگ کے تاریخی اجلاس لاہور میں شرکت کی اور مسلسل چھ روز تک وہاں قیام کیا۔ خاندان کے دیگر بزرگ یونینسٹ ہونے کے باوجود میاں اسلم حیات اپنے نظریے پر ڈٹے رہے اور تحریک پاکستان میں مسلم لیگ کا ساتھ دیا۔ وہ پنجاب لیگ کے کونسلر بھی رہے۔ قیام پاکستان کے بعد کنونشن لیگ میں شامل ہو کر اس کی کونسل کے رکن رہے۔ علاقے کے دیگر سماجی کاموں میں بھی حصہ لیا اور جلالپور کی تنظیم انجمن اشاعت اسلام کے قیام پاکستان سے قبل نائب صدر رہے۔ میاں اسلم حیات متعدد بار ٹاؤن کمیٹی جلالپور بھٹیاں کے کونسلر اور ایک مرتبہ چیئرمین رہے۔ سادہ اور درویش صفت شخصیت کے مالک ہیں۔

میاں دوست محمد بھٹی:

میاں دوست محمد بھٹی پنڈی بھٹیاں کے بھٹی قبیلہ کے ذیلدار یار محمد بھٹی کے فرزند تھے۔ ۱۹۳۲ء میں ٹاؤن کمیٹی کے کونسلر اور دو سال بعد صدر منتخب ہوئے اور قیام پاکستان کے بعد ۱۹۵۳ء تک صدر کے عہدہ کے لیے منتخب ہوتے رہے۔ تحریک پاکستان کے موقع پر یونینسٹ پارٹی کا ساتھ دیا لیکن قیام پاکستان کے بعد ۱۹۵۱ء میں مسلم لیگ میں شامل ہو کر پنجاب اسمبلی کے ممبر اور بعد ازاں

مغربی پاکستان اسمبلی کے رکن بنے۔ وہ اس تمام عرصے میں مقامی بھٹی ذیلدار خاندان کے سربراہ تھے۔ ۲۳ دسمبر ۱۹۵۷ء کو انتقال کیا۔

میاں جہانگیر خان بھٹی :

میاں جہانگیر خاں بھٹی ۳ جون ۱۹۲۸ء کو میاں عطاء محمد بھٹی کے ہاں پنڈی بھٹیاں میں پیدا ہوئے۔ مقامی ہائی سکول سے ۱۹۴۴ء میں میٹرک کیا۔ قیام پاکستان کے بعد مقامی اور صوبائی سطح کے انتخابات میں متعدد بار حصہ لیا۔ ٹاؤن کمیٹی کے متعدد بار ممبر رہے۔ ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں حصہ لیا مگر ناکام رہے۔ بالآخر ۱۹۸۵ء کے انتخابات میں کامیابی حاصل کی اور پنجاب اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ لیکن زندگی نے وفا نہ کی اور ۱۷ جنوری ۱۹۸۶ء کو انتقال کر گئے۔ بڑے ملنسار اور خوش اخلاق تھے۔ ان کے سیاسی جانشین ان کے فرزند انتصار حسین بھٹی گزشتہ پانچ انتخابات میں صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب ہوتے آئے ہیں۔

میاں محمد حسین بھٹی :

۱۹۰۰ء کے لگ بھگ میاں معظم خاں بھٹی کے ہاں پیدا ہوئے۔ مروجہ تعلیم یہیں سے مکمل کی۔ علم و ادب سے بڑا شغف تھا اور تمام عمر مطالعہ کرتے رہے۔ قصبہ پنڈی بھٹیاں کی سیاسی و سماجی سرگرمیوں میں پیش پیش رہے۔ پہلی مرتبہ ۱۹۳۲ء میں ٹاؤن کمیٹی کے ممبر اور بعد ازاں ۱۹۳۴ء اور ۱۹۳۸ء میں اس کے نائب صدر منتخب ہوئے۔ تحریک پاکستان کا آغاز ہوا تو مسلم لیگ میں شامل ہو کر خدمات انجام دیں۔ وہ قیام پاکستان کے وقت مسلم لیگ پنڈی بھٹیاں شاخ کے صدر تھے۔ اس حیثیت سے یونینسٹ ذیلدار بھٹی قبیلہ کا ڈٹ کر سامنا کیا۔ قیام پاکستان کے بعد بھی سماجی و سیاسی سرگرمیوں میں مصروف رہے۔ نوے سال سے زائد عمر میں وفات پائی۔

سید حسین علی شاہ (خادم قائداعظم) :

دہلی (بھارت) کے علاقے نجف گڑھ کے رہنے والے تھے ۱۸۹۰ء کے قریب پیدا ہوئے۔ قائداعظم محمد علی جناح کے خدمت گار کی حیثیت سے کام کرنے کا شرف حاصل رہا۔ اس سلسلے میں وہ ان کے ساتھ بمبئی میں بھی مقیم رہے۔ قیام پاکستان کے بعد ہجرت کر کے پنڈی بھٹیاں آ گئے اور قائداعظم کے حکم سے ۱۹۴۸ء میں یہاں ۱۲ ایکڑ زمین الاٹ ہوئی۔ ہجرت کے دوران ان کا ایک بیٹا بھی شہید ہوا۔ قائداعظم نے انھیں اپنا ایک سوٹ اور بیگ بھی دیا تھا جس کو سید حسین علی شاہ نے

مقید تا ساری عمر سنبھالے رکھا-ان کا انتقال ۱۹۶۷ء میں ہوا-

غلام رسول کامریڈ :

میاں غلام رسول کامریڈ ایک مخلص اور تربیت یافتہ سیاسی و سماجی کارکن تھے-اس حیثیت سے انہوں نے گرانقدر خدمات انجام دیں- قیام پاکستان سے قبل مقامی کانگریس سے وابستہ تھے-اس لیے انہیں کامریڈ کہا جاتا تھا-لیکن پاکستان بننے کے بعد انجمن اصلاح المسلمین کے سیکرٹری کی حیثیت سے تمام زندگی سماجی کاموں میں صرف کر دی- اس حیثیت سے (۱) مسلمانوں کے علمی و ادبی کارنامے (۲) اسلامی حدود (۳) الشفاء تین کتابیں شائع کروا کر اپنے دینی و علمی ذوق کا بہترین ثبوت فراہم کیا-ان کا انتقال دسمبر ۱۹۸۰ء میں ہوا-

شفقت حسین شفقت :

پنجابی اور اردو زبان کے معروف شاعر و ادیب پنڈی بھٹیاں کے موضع عطار اں والا میں ۵ اپریل ۱۹۴۲ء کو پیدا ہوئے-گورنمنٹ کالج کوئٹہ سے بی ایس سی اور بعد ازاں پنجاب یونیورسٹی سے ایم ایس سی کیمسٹری کی ڈگری حاصل کی-آج کل گورنمنٹ میونسپل کالج فیصل آباد میں ایسوسی ایٹ پروفیسر ہیں- شروع سے ہی علم و ادب سے گہرا لگاؤ رہا- ان کی اردو شاعری کی تصنیف "ساکت روشنیاں" ۱۹۸۵ء میں اور پنجابی صوفیانہ غزلوں پر مشتمل مجموعہ "لوں لوں دیوے جگدے" ۱۹۹۵ء میں شائع ہوئی- پنجابی زبان میں ایک طویل نعتیہ قصیدہ بھی لکھا-ان کا نام علمی و ادبی میدان میں اہم مقام رکھتا ہے-

ڈاکٹر خالد محمود جنجوعہ :

۲۲-اپریل ۱۹۴۴ء کو پنڈی بھٹیاں میں حکیم غلام محمد جنجوعہ کے ہاں پیدا ہوئے-۱۹۶۰ء میں یہیں سے میٹرک کرنے کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہوئے اور ۱۹۶۶ء میں ایم ایس سی کیمسٹری کی ڈگری حاصل کی-۱۹۶۸ء میں اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلینڈ چلے گئے-بعد ازاں بریڈ فورڈ یونیورسٹی سے ۱۹۷۳ء میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی- مزید تحقیقی کام کے لیے کینیڈا گئے اور ایک انٹرنیشنل تحقیقی ادارہ میں تحقیقی کام سر انجام دیا- ۱۹۷۶ء میں وطن واپسی پر زرعی یونیورسٹی فیصل آباد میں تدریسی شعبہ سے منسلک ہوئے-بعد میں ۱۹۷۸ء میں پی سی ایس آئی آر لیبارٹریز سے وابستہ ہو گئے-آج کل اس کے پرنسپل سائنٹفک آفیسر ہیں- طب کو جدید سائنسی تحقیق کی روشنی

میں جدید بنانے کے حوالے سے کئی مضامین، مقالے اور کتابچے تحریر کیئے- علاوہ ازیں پی ٹی پی ایم کے اعزازی سائنسدان کی حیثیت سے بھی خدمات سرانجام دے رہے ہیں-

دیگراہم شخصیات :

پنڈی بھٹیاں اور گردونواح کی چند دیگر ایسی شخصیات کا تذکرہ بھی یہاں ضروری ہے کہ جن کا یہاں کی سیاسی، سماجی یا ادبی زندگی میں نمایاں مقام رہا ہے- ان شخصیتوں میں کچھ ماضی کی شخصیتیں ہیں اور کچھ حال کی- ماضی کی شخصیتوں میں کچھ ایسی شخصیتیں ہیں کہ جنہوں نے پنڈی بھٹیاں میں تعلیم کے مواقع نہ ہونے اور ہندوؤں کے مقابلے میں انتہائی تعلیمی پسماندگی کے باوجود دور دراز کے تعلیمی اداروں میں تعلیم حاصل کی اور قیام پاکستان سے قبل اہم سرکاری ملازمتیں اختیار کیں- اس میدان میں یہاں کا لودھرا خاندان سرفہرست ہے- اس خاندان کے پناہ خاں جو ۱۸۰۵ء کے لگ بھگ پیدا ہوئے اور تعلیم پانے کے بعد ضلع جھنگ کے مختلف علاقوں میں سارجنٹ کی ملازمت کرتے رہے- ان کے فرزند چوہدری علی محمد لودھرا بھی انہی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ۱۸۷۰ء کے لگ بھگ ملازم ہوئے اور گرداور کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے- ریٹائرمنٹ کے بعد قصبہ کی سماجی سرگرمیوں میں حصہ لیا اور ۱۹۳۱ء میں انجمن اسلامیہ قائم کی- اسی طرح کرم الٰہی ڈھیرہ جو یکم جولائی ۱۸۸۹ء میں پیدا ہوئے تھے علی گڑھ یونیورسٹی سے تعلیم مکمل کرنے کے بعد لائل پور میں وکالت کرتے رہے- لودھرا خاندان کے ایک اور فرد ڈاکٹر قادر بخش ۱۸۵۰ء میں پیدا ہوئے- کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج سے طب کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد پسرور سیالکوٹ اور جھنگ میں تعینات رہے- ان کا انتقال طاعون کی بیماری کے باعث ۱۹۱۰ء میں ہوا- ان کے فرزند چوہدری عبدالحق ۱۸۹۴ء میں پیدا ہوئے اور وزیرآباد جا کر میٹرک کا امتحان پاس کیا- بھٹی قبیلے کے افراد کے علاوہ دیگر مسلمانوں میں پہلے فرد تھے جو ٹاؤن کمیٹی پنڈی بھٹیاں کے ۱۹۳۲ء اور ۱۹۳۴ء میں کونسلر منتخب ہوئے تھے- ان کے فرزند محمد افضل خاں چوہدری اور اسی خاندان کے افراد چوہدری ڈاکٹر محمد اکبر، محمد فاضل لودھرا، نسیم اختر لودھرا اور بابو نذر محمد لودھرا دوسری جنگ عظیم کے دوران فوجی خدمات سرانجام دیتے رہے- ان میں ڈاکٹر محمد اکبر لودھرا شکار کے بڑے ماہر تھے اور انگریز حکومت کی طرف سے انہیں انعام سے بھی نوازا گیا تھا- اسی طرح ڈاکٹر فضل کریم لودھرا (ڈاکٹر محمد صفدر کے والد) بھی کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج لاہور سے طب کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد ۱۹۰۰ء کے لگ بھگ پہلے کرنال اور پھر ریاست جنید میں تعینات رہے- بعد ازاں وہ بھوانہ ضلع جھنگ میں بھی تعینات رہے- ونرنری ڈاکٹر غلام قادر لودھرا کا شمار بھی انہیں شخصیات میں ہوتا ہے-

ماضی کی دیگر نمایاں شخصیتوں میں کچھ ہندو بھی شامل ہیں-ان میں ایک تو رائے بہادر حکومت رائے تھے جو برٹش حکومت کے فنانس ڈیپارٹمنٹ میں اسسٹنٹ ایڈوائزر کے عہدہ پر فائز رہے اور اپنی خدمات کے باعث رائے بہادر کا خطاب حاصل کیا- دوسری شخصیت حویلی رام سچدیو کی ہے جنہوں نے وکالت کا امتحان پاس کیا ہوا تھا لیکن پریکٹس کی بجائے کاروبار کرتے تھے-وہ ۱۹۳۶ء سے قیام پاکستان تک مقامی کانگریس تنظیم کے صدر رہے-اس طرح کوٹ نکہ کے ایک ہندو شاعر رام لبھایا کا نام بھی نمایاں ہے-

مسلمانوں کے نمایاں افراد میں ایک خان دوران خان بھٹی تھے-وہ علاقے کے ایک سرکردہ شخص کی حیثیت سے قیام پاکستان سے قبل دو مرتبہ کونسلر بنے- علاوہ ازیں حکومت نے انہیں اعزازی مجسٹریٹ کے اختیارات سے بھی نوازا تھا-ان کا ۱۹۳۷ء میں انتقال ہوا اور مزار میاں خیر محمد نون کے احاطے میں دفن ہوئے-ایک شخصیت سعد اللہ بھٹی کی ہے وہ بھی ٹاؤن کمیٹی پنڈی بھٹیاں کے ۱۹۱۲ء اور ۱۹۱۶ء میں ممبر رہے اور علاقے میں خاصا اثرو رسوخ رکھتے تھے-ان کے فرزند میاں نذر حسین بھٹی بھی ۱۹۵۴ء میں ٹاؤن کمیٹی پنڈی بھٹیاں کے چیئرمین کے عہدے پر فائز رہے اور قصبہ کی ترقی کے لیے خدمات انجام دیں-ایک اہم شخصیت میاں صاحب خاں بھٹی کی تھی جو جالپور کے رہنے والے تھے اور ان کے مقابلہ طاقت کا کوئی جوان اس علاقہ میں نہ تھا- قد آور خوبصورت، بارلیش، نیک خیال اور طاقتور تھے-قیام پاکستان سے قبل لاولد انتقال کیا اور جائیداد میاں شیر عالم بھٹی کو ملی-

باو علی احمد لودھرا اور شیخ چراغ دین کے نام اس لحاظ سے قابل ذکر ہیں کہ یہ دونوں شخصیتیں قیام پاکستان سے پہلے اور بعد میں یہاں کی سیاسی و سماجی سرگرمیوں میں نمایاں رہیں- شیخ چراغ دین قیام پاکستان سے قبل مقامی مسلم لیگ کے ساتھ ساتھ انجمن اصلاح المسلمین کے بھی صدر رہے جبکہ باو علی احمد لودھرا کی خدمات تحریک پاکستان میں بہت نمایاں تھیں-انہوں نے انجمن کے صدر اور ایک کارکن کی حیثیت سے دن رات کام کیا- ڈاکٹر محمد عبداللہ مرحوم کا شمار بھی اسی زمرے میں آئے گا وہ تین مرتبہ ٹاؤن کمیٹی کے ممبر اور کچھ عرصے کے لیے وائس چیئرمین بھی رہے- تحریک پاکستان کے دیگر کارکنوں میں مہر عبدالکریم، محمد یوسف صاحب، غلام محمد پاکستانی، محمد منشاء محسن، فضل الٰہی رانا کے نام بھی نمایاں ہیں-علاقے کی سیاسی و سماجی سرگرمیوں میں خرم پور ریڑہ کے بزرگ پیر صالح شاہ مرحوم اور سکھیکی کے صوفی حسین احمد کا شمار بھی نمایاں افراد میں تھا-ادبی حلقوں میں مولانا محمد حسین (۱۸۸۳ء) معلم مدرسہ، گھنیشا سنگھ (معلم) اور برکت رام مہاشہ ماضی کی اہم شخصیات تھیں-اسی طرح شیخ محمد اصغر منشا بھی نمایاں تھے وہ انقلابی خیالات کے مالک تھے اور اسی

خیال کی شاعری کی۔ان کی ایک نظم وجود مسعود بڑی مشہور ہے۔نوجوانی میں ہی ۱۹۷۵ء کو انتقال کیا۔شاعروں کی اس فہرست میں ملازم حسین ملازم بھی قابل ذکر ہیں جو پنجابی کے مخصوص لہجے میں شاعری کرتے تھے۔

حال کی نمایاں شخصیتوں میں انتصار حسین بھٹی جو ۱۹۸۶ء میں پنجاب اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے اب تک مسلسل پانچ مرتبہ ایم پی اے منتخب ہو چکے ہیں۔اس دوران وہ پارلیمانی سیکرٹری کے عہدے پر بھی فائز رہے۔ان کے چچا میاں حق نواز بھٹی جو بیس پچیس برس تک ٹاؤن کمیٹی پنڈی بھٹیاں کے چیئرمین رہے، قابل ذکر ہیں۔موضع برج دارا کے چوہدری مہدی حسن بھٹی پہلے ڈسٹرکٹ کونسل کے رکن اور بعد ازاں سکھیکی کے حلقہ سے صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔۱۹۹۳ء میں وہ ضلع حافظ آباد سے پیپلزپارٹی کی طرف سے قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔لیکن ۱۹۹۷ء کے انتخابات میں کامیاب نہ ہو سکے۔یہاں کے دیہاتی علاقوں میں مخصوص طرز سیاست کی وجہ سے مقبول ہیں ان کے سیاسی حریف چوہدری افضل حسین تارڑ کولو تارڑ کے تارڑ خاندان کے سرکردہ فرد ہیں۔ضلع کونسل گوجرانوالہ کے عہدیدار رہنے کے علاوہ ۱۹۹۰ء اور ۱۹۹۷ء میں رکن قومی اسمبلی منتخب ہوئے اور وفاقی پارلیمانی سیکرٹری بھی منتخب ہوئے۔دوہٹہ عظمت کے سید بخاری خاندان کے اہم فرد پیر عارف حسین شاہ بخاری ہیں۔وہ بنیادی طور پر جمعیت علماء پاکستان (نیازی گروپ) میں شامل ہیں اور حافظ آباد کی نشست سے دو مرتبہ رکن صوبائی اسمبلی منتخب ہو چکے ہیں۔سرفراز حسین بھٹی بھی رکن صوبائی اسمبلی ہیں اور ان کا تعلق سکھیکی کے علاقے سے ہے۔جلالپور سے میاں بشیر عالم بھٹی اور میاں شاہد حسین بھٹی مختلف اوقات میں ٹاؤن کمیٹی جلالپور کے چیئرمین رہے۔چوہدری محمد رفیق آرائیں جو متعدد بار کونسلر اور ایک مرتبہ ٹاؤن کمیٹی کے چیئرمین بنے۔چوہدری احسان احمد جنہوں نے ۱۹۸۸ء میں پیپلزپارٹی کے ٹکٹ پر الیکشن میں حصہ لیا مگر کامیاب نہ ہو سکے۔اب مسلم لیگ کے عہدیدار کی حیثیت سے سرگرم عمل ہیں۔چوہدری حسن محمد مسلسل تین مرتبہ ٹاؤن کمیٹی کے وائس چیئرمین رہے۔نوازش علی بھٹی متعدد بار کونسلر رہے اور تحریک پاکستان کے زمانے میں بحثیت سالار خدمات انجام دیں۔بریگیڈئر رب نواز جنہیں ۱۹۶۵ء کی جنگ کے دوران نمایاں خدمات کے عوض ستارہ جرات سے نوازا گیا۔شیخ محمد حسین وڈاون جو گزشتہ سات دہائیوں سے قصبے کی ہر سماجی سرگرمی سے وابستہ رہے۔انجمن اصلاح المسلمین کے صدر اور بلدیہ کے کونسلر رہے۔تحریک ختم نبوت میں گرفتار بھی ہوئے۔حکمت کے شعبے سے وابستہ ہیں۔غلام محمد فاروقی بھی تحریک پاکستان سے لے کر آج تک قصبے کی ہر سیاسی و سماجی سرگرمی میں پیش پیش رہے۔انتظامی عہدوں کے اعتبار سے قلعہ مراد بخش کے مولوی جنرل ضیاء الحق بری فوج میں کور

کمانڈر ہیں جبکہ ان کے بھائی کرنل ریٹائرڈ انعام الحق آزاد کشمیر حکومت میں وزیر رہے تھے۔ مچھونکہ کے رانا محمد اقبال ایس پی کے عہدے پر اور ریاض احمد طاہر انڈر سیکرٹری کے عہدے پر فائز ہیں۔ ادب کے میدان میں رائے محمد کمال، محمد صفدر ساقی، بشیر دیوانہ اور شیخ محمد وحید کے نام نمایاں ہیں ان کا شمار یہاں کے بہترین شعراء اور ادیبوں میں ہوتا ہے۔ جلالپور کے قاضی عبدالرشید بھی علمی و ادبی میدان میں نمایاں مقام کے حامل ہیں۔ جبکہ تحریک پاکستان کے کارکنوں میں غلام محمد پاکستانی، شیخ محمد امین جو ہیڈ ماسٹر کے طور پر ریٹائر ہوئے طالب علمی کے زمانے میں گورنمنٹ کالج فیصل آباد میں تحریک پاکستان کی سرگرمیوں میں حصہ لیتے رہے اور قائد اعظم سے ملاقات کا شرف بھی حاصل کیا۔ یہی شرف شیخ شفیع جاوید کو بھی حاصل ہے جو قیام پاکستان سے قبل محکمہ دفاع میں ملازم تھے۔ اس غرض سے وہ دہلی اور شملہ میں تعینات رہے۔ قیام پاکستان کے بعد ریٹائرڈ ہوئے تو قصبہ کے سیاسی و سماجی کاموں میں حصہ لے کر دو مرتبہ ٹاؤن کمیٹی کے کونسلر منتخب ہوئے۔

یہ سب شخصیتیں یہاں کی سماجی وسیاسی زندگی میں اہم مقام رکھتی ہیں۔

☆☆☆

حوالہ جات

1- Chenab Colony Gazetteer (part.A) p. 2

2- Census Report, 1881, Calcuta.

3- Gujranwala Distt. Gazetter 1904 (part-B) P. cv iii- civ.

4- Distt. Census Report Gujranwala, Pak. Census of Pak. 1961, Karachi, 1961, (iii. 53)

5- محمد علی چراغ، تاریخ پاکستان، سنگ میل پبلیکشنز لاہور- ص ۵۴-۵۵-

6- ایضاً

7- Chenab Colony Gazetteer, P. 12- 13.

8- احمد غزالی، ساندل بار، فیروز سنز لاہور- ص ۲۹۸-۲۹۹-

9- Chenab Colony Gazetteer, P. 12.

10- عبدالعزیز فاروق کی مرتب کردہ رپورٹ بابت آثار قدیمہ (بحوالہ، روزنامہ جنگ، لاہور، ۲۴ اکتوبر ۱۹۸۳ء

11- محکمہ آثار قدیمہ کی رپورٹ مرتبہ ۱۹۷۴ء (بحوالہ ساندل بار- ص ۵۱)

12- بشیر حسین بھٹی، مضمون "دلا بھٹی "مطبوعہ نوائے وقت میگزین-

13- بروایت، میاں نصیر حسین بھٹی، سابق وائس چیئرمین بلدیہ پنڈی بھٹیاں-

14- بروایت، میاں نثار خاں بھٹی، پنڈی بھٹیاں-

15- اختر حسین شیخ، مضمون، "مادھولال حسین" سرگزشت شمارہ، اگست ۱۹۹۴ء- ص ۳۶-۳۷-

16- ایضاً- ص ۳۶-۴۰-

17- آئین اکبری- ص

18- مخطوطہ، حکم نامہ، بادشاہ محمد شاہ، بحق قاضی محمد فاضل، جلالپور- ۱۱۲۷ ہجری (محفوظ شدہ قاضی عبدالرشید، جلالپور)

19- مقالہ، پنجاب مغلوں کے عہد زوال میں-

20- مضمون، حضرت میاں جان محمد، "الحفیظ" مجلّہ گورنمنٹ ڈگری کالج حافظ آباد ۹۳-۱۹۹۴ء- ص ۶۱-

-21 بحوالہ قطعہ مرقد، حضرت میاں خیر محمد نون- پنڈی بھٹیاں-

-22 میپل گریفن، تذکرہ روسائے پنجاب، سنگ میل پبلیکشنز لاہور- ص ۲۰۸-

-23 وحید سنگھ بیدی، مضمون "مہاراجہ رنجیت سنگھ کا خاندانی پس منظر" روزنامہ پرتاب، دہلی ۲۶، جولائی ۱۹۹۲ء-

-24 مفتی غلام سرور، تاریخ مخزن پنجاب، ص ۳۰۰ اور

Gugranwala Distt. Gazetteer, (Part_A) 1935, P- 181-82

-25 بروایت نثار خاں بھٹی پنڈی بھٹیاں-

-26 بروایت شیخ محمد حسین ودہاون، پنڈی بھٹیاں-

27- Gujranwala Distt. Gazetteer 1935, P- 136.

28- Chenab Colony Gazetteer, P. 19.

29- Jhang Distt. Gazetteer 1929.

30- Chenab Colony Gazetteer, P 30.

-31 بروایت بریگیڈیئر (ریٹائرڈ) رب نواز بھٹی، سکھیکی منڈی-

32- Chenab Colony Gazetteer, P 15.

33- Distt. Gujranwala Gazetteer, P.

34- Ibid- 1935, P 147.

35- Ibid - P. 148.

36- Gugranwala Distt Gazetteer, 1904 (B) P.cv cv.ixxi-cix.

37- Gujranwala Distt. Gazetteer, 1883- 84, P 42.

38- Ibid - P 76.

-39 مسٹر لائیٹز کی تعلیمی رپورٹ (بحوالہ، مہک گوجرانوالہ نمبر) مجلہ گورنمنٹ کالج گوجرانوالہ-

40- Chenab Colony Gazetteer, p.

-41 ریکارڈ، رجسٹر کارروائی، ٹاؤن کمیٹی پنڈی بھٹیاں، ۱۹۱۲ء

-42 ایضاً-۱۹۱۶ء-

43- The Punjab and the war, 1922 P.

-44 لالہ پنڈی داس، مارشل لاء ۱۹۱۹ء (کانگریس رپورٹ) ص ۱۸۱-۱۸۲- اور

Jagdish Sharma, Encyclopaedia of Indian Independence Dehli 1974

45- ذکر ذاکر۔ص .

46- Pungab legistlative Assembly, Election report 1921.

47- Return Showing the Results of Elections in India 1923, London. P 55-67.

48- ریکارڈر جسٹر کارروائی، ٹاؤن کمیٹی پنڈی بھٹیاں-۱۹۲۵ء۔

49- Punjab Legislation Assembly Election report 1926.

50- ریکارڈر جسٹر کارروائی، ٹاؤن کمیٹی پنڈی بھٹیاں-۱۹۲۸ء۔

51- Return showing the Results of Election in India 1929-30, London, P-23-24.

52- ریکارڈر جسٹر کارروائی، ٹاؤن کمیٹی پنڈی بھٹیاں، ۱۹۳۲ء۔

53- بروایت شیخ محمد حسین ودباون، پنڈی بھٹیاں۔

54- رجسٹر کارروائی، انجمن اصلاح المسلمین پنڈی بھٹیاں، ۱۹۳۲ء تا ۱۹۴۳ء۔

55- ایضاً-۱۹۳۴ء۔

56- Return Showing the Results of Election of India 1937, P-74,76 & 79.

57- مسلمانوں کے علمی وادبی کارنامے، مرتبہ غلام رسول، انجمن اصلاح المسلمین پنڈی بھٹیاں، ص-۱۸-

58- رجسٹر کارروائی انجمن اصلاح المسلمین ۱۹۳۲ء تا ۱۹۴۳ء۔

59- ایضاً۔

60- انٹرویو میاں اسلم حیات خاں بھٹی، سابق چیئرمین بلدیہ جلالپور بھٹیاں۔

61- انٹرویو جیون پرکاش جیون (سابق سیکرٹری کانگریس تحصیل حافظ آباد) حال مقیم نئی دہلی۔

62- رجسٹر کارروائی انجمن اصلاح المسلمین، ۱۹۴۳ء تا ۱۹۵۰ء۔

63- ایضاً۔

64- انٹرویو چوہدری ارشاداللہ تارڑ، سابق رکن اسمبلی (رسولپور تارڑ)

65- بروایت غلام محمد فاروقی (مرحوم) سماجی کارکن پنڈی بھٹیاں۔

66- بروایت غلام محمد پاکستانی، کارکن تحریک پاکستان- پنڈی بھٹیاں۔

67- بیدار ملک، فیصلہ کن معرکہ، پاکستان سٹڈی سنٹر پنجاب یونیورسٹی لاہور ۱۹۸۷ء، ص ۹۶-۲۹۵-

68- رجسٹر کارروائی انجمن اصلاح المسلمین، ۱۹۴۳ء تا ۱۹۵۰ء۔

69- بروایت، مہر محمد ابراہیم، محمد یوسف صاحب، غلام محمد پاکستانی، کارکنان تحریک پاکستان۔

پنڈی بھٹیاں۔

70- بروایت آغا غلام رسول (ریٹائرڈ ملازم) ٹاؤن کمیٹی پنڈی بھٹیاں۔

71- انٹرویو شیخ محمد حسین وڈہاون، سماجی رہنما، پنڈی بھٹیاں۔

72- رجسٹر کارروائی، انجمن اصلاح المسلمین۔ ۱۹۴۳ء-۱۹۵۰ء۔

73- انٹرویو رانا محمد طفیل، (مرحوم) سیاسی کارکن پنڈی بھٹیاں۔

74- مسلمانوں کے علمی وادبی کارنامے، ص ۲۱-۲۲۔

75- Report of the GeneralElection to the Punjab Constittion Assembly 1950-51. P- 97-98.

76- (i) مسلمانوں کے علمی وادبی کارنامے، ص ۲۲۔
(ii) رجسٹر کارروائی انجمن اصلاح المسلمین۔ ۵۴-۱۹۵۰ء

77- رجسٹر کارروائی ٹاؤن کمیٹی پنڈی بھٹیاں۔ ۱۹۵۷ء تا ۱۹۶۰ء۔

78- وکیل انجم، سیاستدانوں کی قلابازیاں، جلد اول، ص ۳۶۴۔

79- ایضاً۔ ص ۴۹۵۔

80- ایضاً۔ ص ۵۵۵۔

81- انٹرویو چوہدری احسان احمد (مقامی سیاسی رہنما) پنڈی بھٹیاں۔

82- انٹرویو، چوہدری ارشاد اللہ تارڑ (سابق ایم این اے) رسولپور تارڑ۔

83- روزنامہ جنگ، لاہور۔ ۱۱۔ اکتوبر ۱۹۸۳ء۔

84- Report on Election 1985- Islamabad.

85- Report on Election 1988- Islamabad.

86- Ibid- 1990

87- Ibid - 1993

88- Ibid - 1997

89- تاریخ مخزن پنجاب، ص ۳۰۰۔

90- ایضاً۔ ص ۲۹۸۔

91- سیر المتاخرین۔ ص ۸۰۔

92- Chenab Colony Gazetteer. P. 4,27 & 28

93- مسلمانوں کے علمی وادبی کارنامے، ص ۱۶۔

94- بروایت عبدالقیوم قادری، (صحافی) پنڈی بھٹیاں۔

95- پمفلٹ تعارف، انجمن اشاعت اسلام جلالپور۔

96- بروایت جیون پرکاش جیون، دہلی انڈیا۔

97- ریکارڈ ٹاؤن کمیٹی پنڈی بھٹیاں۔

98- ریکارڈ ہائی سکول نمبر ا پنڈی بھٹیاں۔

99- انٹرویو جیون پرکاش جیون، مقیم دہلی (بھارت)۔

100- انٹرویو محمد شفیع انصاری رکن جماعت اسلامی پنڈی بھٹیاں۔

101- انٹرویو زوار عطا محمد پنڈی بھٹیاں۔

102- شیخ محمد اکرام، رود کوثر۔ص ۸۳-۸۴۔

103- انٹرویو ملک عبدالکریم (ماہر شکار) پنڈی بھٹیاں۔

104- ریکارڈ تھانہ پنڈی بھٹیاں۔

105- بروایت، سید حمید رضا شاہ، زوار عطا محمد پنڈی بھٹیاں۔

106- بروایت جیون پرکاش جیون، دہلی، انڈیا۔

107- یاد خدا (اخبار) یکم دسمبر ۱۹۳۹ء۔ چنیوٹ

108- بروایت شیخ محمد حسین ودہاون، حاجی نذر محمد (سابق وائس چیئرمین) پنڈی بھٹیاں۔

109- ساندل بار، ص ۸۸-۲۸۷۔

110- بروایت شیخ زاہد حسین پنڈی بھٹیاں۔

111- برکت علی خاں، تاریخ بھٹیاں (شیخوپورہ) ص ۳۹۔

112- بروایت بریگیڈیئر (ریٹائرڈ) رب نواز بھٹی (ستارہ جرات) سکھیکی منڈی۔

113- Distt. Gujranwala Gazetteer, 1883. P -32-33.

114- ڈاکٹر صابر آفاقی، "جلوہ کشمیر" لاہور، ۱۹۸۸ء، صفحہ ۱۳۹۔

115- بروایت قاضی شیر محمد مغل، کارکن تحریک پاکستان، پنڈی بھٹیاں۔

116- بروایت، ضیاء الحق لودھرا، عرفان قادر لودھرا، عظمان لودھرا، پنڈی بھٹیاں۔

117- شجرہ نسب پچھر خاندان، (شیخ ظفر احمد، تنویر احمد پچھر) پنڈی بھٹیاں۔

118- شجرہ نسب زرگر وپوہان بحوالہ ذوالفقار پوہان۔ پنڈی بھٹیاں۔

119- شجرہ نسب قاضی خاندان، بحوالہ قاضی عبدالرشید ارشد جلالپور بھٹیاں۔

120- Ibtson, Punjab Castes, P. 231, 301, 312, 312, 313, 324

121- نور احمد چشتی، تحقیقات چشتی، لاہور، ص ۳۰۹، ۳۲۰-
122- بروایت باوا طالب حسین فقیر متولی دربار مروان شاہ، پنڈی بھٹیاں-
123- قلمی نسخہ، سراج السالکین بحوال خواجہ خضر سلطان قادری،
مرتبہ، خلیفہ سراج الدین ۱۹۳۱ء جلالپور کہنہ-
124- شجرہ نسب بھٹی خاندان، موضع دلیکی-
125- قلمی نسخہ جات، مرتبہ حکیم میاں عمر الدین، بحوالہ حکیم صفدر ساقی پنڈی بھٹیاں-
126- قلمی نسخہ جات، کتب مرتبہ، میاں محمد دین، بحوالہ ماسٹر اظہر اقبال بھٹی موضع بھنجے-
127- انٹرویو ڈاکٹر سرفراز عزیز زادہ، فرزند ڈاکٹر عزیز علی- چنیوٹ-
128- الاخوان، مجلہ گورنمنٹ انٹر کالج علی پور چٹھہ، ص ۵۸ تا ۶۰-
129- انٹرویو جیون پرکاش جیون- دہلی انڈیا-
130- مضمون بعنوان، ڈاکٹر محمد شفیع مسیحائے چشم، روزنامہ مشرق-
(ii) بیگم پروفیسر ثریا شفیع، لاہور-
131- انٹرویو چوہدری محمد حسین لودھرا (ایڈووکیٹ مرحوم) حافظ آباد-

☆☆☆

مزار شیخ بہلول دریائی رحمۃ اللہ علیہ مرشد شاہ حسین رحمۃ اللہ علیہ
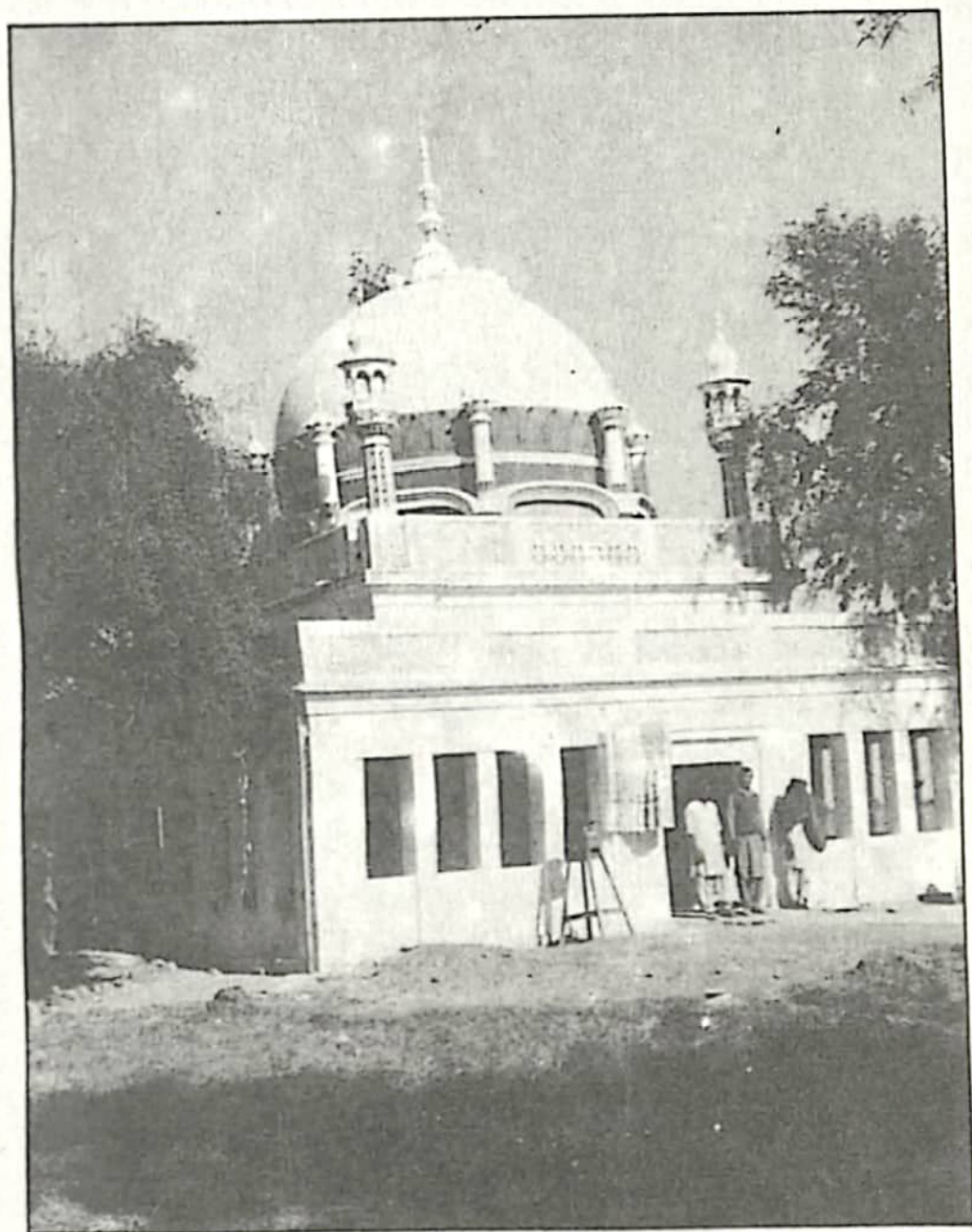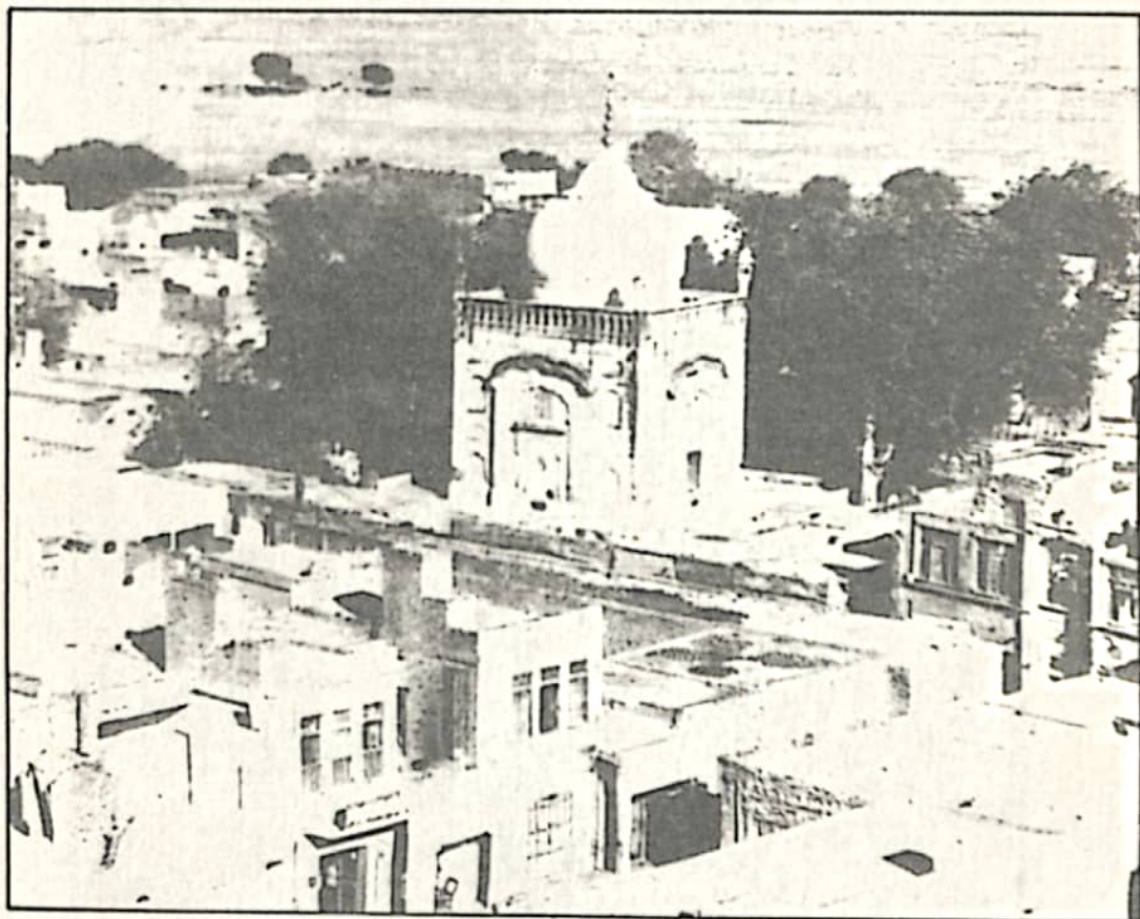
مزار میاں خیر محمد نون رحمۃ اللہ علیہ (پنڈی بھٹیاں)

سنگ میلہ حضرت سخی سرور رحمۃ اللہ علیہ
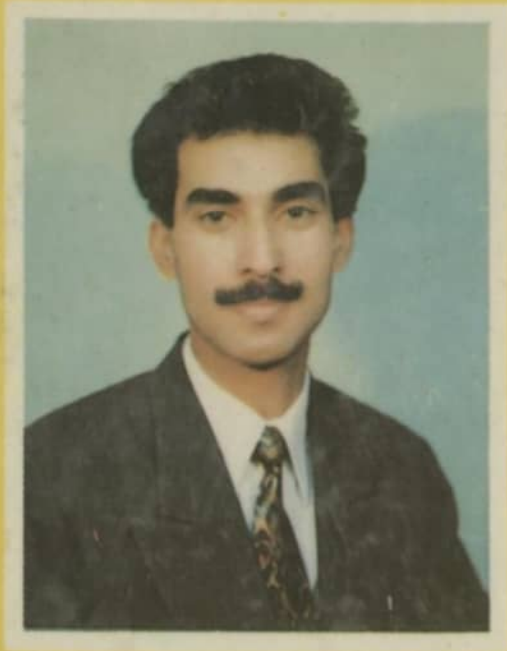
تعارف مصنف

نام	اسد سلیم شیخ
پیدائش	1962ء پنڈی بھٹیاں (ضلع حافظ آباد)
تعلیم	گریجوایشن گورنمنٹ کالج، لاہور
	ایم اے، سیاسیات پنجاب یونیورسٹی، لاہور
ملازمت	لیکچرار
موجودہ تعیناتی	گورنمنٹ ڈگری کالج پنڈی بھٹیاں

دیگر تصانیف

1- افغان مہاجرین
2- رسول اللہ ﷺ کی خارجہ پالیسی
3- اسلامک ورلڈ آرڈر
4- پاکستان جمہوریت اور انتخابات
5- انسائیکلو پیڈیا تحریک پاکستان